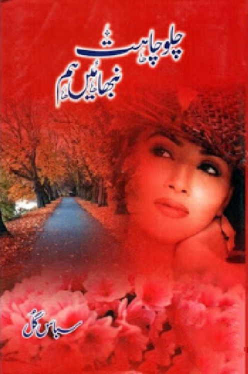

چلو چاہت
نبھائیں ہم
سباس گل

چلو چاہت نبھائیں ہم

سباس گُل

عبداللہ اکیڈمی
الکریم مارکیٹ اُردو بازار لاہور

فہرست

’’چلو چاہت نبھائیں ہم‘‘

’’مے آئی کم ان سر؟‘‘ محمد علی نے افس کے دروازہ میں سے اندر جھانکتے ہوئے اجازت مانگی۔

’’آؤ علی، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔‘‘ یاسین بیگ نے اسے دیکھتے ہی فائل سے نظریں اٹھائیں۔

’’جی سر فرمایئے؟‘‘ وہ میز کے قریب چلا آیا۔

’’علی میں گزشتہ تین ماہ سے تمہاری کارکردگی سے بے حد خوش ہوں اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں کمپنی کی طرف سے گھر اور گاڑی کی سہولت دے دی جائے‘‘۔

’’بہت شکریہ سر!‘‘ علی نے خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

شکریئے کی کوئی بات نہیں ہے علی۔ یہ تمہارا حق ہے۔ جب سے تم نے ہماری کمپنی کو جوائن کیا ہے، کمپنی بہت فائدے میں جا رہی ہے۔ تم اپنے کام کی باریکیاں خوب جانتے ہو‘‘۔

یاسین بیگ اپنی تمام تر خود غرضی کے باوجود اس کی ذہانت کا اعتراف کرنے پر مجبور تھے۔ انہوں نے اس کی تعریف دل سے کی تھی۔

’’کام کی باریکیاں کیا سر، بس یوں کہنے کہ اپنے کام سے انصاف کرنے کی کوشش کرتا ہوں‘‘۔ علی نے عاجزی سے کہا۔

"ویل سیڈ" یاسین بیگ ہنس پڑے۔

"اب میرے لیے کیا حکم ہے سر؟"

"بھئی اس وقت تو تم ہمیں بتاؤ کہ تم کس قسم کے بنگلے میں رہائش اختیار کرنا چاہتے ہو، گاڑی کون سے ماڈل کی پسند ہے تمہیں، ہمیں بتاؤ تاکہ ہم جلد از جلد تمہیں یہ سہولیات فراہم کرسکیں"۔

"کیوں بھئی! لوگ تو ترستے ہیں ان چیزوں کے لیے اور سب نے خوشی خوشی اپنی پسند بتا کر یہ مراعات حاصل کی تھیں ہم سے، پھر تم کیوں انکار کر رہے ہو؟" یاسین بیگ نے نہایت حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا:

"سر ان سب لوگوں کی بات اور ہے۔ وہ شادی شدہ ہیں، بچوں والے ہیں، یا ان کی فیملیز بڑی ہیں۔ لیکن سر میرے ساتھ اس قسم کا کوئی پرابلم نہیں ہے۔ آئی مین، میں تو اکیلا ہوں سب اس لیے بنگلہ اور کار لے کر کیا کروں گا۔ میرے لیے تو دو کمروں کا فلیٹ بھی بہت ہے اور کنوینس کا مسئلہ تو میری موٹر بائیک نے حل کر دیا ہے۔ مجھے اتنی زیادہ مراعات نہیں چاہئیں سر اور میرے خیال میں جتنی ضرورت ہو اتنا ہی دامن پھیلانا چاہیے، زیادہ مانگ کر دامن تار تار کرنے سے کیا حاصل؟"

"بہت خوب بھئی علی، تم نے تو مجھے قائل کرلیا"۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے

"لیکن میں نہیں چاہتا کہ میری کمپنی کا سپروائزر ایک کمرے کے کرائے کے مکان میں رہے۔ تم آج ہی وہاں سے اپنے نئے فلیٹ میں شفٹ ہو جاؤ۔ میں منیجر سے کہہ دوں گا وہ تمہیں فلیٹ کی چابی دے دے گا اور تم اپنی موٹر بائیک بھی بدل لو یار۔ اتنی بڑی کمپنی کا مارکیٹنگ سپروائزر اور ایک پرانی بائیک پر سفر کرے یہ کچھ مناسب نہیں لگتا۔ تمہیں اپنے عہدے کے حساب سے اپنے رہن سہن میں تبدیلی لانا ہوگی۔ تم ایسا کرو کہ تم وہ پرانی موٹر بائیک بیچ دو۔ ہم تمہیں نئی خرید دیتے ہیں"۔

"تھینک یو سر! مگر بائیک میں اپنی کمائی سے خریدنا چاہتا ہوں"۔ وہ سنجیدہ لہجے

میں بولا۔

"ایک تو تم خوددار بہت ہو۔ ارے بھئی میں کوئی احسان تو نہیں کر رہا تم پر، جو سب کو دیا ہے اس میں اب تمہارا بھی حصہ بنتا ہے۔ اور یہ ہماری کمپنی کی ریپوٹیشن کا معاملہ ہے آخر۔ تم اتنے بڑے بڑے لوگوں سے ملتے ہو، تمہارا لائف اسٹائل بھی ان جیسا ہونا چاہیے"۔ یاسین بیگ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ دل ہی دل میں مسکرادیا اور سوچنے لگا۔

تو انہیں اپنی کمپنی کا اسٹینڈرڈ اونچا چاہیے۔ ریپوٹیشن (ساکھ) اعلیٰ چاہیے، ورکر کی فلاح، مجبوری سے ان کی۔ واہ سر آپ بزنس مین لوگ ہمیشہ بزنس ہی کی سوچتے ہے، پھر وہ بولا

"ٹھیک ہے سر! جیسے آپ کی مرضی، یوں بھی میں آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ نے مجھے اپنی کمپنی میں اتنی اہم پوسٹ پر تعینات کیا ہے"۔ علی نے سنجیدگی سے کہا۔

"بس تو پھر تم منیجر سے مل لینا میں اسے سمجھا دوں گا"۔ یاسین بیگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"رائٹ سر! اب میں جاؤں؟"

"شیور!" انہوں نے مسکراتے ہوئے دروازے کی طرف ہاتھوں سے اشارہ کیا۔ وہ مسکراتا ہوا آفس سے باہر چلا گیا۔

☆☆☆

محمد علی کا تعلق ایک چھوٹے گاؤں سے تھا۔ گاؤں کے سکول سے میٹرک کا امتحان اس نے اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا تو اسے وظیفہ ملنا شروع ہوگیا۔ اس خوشی کے ساتھ ہی اسے ماں باپ کی موت کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ گاؤں میں ان دنوں سینے کی وبا پھیلنے سے کئی افراد جاں بحق ہوئے تھے۔ محمد علی کے ماں باپ بھی انہیں میں شامل تھے۔ وہ اپنے والدین کی واحد اولاد تھا۔ ان کی وفات کے بعد وہ

گھر تایا کے حوالے کر کے خود شہر پڑھنے کے لیے آ گیا۔ اس کے کالج کی فیس ''کتابیں، کپڑے، جوتوں کے علاوہ کھانے پینے اور کمرے کا کرایہ دیگر چھوٹے چھوٹے اخراجات کے لیے دو سال تو اس کے تایا نے اس کے مکان میں رہنے کے بدلے میں رقم بھیجی۔ اس کے بعد تایا کی نیت میں بے ایمانی آ گئی۔ انہوں نے اس کا مکان منشی اور تحصیل دار کی مدد سے اپنے نام کرالیا اور علی کو صاف جواب دے دیا۔ اسے صدمہ تو بہت ہوا اور غصہ بھی خوب آیا مگر وہ کمزور تھا، تایا کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے حق کے لیے لڑ نہیں سکتا تھا۔ یوں بھی اس کا تایا گاؤں کا سب سے بڑا زمیندار تھا۔ پولیس بھی اس کے کہنے میں تھی۔ سو علی خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے اس نے ٹیوشنز پڑھانا شروع کر دی۔ ہاکر کا کام بھی کیا۔ وہ بہت ذہین تھا۔ اس میں آگے بڑھنے کا جذبہ تھا۔ پڑھنے کی لگن تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر سال وظیفہ حاصل کرتا رہا۔ تعلیمی میدان میں اس نے ہمیشہ کامیابی کے جھنڈے گاڑے۔ یوں اس نے پہلے ایم۔ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور اول پوزیشن حاصل کرنے پر اسے کامرس کالج کی طرف سے ایک نئی شاندار موٹر سائیکل انعام میں دی گئی۔ اس کے بعد اس نے اکنامکس میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ وہ ساتھ ساتھ ملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اس کے شاندار تعلیمی سرٹیفکیٹ اور میڈلز اسے وقتی طور پر تو سب کی نظروں میں بہت معتبر، قابل، ذہین اور وی۔ آئی۔ پی بناتے رہے لیکن عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی یہ انعامات اور اسناد اس کے لیے محض کاغذ کے پرزے اور دھات کے ٹکڑے ثابت ہوئے۔ وہ بہت دلبرداشتہ ہوا لیکن ہمت نہ ہاری اور اس نے ٹیوشنز پڑھانے کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر کا کورس بھی کر لیا اور جس شخص کے کمرے میں کرائے پر رہتا تھا، اس سے اس کی ورکشاپ پر بھی کام سیکھنے لگا۔ اس کی قسمت ورکشاپ پر کام سے ہی کھلی تھی۔

وہ ورکشاپ میں کام کر رہا تھا، اتفاقاً یاسین بیگ وہاں اپنی گاڑی ٹھیک کرانے آئے تھے ان کے ساتھ ایک انگریز بھی تھا۔ دراصل اپنے اس کاروباری دوست کو

ائیر پورٹ سے لے کر آ رہے تھے کہ راستے میں اچانک گاڑی خراب ہو گئی۔ قریب ترین گیراج وہی تھا جس میں علی کام کر رہا تھا۔ علی نے ان کی گاڑی فوراً ٹھیک کر دی۔ اس دوران وہ یاسین بیگ کے انگریز کلائنٹ سے فر فر انگریزی میں باتیں بھی کرتا رہا۔ گفتگو میں اکنامی اور بزنس کا ذکر بھی آیا تو علی نے اسے اپنے ملک میں سرمائے اور آمدنی کا ریشو بتایا۔ یاسین بیگ سمیت وہ انگریز ایک ورکشاپ کے کاریگر کی زبان سے اتنی مفید باتیں سن کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور جاتے وقت نہ صرف اس انگریز نے بلکہ یاسین بیگ نے بھی اپنا وزیٹنگ کارڈ اسے تھما دیا اور علی کو اگلے روز صبح دس بجے اپنے آفس آنے کی تاکید کی۔

علی اگلے روز مقررہ وقت پر اپنی تعلیمی اسناد کی فائل سمیت ان کے سامنے ان کے آفس میں موجود تھا۔ یاسین بیگ نے اس کی اسناد کو بہت حیرت زدہ اور ستائشی نظروں سے دیکھا، اس کی کہانی اس کی زبانی سنی اور مسکرا کر بولے:

''مسٹر علی آپ بہت ذہین، قابل اور محنتی نوجوان ہیں اور ہماری کمپنی کو آپ جیسے باصلاحیت نوجوان کی اشد ضرورت تھی جو یقیناً آپ کے آنے سے پوری ہو جائے گی۔ آپ کل ہی ہمیں جوائن کر لیں، میں آپ کو اکاؤنٹ کے عہدے پر اپائنٹ کر رہا ہوں۔ اس کے بعد یہ آپ کی کارکردگی پر منحصر ہے کہ آپ خود کو کس عہدے کے لیے اہل ثابت کرتے ہیں''۔

''تھینک یو ویری مچ سر۔ انشاء اللہ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا''۔

علی نے پر اعتماد لہجے میں کہا تھا اور اپنے کام سے یہ بات سچ ثابت کر دکھائی۔ چند ماہ میں وہ یاسین بیگ کی آنکھوں کا تارا بن گیا تھا اور تین ماہ قبل انہوں نے اسے مارکیٹنگ سپروائزر کے عہدے پر ترقی دی تھی۔ انہیں اپنے انتخاب پر رشک تھا۔ یوں بھی وہ اپنی کمپنی میں زیادہ تر ایسے نوجوانوں کو بھرتی کرنے کے حامی تھے، جس کے آگے پیچھے صرف غربت اور مجبوری ہو۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ غریب اور مجبور شخص کے لیے ملازمت بہت بڑی عیاشی اور افسر شاہی ہوتی ہے۔ وہ دل لگا کر کام کرتا

ہے، مالک اس سے کسی بھی وقت کوئی بھی کام لے سکتا ہے اور غریب اور مجبور شخص اپنی ملازمت پکی رکھنے کی خاطر اپنی پوری توانائی اور صلاحیت کمپنی کے کام پر صرف کر دیتا ہے۔ یاسین بیگ دوغلی سوچ رکھتے تھے۔ ایک طرف تو وہ اپنے ورکرز کی صلاحیتوں کی تعریف بھی دل کھول کر کرتے تھے اور دوسری طرف انہیں اپنا احسان مند اور ممنون بھی بنائے رکھنا چاہتے تھے۔ وہ ورکرز کو پوری طرح اپنے اور اپنی کمپنی کے حق میں رکھنا چاہتے تھے۔ اس سے ان کو اور ان کی کمپنی کو ہمیشہ فائدہ ہی پہنچتا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز علی نئے فلیٹ میں شفٹ ہو گیا۔ وہ کشادہ اور پر آسائش بیڈ روم مع باتھ کے ساتھ تھے۔ لاؤنج میں ضرورت کی ہر چیز اپنی جگہ آراستہ تھی۔ کچن میں بھی ضروری سامان موجود تھی۔ فریج بھی تھا۔ ایک اسٹور روم تھا۔ غرضیکہ ہر طرح سے پورا اور مکمل گھر تھا۔ وہ اپنی محنت اور اللہ کی رحمت پر بہت مسرور تھا۔ آج اسے اپنی محنت اور صبر کا پھل مل گیا تھا۔ اگلے دن وہ یاسین بیگ کے آفس میں ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے موجود تھا۔

’’بہت بہت شکریہ سر! مجھے فلیٹ بہت پسند آیا ہے۔ سجاوٹ بھی بہت عمدہ اور نفیس کرائی ہے آپ نے جسے دیکھ کر واقعی فلیٹ کے گھر ہونے کا احساس ہوتا ہے‘‘۔

’’مسٹر علی گھر ہونے کا احساس تو گھر والی سے ہوتا ہے۔ تمہارے کچن کو کون استعمال کرے گا۔ میری مانو، اب گھر والی بھی لے ہی آؤ‘‘۔ یاسین بیگ نے مسکراتے ہوئے مشورہ دیا۔ وہ ایک طرح سے اسے ایک اور احسان تلے دبانا چاہتے تھے۔

’’سر مجھے کون دے گا اپنی لڑکی؟‘‘ وہ مسکراتے ہوئے بولا میرے آگے پیچھے تو کوئی ہے بھی نہیں‘‘۔

’’تو برخوردار! یہ کام تو تم خود بھی کر سکتے ہو‘‘۔

’’کون سا کام سر؟‘‘ اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

’’بھئی شادی والا کام کیا کوئی لڑکی سے نظر میں؟‘‘ یاسین بیگ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

وہ ہنس کر بولا ’’نہیں سر! مجھے اتنی فرصت ہی کہاں ملی ہے کہ لڑکیوں کو نظر بھر کے دیکھتا۔ اب آپ نے کہا ہے تو کوشش ضرور کروں گا‘‘۔

’’کوشش کامیاب ہو جائے تو مجھے ضرور بتانا، میں تمہارا رشتہ لے کر لڑکی والوں کے پاس جاؤں گا‘‘۔ انہوں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ وہ اسے پوری طرح اپنی خوش اخلاقی کے جال میں پھنسائے رکھنا چاہتے تھے، اپنی عزت اور اہمیت بڑھوانے کے لیے۔

’’شکریہ سر! اب تو آپ ہی میرے بڑے ہیں۔ بہت احسان ہیں آپ کے مجھ پر۔ سر آئی ایم گریٹ فل ٹو یو‘‘۔ وہ احسان مندی اور انکسار سے بولا۔

علی کی یہ عاجزی یاسین بیگ کی انا کو خوراک مہیا کر رہی تھی۔ وہ خود کو علی سے بہت بلند تر سمجھ رہے تھے۔ اخلاقاً بھی ان کے منہ سے یہ نہیں نکلا کہ علی نے جو کچھ حاصل کیا، یہ اس کی اپنی محنت اور قابلیت کا ثمر ہے۔ ابھی علی کی عاجزی کی بازگشت کمرے میں ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک دلکش نسوانی آواز نے کمرے میں جیسے جلترنگ بجا دیے۔

’’ہیلو پاپا!‘‘ یاسین بیگ نے دروازے کی سمت دیکھا۔ علی نے بھی فوراً اپنی نشست چھوڑ دی۔

’’اوکے سر میں اب چلتا ہوں‘‘۔ وہ آنے والی ہستی کو دیکھے بغیر آفس سے باہر نکل گیا۔

’’پپا یہ کون صاحب تھے؟‘‘ عینی نے بھی علی کی پشت ہی دیکھی تھی اس کے جانے کے بعد میز کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا:

’’یہ علی تھے، ہماری کمپنی کے مارکیٹنگ سپروائزر۔ میں نے تمہیں بتایا تو تھا ان کے بارے میں‘‘۔

''اوہ، تو یہ تھے مسٹر محمد علی۔ ہونہہ۔ ہیلو تک نہیں بولے، اخلاقاً بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ آپ تو ان کی بہت تعریف کرتے ہیں، مجھے تو بہت مغرور لگتے ہیں''۔ عینی کو اپنے نظر انداز کیے جانے کا غصہ تھا، تپ کر بولی۔ یاسین بیگ نے مسکراتے ہوئے کہا:

''ارے نہیں بے بی! علی مغرور بالکل نہیں ہے۔ بس اس کی عادت ہے کہ وہ اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ ادھر ادھر کے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑاتا۔ بہت نیک اور خوددار لڑکا ہے''۔

''او پلیز پپا، اب آپ مسٹر علی کی تعریف میں اشعار نہ کہنا شروع کر دیجیے گا''۔ وہ زچ ہو کر بولی۔

''اشعار تو آدمی اپنے محبوب کی شان میں کہتا ہے اور وہ کوئی میرا محبوب تھوڑی ہے''۔ وہ ہنسے۔

''اینی ہاؤ پپا، مجھے کوئی غرض نہیں ہے آپ کے مسٹر علی سے''۔ وہ اپنے لمبے لمبے بہت نفاست سے تراشے ہوئے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''لیکن مجھے تو غرض ہے۔ آخر کو وہ میرا سب سے زیادہ لائق اور ذہین ورکر ہے''۔

''پلیز پپا''۔ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے چیخی۔

''او کے۔ او کے''۔ وہ ہنسنے لگے۔ ''اچھا یہ بتاؤ ہماری بیٹی کا پرچا کیسا ہوا ہے آج؟''

''اے ون پپا''۔ وہ خوش ہو کر بتانے لگی۔ ''دیکھ لیجیے گا اس بار بھی آپ کی بیٹی پورے کالج میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دے گی''۔

''ہوں۔ ویری گڈ''۔ وہ خوشی سے مسکراتے ہوئے بولے یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ بھئی آخر ہماری بیٹی ہے اور ہم اپنی بیٹی کو گریجویشن میں پوزیشن لینے کی صورت میں ایک نئی کار خرید کر دیں گے گفٹ کے طور پر''۔

''اور ئیلی پپا'' وہ خوشی سے اچھل کر بولی۔

''یس بے بی!'' وہ مسکرائے۔

''تھینک یو پپا! آپ کار بک کرا دیں کیونکہ کالج کی ٹاپ تھری پوزیشنز آپ کی بیٹی ہی لے گی'' عینی نے بڑے اعتماد اور یقین سے پر لہجے میں کہا۔

''تینوں پوزیشنز تم اکیلی کیسے لوگی؟''

''پپا پہلی دو میں سے تو ایک لازمی میری ہوگی۔ بیڈ لک ہوئی تو تھرڈ پوزیشن آ جائے گی، لیکن کار میں تینوں صورتوں میں لوں گی، ہاں۔'' اس نے اپنے پاؤں ہلاتے ہوئے کہا۔

''او کے''۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا اور انٹرکام پر آرڈر دے دیا۔

''سر کوئی قریشی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں''۔ سیکرٹری نے انہیں انٹرکام پر اطلاع دی۔

''کون سے قریشی صاحب؟''

''سر ان کا پورا نام زاہد قریشی ہے، وہ خود کو آپ کا دوست بتا رہے ہیں'' سیکرٹری نے بتایا۔

''ہاں، ہاں، ہاں میں سمجھ گیا۔ آپ انہیں اندر بھیج دیجیے اور ہاں تین گلاس جوس بھی بھجوا دیجیے''۔

''رائیٹ سر!'' سیکرٹری نے زاہد قریشی کو آفس میں جانے کا کہا۔ وہ مسکراتے ہوئے آفس میں داخل ہوئے تو ان کی پہلی نگاہ عینی پر ہی پڑی۔ وہ اس کا سحر انگیز حسن دیکھ کر مبہوت ہو گئے۔ عینی کو ان کا یوں گھور گھور کر دیکھنا سخت ناگوار گزرا۔ وہ اپنا پرس اور سن گلاسز اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

''ہیلو زاہد صاحب'' آج کیسے یاد کر لیا مجھے؟'' یاسین بیگ نے زاہد قریشی سے بغل گیر ہوتے ہوئے پوچھا۔

''یاد تو اکثر کرتا تھا، یہاں آ کر افسوس ہو رہا ہے کہ یہاں آنے میں دیر کیوں

کردی۔ اگر یاد کرتے ہی ملنے چلا آتا تو روح خوش ہو جاتی۔'' زاہد قریشی نے سامنے کھڑی کھلی کھلی رنگت والی عینی کے چہرے پر نظریں جما کر ذومعنی انداز میں کہا تو وہ غصے سے سرخ ہو گئی۔

''کتنا چیپ شخص ہے یہ اور پپا اسے گلے سے لگائے کھڑے ہیں''۔ اس نے غصے سے سوچا''۔ پپا میں گھر جا رہی ہوں''۔

''بیٹا جوس تو پیتی جاؤ۔'' یاسین بیگ نے کہا۔

''تو پپا میں گھر جا کر ہی پی لوں گی''۔

''بھئی ہماری روح کی خوشی کا کیا ہوگا؟'' زاہد قریشی نے کہا۔

''مل کر بھی خوشی نہیں ہوئی کیا آپ کی روح کو۔'' یاسین بیگ ہنس کر بولے۔

''ہوئی ہے، بہت ہوئی ہے''۔ زاہد قریشی نے بظاہر یاسین بیگ سے کہا تھا مگر دیکھا عینی کی جانب تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ میز پر رکھا پیپر ویٹ اٹھا کر اس کے منہ پر دے مارتی اس گھٹیا رائے زنی پر، مگر اندر ہی اندر سلگ کر رہ گئی۔ وہ دونوں دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے تھے اور وہ جانے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ آخر کار بول ہی پڑی۔

''پپا مجھے جانا ہے، راستہ دیجیے پلیز''۔

''اوہ سوری بیٹا، ہم راستے میں ہی کھڑے ہو گئے''۔

یاسین بیگ ایک طرف ہوتے ہوئے بولے۔

''ان کا تعارف تو کرواؤ یاسین بیگ''۔ زاہد قریشی نے عینی کے چہرے کو گہری نظروں سے دیکھا۔

''یہ مجھے پپا کہہ رہی ہے تو یقیناً میں اس کا پپا ہوں اور یہ میری بیٹی عینی ہے اور عینی بیٹے، یہ زاہد قریشی ہیں، میرے ہمدرد، میرے محسن۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں ان کی عنایتوں کی وجہ سے ہوں۔'' یاسین بیگ نے تعارف کرانے کے بعد عینی کو بتایا۔

''پپا ان کی نہیں، آپ اللہ تعالیٰ کی عنایتوں اور اپنی محنتوں کی وجہ سے اس مقام پر پہنچے ہیں، ہاں انہوں نے آپ کی مدد ضرور کی ہوگی''۔ وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔

''بیٹا ان کی مدد ہی مجھے اس بلندی تک لے آئی ہے۔'' یاسین بیگ نے سٹپٹا کر کہا۔ زاہد قریشی کی نظریں بدستور اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

''ہوشیار رہیے گا پپا'' اس مدد کی بلندی کسی کو پستی میں نہ لے جائے۔ ہائے پپا۔''

وہ اپنی معنی خیز بات ان کے کانوں تک پہنچا کر آفس سے باہر چلی گئی۔

''بہت ذہین ہے تمہاری بیٹی!'' زاہد قریشی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

اس کی نظروں میں عینی کا بھرپور سراپا گویا نقش ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ عجیب سی خوشی اور سرشاری محسوس کر رہا تھا۔

''شکریہ''۔ آپ تشریف لائے، مجھے بہت خوشی ہوئی۔ یہ جوس پیجیے''۔ ملازم جوس رکھ کر چلا گیا تھا، انہوں نے گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

''اور سنائیے زاہد صاحب! پاکستان کب آنا ہوا! بھابھی اور بچوں کا کیا حال ہے؟''

''حال سب کا خوشحال ہے، میں یہاں آیا تو بزنس کے سلسلے میں تھا لیکن اب ارادہ کچھ اور کرنے کا ہے''۔ وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

''کچھ اور کیا کرنے کا ارادہ ہے؟'' یاسین بیگ نے پوچھا'' ذرا کھل کر بتائیے''۔

''بتاؤں گا تمہیں ہی کھل کر بتاؤں گا لیکن یہاں آفس میں نہیں گھر میں''۔ انہوں نے جوس کا گھونٹ بھر کر کہا۔

''ضرور، کیوں نہیں۔ آپ کسی بھی وقت گھر تشریف لے آئیں بلکہ کل رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائیں''۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے"۔ زاہد قریشی نے جوس کا خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا

"اب میں چلتا ہوں"۔

"کچھ دیر تو بیٹھیے پلیز"۔

"بیٹھیں گے، ضرور بیٹھیں گے، گھر آئیں گے تو تفصیل سے بات ہوگی"۔
انہوں نے اٹھ کر کھڑے ہو کر کہا۔

"چلیے جیسے آپ کی مرضی، پھر کل ڈنر پر ملاقات ہوگی"۔ یاسین بیگ نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے دروازے تک آ گئے اور رک کر بولے:

"ملاقات کے علاوہ بہت اہم بات بھی ہوگی"۔

"اہم بات"۔ یاسین بیگ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہاں بات تو میں کل ہی بتاؤں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہارا بزنس کیسا چل رہا ہے۔ ٹیکس وغیرہ کی کوئی پرابلم تو نہیں ہے نا؟"

"نہیں زاہد صاحب، جب سے آپ نے ہاتھ پکڑا ہے، ٹیکس وغیرہ کے چکر سے تو جان چھوٹ گئی ہے۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ اگر کبھی میرے لائق کوئی خدمت، کوئی کام ہو تو ضرور بتایئے گا۔ مجھے آپ کے کام آ کر بہت خوشی ہوگی"۔ وہ بڑے احسان مند ہو کر بولے۔

"تو ٹھیک ہے، کل میں تمہیں کام بتاؤں گا اور اگر تم نے انکار کیا تو ٹیکس چھوٹ کی، ڈیوٹی فری کی، قرض لینے اور واپس نہ کرنے کی تمام دستاویزات میں تمہارے علاوہ کسی اور کو بھی دکھا سکتا ہوں"۔ زاہد قریشی نے انہیں بلیک میل کرنے کی دھمکی بڑی خوبصورتی سے دی تھی۔ یاسین بیگ اس کے رویے کے اس اچانک تبدیلی پر پریشان ہو گئے۔

"جی مگر......" وہ کچھ بول ہی نہ سکے۔

"اگر مگر نہ کرنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ میں اب چلتا ہوں، کل ڈنر پر ملاقات

ہوگی۔ یاد رکھنا اور ہاں بھابھی کو میرا اسلام کہنا اور اپنی اکلوتی بیٹی کو میرا پیار دینا۔ میں خود بھی یہ فریضہ ادا کرنے کے لیے آؤں گا۔ تب تک کے لیے اللہ حافظ"۔

وہ بہت عجیب انداز اور لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے چلے گئے اور یاسین بیگ کو نہ سمجھ میں آنے والی الجھن میں مبتلا کر گئے۔

☆☆☆

اگلے دن ڈنر تک کا وقت انہوں نے بہت پریشانی میں گزارا تھا۔ مسز یاسین بیگ اور عینی بھی تیار تھی۔ عینی کو سخت کوفت ہو رہی تھی زاہد قریشی کے آنے سے وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

زاہد قریشی آئے تو ان تینوں کے لیے بہت سے قیمتی تحائف بھی ان کے ساتھ تھے۔ مسز یاسین بیگ نے شکریے کے ساتھ یہ تحفے قبول کر لیے۔

بیٹا عینی آ بھی جاؤ، ڈنر نہیں کرو گی کیا؟ کھانا لگنے کے بعد یاسین بیگ کے کمرے میں اسے بلانے چلے آئے۔

"پپا ڈنر تو میں کروں گی مگر آپ کے اس دوست کے ساتھ ایک میز پر ہرگز نہیں۔ وہ شخص انتہائی چیپ مائنڈڈ لگتا ہے مجھے"۔ اس نے صاف گوئی کی حد کر دی۔

"بیٹا ایسا نہیں کہتے، وہ ہمارے محسن ہیں۔" یاسین بیگ نے اسے سمجھایا۔

"پپا محسن اگر چیپ مائنڈڈ ہو، کمینگی پر اتر آئے تو آپ اسے سر آنکھوں پر تو نہیں بٹھا سکتے نا"۔

"عینی بیٹا کیا ہو گیا ہے تمہیں، یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"پپا آپ خود بھی لوگوں پر احسان کرتے ہیں تاکہ ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ لیکن آپ بھی زاہد قریشی کے احسان مند ہیں۔ اس لیے اگر کوئی فیصلہ کرنے کی نوبت آئے تو سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجیے گا کہیں وہ اپنے احسانات کے بدلے آپ سے آپ کی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ اپنی مرضی کے مطابق نہ کروا بیٹھے اور ایک بات اور بتا دوں آپ کو پپا میں اس احسان مندی پر قربان ہونا پسند نہیں کروں گی، میں نے کل

چند منٹ کی ملاقات سے ہی زاہد قریشی کے کردار کو جانچ لیا تھا۔ آپ پلیز مجھے اس شخص کے سامنے جانے پر مجبور نہ کریں۔ میں آپ کی بیٹی ہوں پپا اور آپ کو اپنی بیٹی کی خوشی اور عزت عزیز ہونی چاہیے، اپنے دوست کی خواہش نہیں۔ سوری پپا، میں کچھ زیادہ اور بہت تلخ بول گئی ہوں۔ آئی۔ ایم۔ سوری''۔

اس نے ان کے ہاتھ تھام کر آخر میں معذرت خواہانہ لہجے میں کہا تو وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں بولے''۔

''اٹس آل رائٹ عینی بیٹا میں تمہیں کسی بھی کام کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔ میں تمہاری خوشی کو ترجیح دوں گا۔ تم بے فکر رہو اور اپنے کمرے میں ہی ڈنر کر لو''۔

''تھینک یو پپا''۔ وہ مطمئن ہو کر مسکرا دی۔

''یاسین بیگ، ان کی بیگم اور زاہد قریشی نے کھانے کے بعد چائے نوش کی۔ اس دوران ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ ابھی تک زاہد قریشی اپنے مطلب کی بات پر نہیں آئے تھے۔ سو یاسین بیگ نے خود ہی پوچھ لیا کیونکہ وہ اب جانے کے لیے کھڑے تھے۔

''زاہد صاحب! آپ نے کوئی کام کہنا تھا مجھ سے شاید آپ بھول گئے''۔

''بھولا تو میں نہیں ہوں''۔ زاہد قریشی نے اپنی گاڑی کے قریب آتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کہیے نا''۔

''تم نے کام کرنے کی ہامی بھری تھی، تو تمہیں اب ہر صورت یہ کام کرنا ہوگا اور وہ یہ کہ میں تمہاری بیٹی عینی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے اطمینان سے ہر چند کہ یاسین بیگ عینی کی باتوں کے بعد کسی بھی غیر متوقع بات کے لیے تیار تھے، اس کے باوجود ان کے سر پر جیسے چھت آ گری۔ حیرت اور شاک کی کیفیت میں وہ اسے دیکھتے ہوئے بولے ''کیا! عینی سے شادی؟''

''ہاں یہی کام تھا، مجھے تم سے۔ اب انکار مت کرنا ورنہ وہ بتائیں اور

کروڑوں کا قرض۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات۔ میں ایک ہفتے بعد آج ہی کے دن انگوٹھی لے کر آؤں گا اور ہاں مجھے جواب مثبت ہی چاہیے۔'' وہ اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر بولے۔

''لیکن زاہد صاحب یہ ناممکن ہے۔'' یاسین بیگ نے تیزی سے کہا۔

''تمہارے لیے یہ بالکل بھی ناممکن نہیں ہے، بس اچھی طرح سوچ سمجھ کر انکار کرنا''۔

یہ کہتے ہوئے وہ عجیب انداز میں مسکرائے اور گاڑی اسٹارٹ کر کے گیٹ سے باہر لے گئے۔

''وہ۔ تو عینی اس لیے وہ سب باتیں کہنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اتنی سمجھدار ہو گئی ہے وہ اور میں اب سمجھا کہ کل آفس میں زاہد قریشی کے آتے ہی اس کی باتیں سنتے ہی وہ جانے کے لیے کیوں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ میں اس کی باتوں کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ لیکن عینی نے فوراً ان کا مفہوم سمجھایا تھا۔ جبھی تو وہ...... او مائی گاڈ! اس قدر گری ہوئی نظریں ہیں اس شخص کی کہ اپنی بیٹی کی ہم عمر بلکہ اس سے بھی چھوٹی عمر کی لڑکی سے شادی کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اور نقب لگائی بھی تو کہاں؟ میرے گھر میں۔ نہیں میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا''۔

''اب کیا کریں گے آپ وہ تو دھمکی دے گیا ہے؟'' مسز یاسین بیگ جو ان کے ساتھ چلتی ہوئی آ رہی تھیں، ان کی خود کلامی سن کر پریشانی سے بولیں۔

''میں آئندہ اتوار سے پہلے پہلے عینی کی شادی کر دوں گا''۔ انہوں نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ان کا دماغ بہت تیزی سے کام کر رہا تھا، مشورے دے رہا تھا۔ ان کے اعصاب پر غصہ سوار تھا۔ یہ ان کی غیرت اور عزت کا مسئلہ تھا۔ ایک ساٹھ سالہ شخص نے ان کی بیٹی کو میلی نظر سے دیکھا تھا۔ ان کا بس چلتا تو وہ اس کی آنکھیں نکال دیتے۔ اس کی زبان کاٹ دیتے اور کتوں کے آگے ڈال دیتے لیکن چونکہ بیٹی کا معاملہ تھا اور وہ بھی اکلوتی بیٹی کا اس لیے وہ اس معاملے کو آرام سے، سہولت سے حل کرنا چاہتے تھے یہ ان کی عزت، غیرت اور بیٹی کی خوشی کا

معاملہ تھا، وہ اسے تماشا نہیں بنا سکتے تھے۔

''عینی کی شادی تو میں انجم آپا کے بیٹے عاصم سے کرنا چاہتی ہوں۔ آپا بھی یہی چاہتی ہیں لیکن وہ تو لندن سے دو تین ماہ بعد لوٹے گا۔ آپ ایک ہفتے میں کس کے ساتھ کریں گے عینی کی شادی؟'' مسز یاسین بیگ نے فکرمندی سے پوچھا۔

''میری شادی!' عینی نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا ہی تھا کہ ان کی بات کان میں پڑی اور حیران ہو کر بولی ''یہ اچانک میری شادی کا خیال کیوں آ گیا آپ کو؟''

''وہ کم بخت زاہد قریشی ہمیں یہ خیال دے گیا ہے''۔ مسز یاسین بیگ نے بتایا۔ ''تمہارا رشتہ مانگا ہے اس نے اپنے لیے''۔

''واٹ نان سینس''۔ وہ غصیلے لہجے میں بولی۔ ''پپا میں نے کہا تھا نا آپ کو کہ وہ چیپ مائنڈڈ شخص ہے، ضرور کوئی غلط بات کرے گا''۔

''تم نے صحیح کہا تھا بیٹا، لیکن تم فکر مت کرو۔ ہم تمہاری شادی اس حریص بڈھے سے کبھی اور کسی قیمت پر نہیں کریں گے۔'' یاسین بیگ نے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔

''تو کس سے کریں گے آپ میری شادی؟''

''محمد علی سے''۔ انہوں نے انکشاف کیا تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔

''کیا؟ وہ...... وہی محمد علی مغرور سا سپروائزر؟'' وہ ہکلا کر بولی۔

''عینی بیٹے! وہ مغرور بالکل نہیں ہے، وہ تو بس ریزرو اور خوددار لڑکا ہے۔ بہت نیک اور شریف ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اس نے اپنی شادی کا معاملہ بھی مجھ پر چھوڑ رکھا ہے۔ وہ بالکل اکیلا ہے اور میرا احسان مند بھی ہے کہ میں نے اسے جاب دی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''پپا احسان مند تو آپ بھی ہیں''۔ عینی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آج آپ زاہد قریشی کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہے ہیں۔ کل اگر محمد علی نے آپ کو بلیک میل کیا یا

آپ نے اسے بلیک میل کیا تو نتائج بہت سنگین ہوں گے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا اور ہم کون سا ہمیشہ کے لیے تمہیں اس کے لیے باندھیں گے۔ بس دو چار ماہ کی بات ہے، اس دوران عاصم آ جائے گا، پھر تمہیں محمد علی سے علیحدگی اختیار کر کے اس کے ساتھ رخصت ہونا ہے۔ عاصم اور انجم آپا کو ہم سمجھا لیں گے۔'' یاسین نے سنجیدگی سے کہا۔

''لیکن پپا یہ تو بہت لمبا پراسیس ہے۔ اور آپ ایک لاوارث شخص کے ساتھ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ پینڈو اور مغرور شخص کے ساتھ۔'' وہ غصے سے بلند آواز میں بولی۔

''بیٹا وہ گاؤں کا رہنے والا ضرور ہے، مگر اب اس میں گاؤں والی کوئی بات نہیں ہے۔ ایک دم انگریز لگتا ہے۔ بہت مہذب اور سمجھدار ہے۔ وہ میرا کہا کبھی نہیں ٹالے گا۔ یہ کام ضرور کرے گا اور جب ہم اسے کہیں گے، وہ تمہیں طلاق دے دے گا۔ ہم کون سا ایک ملازم سے تمہیں بیاہنا چاہتے ہیں۔ تمہارے لیے ایک سے بڑھ کر ایک لکھ پتی اور کروڑ پتی لوگوں کے رشتے موجود ہیں۔ یہ تو مجبوری ہے کہ ہم ان رشتوں کو قبول نہیں کر سکتے ورنہ زاہد قریشی ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔ اب کیا تم چاہتی ہو کہ ہم اس بڈھے سے تمہاری شادی کر دیں''۔

''ہرگز نہیں پپا''۔ وہ فوراً بولی ''میں نام کے اس زاہد کو شوٹ کر دوں گی''۔

''تو بیٹا پھر محمد علی سے شادی پر راضی ہو جاؤ، میں کل ہی اس سے بات کروں گا۔ وہ میری بات نہیں ٹالے گا۔'' یاسین بیگ نے نرمی سے کہا۔

''او کے پپا''۔ وہ ہار مانتے ہوئے بولی۔

''گڈ!'' وہ خوش ہو کر بولے پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''اب میں چلتا ہوں، مجھے اسی سلسلے میں کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں''۔

ان کے جانے کے بعد اس کی امی اسے لے کر بیٹھ گئیں۔

''لیکن ممی!'' وہ کچھ سوچ کر بولی ''زاہد علی کو پتا چل جائے گا کہ آپ نے اس

کی وجہ سے میری شادی اتنی جلدی کی ہے۔ وہ نکاح نامہ دیکھ کر سمجھ جائے گا۔ آپ نے اسے انکار اس طریقے سے کیا ہے تو پھر کیا ہو گا؟''

''بیٹا تمہارے پپا نے سوچا ہے۔ ہم اسے نکاح نامہ نہیں دکھائیں گے۔ تصاویر کھینچ لیں گے تاکہ اسے البم میں لگا کر مطمئن کیا جا سکے۔ اول تو شادی کی تصویریں دیکھنے کے بعد وہ نکاح نامہ دکھانے پر اصرار نہیں کرے گا اور اگر کیا بھی تو ہم کہہ دیں گے کہ وہ تمہارے شوہر کے پاس ہے۔ بس بیٹا دو ماہ کی تو بات ہے، تمہیں دو ماہ تک محمد علی کے ساتھ رہنا ہے مگر...... اجنبی بن کر۔'' بالآخر ہچکچاتے ہوئے وہ اس موضوع کی طرف آ ہی گئیں جس پر بات کرنے کے لیے وہ عینی کو لے کر بیٹھی تھیں۔ ''دیکھو بیٹی! یہ رشتہ صرف کاغذ تک محدود رہے گا'۔ انہوں نے جھجکتے ہوئے کہا'' عملاً اس کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات؟'' ممی نے پوچھا۔

''جی ممی! سمجھ رہی ہوں''۔ جو بات ممی کے الفاظ اسے کھل کر نہیں سمجھا سکے تھے، وہ بات ان کی ہچکچاہٹ اور جھجک نے کھل کر بیان کر دی تھی۔ ''پپا سے کہیے تاکہ یہ بات اپنے سپروائزر کو بھی اچھی طرح سمجھا دیں۔'' اس نے نظریں جھکا کر کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''ہاں، تمہارے پپا اسے بتا دیں گے، وہ تمہیں ہاتھ نہیں لگائے گا۔'' اسے ماں کا جملہ سنائی دیا۔

☆☆☆

''تم شادی کی تیاری کرو''۔ یاسین بیگ گھر واپس آئے تو انہوں نے بیوی سے کہا۔ جیولری وغیرہ کی حد تک تو تیاری کرنا ہی ہو گی نا''۔

''اس کی آپ بالکل فکر نہ کریں، میں کل ہی سارا انتظام کر لوں گی۔'' مسز یاسین بیگ نے مسکرا کر کہا۔

''غضب خدا کا، کیسے کیسے کام ہمیں کیسے کیسے لوگوں کی وجہ سے کیسے کیسے لوگوں سے کروانا پڑ رہے ہیں''۔ یاسین بیگ نے دانت پیستے ہوئے کہا اور غصے سے مکہ بنا

کر دوسرے ہاتھ میں مارا۔

☆☆☆

اگلے دن علی ان کے روبرو تھا۔ وہ اس سے حال احوال پوچھنے کے بعد اصل بات کی طرف آ رہے تھے۔ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولے۔

''علی! مجھے تم سے ایک بہت ضروری کام ہے۔ امید ہے کہ تم انکار نہیں کرو گے؟''

''سر آپ حکم کیجیے'' اگر کام میرے اختیار میں ہوا تو میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔'' علی نے پوری سنجیدگی اور خلوص سے کہا۔

''علی میں تمہیں اپنا داماد بنانا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے بلاتمہید اصل بات کہہ دی۔

''جی سر!'' وہ حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔ مجھے آپ اپنا داماد بنانا چاہتے ہیں؟''

''ہاں، لیکن صرف دو ماہ کے لیے''۔ یہ ایک اور حیران کن انکشاف تھا اس کے لیے''۔

''لیکن کیوں سر؟'' اس نے حیرت آمیز سنجیدگی سے پوچھا۔ ''ایسی بھی کیا افتاد آن پڑی ہے کہ آپ اپنی بیٹی کی شادی اتنی جلدی اور مجھ سے کرنا چاہتے ہیں اور وہ بھی صرف دو ماہ کے لیے''۔

''بھئی تم یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ میری بیٹی میں کوئی عیب، کوئی برائی کوئی خرابی ہے جو میں تم سے......''

''نہیں سر! یہ کیا میں تو کچھ بھی نہیں سمجھ رہا''۔ وہ فوراً ان کی بات کاٹ کر بولا۔

''علی دراصل بات یہ ہے کہ زاہد قریشی ایک ساٹھ برس کا بوڑھا اور ا[illegible]

چیپ شخص ہے۔کل وہ یہاں آفس آیا تھا تو عینی بھی یہاں موجود تھی اور غصے میں یہاں سے چلی گئی تھی اور زاہد قریشی نے رات ہمیں عینی کی شادی اپنے سے کرنے کا شوشہ چھوڑ دیا ہے اور اتوار تک کی مہلت دی ہے۔ورنہ وہ ہماری کمپنی کے متعلق فائلز حکام بالا تک پہنچا دے گا اور ہمارا چار پانچ کروڑ کا نقصان ہو جائے گا، صرف یہی نہیں ہماری کمپنی کی ریپوٹیشن بھی خراب ہو جائے گی جو ہم لوگ افورڈ نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہم نے سوچا ہے کہ عینی کی شادی تم سے کر دی جائے تا کہ زاہد قریشی سے دشمنی نہ ہو۔وہ ہماری مدد کرتا رہا ہے اور اب بلیک میل کرنا چاہتا ہے۔اپنی مرضی کا کام کروانا چاہتا ہے۔میں اپنی پھول جیسی بچی اس بڈھے اور ہوس پرست، لالچی شخص کے حوالے کبھی نہیں کروں گا''۔

''تو سر آپ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں؟'' علی نے ساری بات سننے کے بعد پوچھا۔

''پہلے تو تم یہ بتاؤ کہ کیا تم اس مشکل گھڑی میں میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو؟''

''جی سر، میں بالکل تیار ہوں، مجھے بہت خوشی ہوگی اگر میں آپ کی مشکل کم کر سکوں یا آپ کے کسی کام آسکوں''۔علی نے پورے خلوص سے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو علی، تم نے میری بڑی مشکل حل کر دی۔بس اب تم کل ہی دولہا بننے کے لیے تیار ہو جاؤ، باقی معاملات میں سنبھال لوں گا۔تم اگر چاہو تو ہفتے دس دن کی چھٹی بھی لے لو۔یاسین بیگ نے خوش ہو کر آخر کی۔

''او کے سر تھینک یو ویری مچ۔'' وہ مسکراتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا۔

تیسرے روز وہ یاسین ولا میں اپنے دو قریبی دوستوں کے ہمراہ دولہا بنا بیٹھا تھا۔قبول و ایجاب کی رسم ادا ہوئی۔مہمانوں کو پر[illegible] چائے پیش کی گئی۔نہایت سادہ مگر پر وقار تقریب تھی یہ جس میں یاسین بیگ کے ملازمین اور وہ خود شریک

تھے۔عینی کو دلہن بنانے کے لیے ماہر بیوٹیشن کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔وہ پوپی ریڈ کلر کے شرارہ سوٹ میں قیمتی زیورات سے مزین بے انتہا روپ کٹا رہی تھی۔علی نے اسے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کے نکاح میں اتنی حسین و جمیل حوروں جیسی لڑکی آئی ہے۔اس کا دل آج پہلی بار ایک انوکھے احساس کے ساتھ دھڑکا تھا۔دھڑکنیں اسے دیکھ کر بے ترتیب ہونے لگی تھیں۔دل میں ایسے لطیف مگر شریر احساسات ابھار رہے تھے جس سے وہ آج تک ناآشنا رہا تھا۔وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اس لڑکی کو صرف دو ماہ بعد ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے نکال سکے گا؟ کیا ایک گھر میں رہتے ہوئے، ایک مضبوط بندھن کے ہوتے ہوئے وہ اس سے دور رہ سکے گا؟ ''نہیں''۔اس کا دل بہت زور سے چیخا تھا۔وہ بے بس ہوتا جا رہا تھا۔یاسین بیگ کے سامنے خود کو ابھی سے شرمندہ محسوس کر رہا تھا۔

عینی اور علی کی ایک ساتھ بہت سی تصاویر کھینچی گئیں۔یاسین بیگ اور مسز یاسین بیگ کے ساتھ گروپ فوٹو بنائے گئے اور پھر انہیں یاسین بیگ کا ڈرائیور گاڑی میں علی کے فلیٹ تک لے گیا۔عینی کی ملازمہ نسرین بھی ان کے ساتھ آئی تھی۔وہ اسے اندر اس کے بیڈروم میں لے گئی۔بیڈروم بہت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا ایک تو فلیٹ نیا تھا۔دوسرے علی نے تھوڑا بہت اہتمام خود بھی کیا تھا۔عارضی سہی دو ماہ کے لیے ہی سہی، اس کی شادی تو ہوئی تھی، اس کی دلہن تو اس گھر میں آرہی تھی۔عینی نے پورے اطمینان کے ساتھ کمرے کا جائزہ لیا اور علی کے متعلق سوچنے لگی جسے اس نے ابھی تک دیکھا بھی نہیں تھا۔

''یہ شادی عارضی ہے، اسے دو ماہ بعد واپس بابل کے گھر چلے جانا ہے لیکن طلاق کا داغ اپنے ماتھے پر سجا کر''۔

''نہیں''۔وہ طلاق کے مفہوم اور گہرائی کو سمجھتے ہوئے ایک دم پریشان ہو کر بولی۔

''کیا نہیں؟ محترمہ آپ تین بار ہاں کہہ چکی ہیں''۔علی کی آواز اسے اپنے بہت قریب سے سنائی دی تھی۔اس نے ٹپٹا کر اوپر سر اٹھایا۔وہ دروازہ بند کر کے اندر آچکا تھا۔

''جی!'' وہ حیرت سے اسے تکنے لگی۔اسے خیال ہی نہیں آیا کہ وہ دلہن بنی بیٹھی ہے۔

سیاہ چمکدار آنکھوں، گھنے ریشمی سیاہ بالوں کو اسٹائلش لک دیئے، کھلی کھلی رنگت، وجیہ چہرہ، سرخی مائل لبوں پر دلفریب مسکراہٹ سجائے وہ اس کے بالکل سامنے بیٹھ گیا تھا۔وہ اس کے حسین سراپے میں ایسی کھوئی تھی کہ پلکیں جھپکانا بھول گئی تھی۔

''جی! یعنی علی، کیا بہت زیادہ پسند آگیا ہوں میں۔'' علی نے اس کے ہاتھ تھام کر بڑی شوخ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ جیسے ہوش میں آگئی۔

''جج جی ...... جی نہیں''۔وہ تیزی سے اپنے ہاتھ پیچھے کھینچ کر بولی تو وہ ہنس پڑا۔

''تو اتنے غور سے کیوں دیکھ رہی تھیں۔کہیں آپ کے خوابوں کے شہزادے کی شکل مجھ سے تو نہیں ملتی''۔وہ ٹائی کی ناٹ کھولتے ہوئے بڑے شوخ لہجے میں بولا۔

''جی نہیں۔میں نے کوئی خواب نہیں دیکھے اور آپ جائیے یہاں سے''۔اس نے تنک کر کہا۔

''ارے واہ! آپ ہمیں ہمارے ہی گھر میں ہمارے ہی بیڈروم سے جانے کی صدا لگا رہی ہیں۔محترمہ اب آپ کو اور مجھے اسی گھر میں، اسی بیڈروم میں رہنا ہے''۔وہ اس کے بے تحاشا حسن کے سامنے بری طرح ہار مانتے ہوئے بولا۔

''میں اس بیڈروم میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی''۔وہ غصے سے بولی۔

''تو چلو دوسرے بیڈروم میں رہ لینا میرے ساتھ''۔وہ شوخی سے بولا۔

''تم ...... تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو''۔وہ لڑنے والے انداز میں بولی۔

''اے تم نہیں، آپ۔سمجھیں''۔وہ ایک دم سے سخ اور بارعب لہجے میں بولا تو اس کی سٹی گم ہوگئی۔

''میں بے ادبی برداشت نہیں کرتا ہوں، اور میں تمہیں بتاؤں کہ میں کیا سمجھتا ہوں اپنے آپ کو......لڑکی! میں تمہارا شوہر ہوں اور شوہر ہی سمجھتا ہوں اپنے آپ کو''۔

''لیکن یہ......شادی اصلی تو نہیں ہے''۔وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''کیوں اصلی شادی میں کیا ہاتھی، گھوڑے بارات لے کر جاتے ہیں۔تمہارا نکاح عین اسلامی طریقے پر ہوا ہے۔گواہوں کی موجودگی میں ہوا ہے اور کسے کہتے ہیں اصلی شادی۔تم دلہن بنی میرے بیڈروم میں موجود ہو، اسے اصلی شادی ہی کہتے ہیں۔'' علی نے بارعب اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔وہ بہت بری طرح اس کے دل کو بھا گئی تھی اور اب اس کا دل بے ایمان ہوا جارہا تھا۔وہ اس سے زیادہ دیر دور نہیں رہ سکتا تھا۔اس کے حسن و دلکشی کے آگے اس کی ضبط کی صلاحیت ہار گئی تھی۔

''یہ شادی عارضی ہے۔'' وہ ہمت کر کے بولی۔''دو ماہ بعد آپ مجھے آزاد کر دیں گے''۔

''یہ تو دو ماہ بعد ہی معلوم ہوگا کہ میں تمہیں آزاد کرتا ہوں یا ہمیشہ کے لیے قید کر لیتا ہوں۔'' وہ اسے اپنی بانہوں کے حلقے میں لیے ہوئے بہت معنی خیز اور نرم لہجے میں بولا تو وہ ٹپٹا گئی۔اور پرکٹی چڑیا کی طرح اس کی مضبوط بانہوں کے پنجرے میں پھڑپھڑانے لگی۔

''پلیز یہ آپ کیا کر رہے ہیں......آ......آپ نے......پپا سے وعدہ کیا تھا کہ''۔

وہ اس کی مضبوط بانہوں میں پھنس کر رہ گئی تھی' بے بسی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''اول تو میں نے تمہارے پپا سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا اور دوم میں جو کچھ بھی

کرنے پر مجبور ہوں‘‘ ’’اس میں تمہارا اپنا قصور ہے۔‘‘ وہ اس کے چہرے کو وارفتگی سے دیکھتے ہوئے بولا۔

’’مم ...... میں نے ...... کیا کیا ہے؟‘‘ وہ ہکلاتے ہوئے بولی ’’میں نے تو آج پہلی بار...... آپ آپ کو دیکھا ہے‘‘۔

’’اور پہلی بار ہی اس قیامت کی نظر سے دیکھا ہے کہ میرے سارے ارادے موم کی طرح پگھل گئے ہیں۔ اس کا لہجہ محبتیں لٹا رہا تھا اور اپنی شکست کا اظہار و اعتراف کر رہا تھا۔ وہ اس کے لمس کی حدت سے بے ہوش ہونے کو تھی۔

’’تم بیوی ہو میری اور میں چاہتے ہوئے بھی تم سے دور نہیں رہ سکتا‘‘۔

’’لیکن پپا نے تو کہا تھا کہ آپ مجھے ہاتھ نہیں لگائیں گے؟‘‘ وہ اس کی قربت میں جلتی ہوئی بولی۔

’’اچھا! ......‘‘ وہ اس کی حالت اور معصومیت پر ہنس کر بولا ’’تمہارے پپا نے مجھ سے تو ایسی کوئی بات نہیں کہی‘‘۔

’’آپ بے ایمان ہیں‘‘۔ وہ غصے میں آتے ہوئے بولی۔ ’’آپ نے پپا کی بات دل سے نہیں مانی‘‘۔

’’دل سے تمہیں جو اپنا مان لیا ہے میری جان!‘‘ اس نے محبت پاش لہجے میں کہا اور اس کے چہرہ پر اپنی بے ساختہ و بے اختیار مچلتی محبت کی مہر ثبت کر دی، وہ تو جیسے حواس ہی کھو بیٹھی۔ بڑی مشکل سے خود کو نارمل کرنے کے بعد بولی۔

’’تم میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے‘‘۔

’’پھر تم!‘‘ وہ ایک دم غصے سے بولا تو وہ سہم گئی۔ وہ اس کی خوفزدہ صورت دیکھ اپنی مسکراہٹ دبا گیا۔

’’آ ...... آپ میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے‘‘۔ وہ ہمت کر کے دوبارہ بولی۔

’’تم پیار کرنے کو زبردستی کرنا کہتی ہو‘‘۔ وہ اس کی ٹھوڑی پکڑ کر مسکراتے،

محبت لٹاتے لہجے میں بولا تو اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ ہنس پڑا۔ وہ نروس سی ہو کر اپنے ہاتھ مسلنے لگی۔ علی نے اپنے گلے میں پہنی سونے کی زنجیر اتاری اور اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

’’اس وقت تو رونمائی میں یہ زنجیر ہی قبول کرو، کیونکہ میرا ارادہ تو تمہارے پپا کی بات ماننے کا تھا، اس لیے میں نے کوئی گفٹ نہیں خریدا تھا لیکن تمہیں دیکھ کر سارے ارادے بھک سے اڑ گئے ہیں۔ اب اس محبت بھری زنجیر کو قبول کرو‘‘۔

’’مجھے نہیں قبول کرنی یہ زنجیر۔‘‘ وہ غصے سے بولی۔

’’مجھے قبول کر لیا ہے چھ فٹ کے لیے چوڑے بندے کو قبول کر لیا ہے تو اس چھوٹی سی زنجیر کو قبول کرنے میں کیا قباحت ہے؟‘‘ وہ شوخی سے بولا اور زنجیر جس پر اس کے نام کا پہلا حرف AC کندہ تھا، اس کی گوری گوری صراحی دار گردن میں پہنا دی۔ اس کے وجود کی خوشبو، اس کے لباس کی خوشبو اسے دیوانہ بنا رہی تھی۔ وہ اپنے جذبوں کے اظہار پر پہرے نہیں بٹھا سکتا تھا۔ خود عینی کو اپنا آپ اس کی محبت اور قربت کے سامنے کمزور پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اس کی گرفت سے خود کو آزاد کرا سکی اور فوراً ہی جیولری اتارنے لگی۔ وہ چینج کر کے آیا تو وہ اپنے کپڑے لے کر فوراً ہی واش روم میں گھس گئی اور جان بوجھ کر دیر سے باہر نکلی تاکہ وہ سو جائے اس کے باہر نکلنے تک وہ باہر نکلی تو وہ آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ وہ یہی سمجھی کہ وہ سو گیا ہے وہ کمرے سے جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھ ہی رہی تھی کہ اس کی گرجدار آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

’’لک...... کمرے میں‘‘۔ وہ ڈر تو گئی تھی اس غیر متوقع گرجدار آواز پر ہکلا کر بولی۔

’’تو کیا یہ کچن ہے جو تم کمرے میں جا رہی ہو؟‘‘ وہ لیٹے لیٹے اسے دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں بولا۔

’’میں دوسرے کمرے میں جا رہی ہوں‘‘۔ اس نے مدھم آواز میں جواب

دیا۔

''کیوں، وہاں کون تمہارا انتظار کررہا ہے؟'' اس کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

وہ تپ گئی مگر بڑے ضبط سے بولی ''میں اکیلی علیحدہ کمرے میں سونے کی عادی ہوں''۔

''لیکن اب تمہیں اپنی عادت بدلنا ہوگی''۔ وہ بڑے رعب دار لہجے میں بولا ''یہاں آؤ، ادھر آ کر لیٹو''۔

''میں...... آپ کے ساتھ نہیں سوؤں گی''۔ اس نے آہستگی سے کہا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تو میں تمہارے ساتھ سو جاؤں گا مگر تم ادھر آؤ تو سہی''۔ اس نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ وہ شرم وحیا سے گلنار ہوگئی اور ناچار چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی بیڈ تک آ گئی۔

''اب لیٹ جاؤ آرام سے اور آج سے یہی تمہارا بیڈروم ہے''۔ اس نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا تو وہ ڈرتی ہوئی بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ ہلکے کاسنی شلوار قمیض میں دھلے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ اس کے دل میں اترتی چلی گئی۔ میک اپ میں بھی قیامت تھی اور اب سادگی میں بھی بلا کا حسن اور کشش لیے ہوئے تھے۔ وہ پورے استحقاق کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی نظروں سے نروس ہورہی تھی۔ اس کا ردم ردم اس کے اظہار کے لحوں کی تپش میں جھلس رہا تھا۔ آخر وہ خود ہی نظریں چرا کر ایک سائیڈ پر لیٹ گئی تو اس نے بھی لائٹ آف کردی۔ بہت دیر سے اُس کی آنکھ لگی تھی اور وہ اس کے جھنجھوڑے پر ہڑبڑا کر اٹھی تھی بلکہ چیخی تھی۔ نیند سے اسے کوئی جگا نہیں سکتا تھا۔

''کیا تکلیف ہے؟'' وہ آنکھیں بند کیے ہوئے چلائی۔

''اٹھو ابھی بتاتا ہوں، کیا تکلیف ہے؟'' اس کی گرجدار آواز پر اُس کے سوئے حواس مکمل طور پر بیدار ہوگئے اور ایک دم سے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ بیڈ

کے قریب کھڑا تھا۔ وہ اس کے خطرناک تیور دیکھ کر گھبرا گئی اور فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''بستر چھوڑ دو''۔ وہ غصے سے بولا تو اس نے بیزارکن لہجے میں پوچھا:

''کیوں، اب کیا ہوا ہے؟''

''فجر کی نماز کا وقت ہوا ہے۔ اٹھو اور وضو کر کے نماز ادا کرو''۔ اس نے بہت حاکمانہ اور سخت لہجے میں کہا کہ وہ بالوں کو ہیر بینڈ میں مقید کرتی ہوئی اسے دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولی: ''آپ نماز بھی پڑھتے ہیں؟''

''کیوں شک ہے کیا؟'' وہ اسی لہجے میں بولا ''الحمد میں پانچ وقت کی نماز باقاعدگی سے ادا کرتا ہوں''۔

''جھوٹے شخص کی نماز کب قبول ہوتی ہے؟'' وہ سے نیچے اتر آئی۔

''کون سا جھوٹ بولا ہے میں نے؟'' وہ اس کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہوگیا۔

''آپ نے پپا سے جھوٹ ہی بولا ہے۔ جو رویہ آپ نے میرے ساتھ رات بھر روا رکھا، وہ اس بات کا گواہ ہے کہ آپ پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا''۔

وہ سنجیدگی سے اس پر طنز کر کے جانے لگی تھی، اس نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچ لیا۔

''پیار بھرا رویہ اگر ہمارے لیے ناقابل اعتبار ہے تو تمہیں اب ساری زندگی اس رویے کو قبول کرنا ہوگا اور رہی بات جھوٹ بولنے کی تو میں نے تمہارے پپا سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ تم دو ماہ تک تو میری دسترس میں ہو نا تو دو ماہ تک میں جیسے چاہوں، تمہارے ساتھ رہ سکتا ہوں اور تمہیں بھی میری بیوی بن کر رہنا ہوگا''۔ وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے نہایت سنجیدہ اور سخت لہجے میں بولا تو وہ سہم کر رہ گئی۔

''لیکن ممی نے تو منع کیا تھا کہ میں عملاً اس رشتے کے تقاضے پورے نہیں کرسکتی''۔ اس نے نظریں جھکا کر سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تم سب کچھ کرو گی میری جان! بس ذرا دو چار دن گزار لیں اور اگر نہیں کرو گی تو بھی مجھے اپنا حق لینا آتا ہے۔ چلو اب وضو کر کے نماز ادا کرو''۔ اس نے

مسکراتے ہوئے پر یقین لہجے میں کہا اور اس کا بازو چھوڑ دیا۔

وہ واش روم میں چلی گئی۔ وضو کر کے نماز ادا کی۔ اس کے بعد جائے نماز پر بیٹھے بیٹھے سورۂ یٰسین کی تلاوت کرنے لگی۔ علی کمرے میں آیا تو اس کا یہ پاکیزہ اور مقدس روپ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا اور اسے دیکھنے لگا۔ اس کی آواز بے حد پرسوز اور دلنشین تھی۔ وہ تو محو ہو گیا۔ جب وہ تلاوت سے فارغ ہوئی اور جائے نماز تہہ لگا کر رکھ دی۔ واپس مڑی تو علی کو دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ وہ بہت محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاس آ کر بولا۔

''تمہیں سورۂ یٰسین زبانی یاد ہے۔ حیرت ہے تم اتنی عمدہ تلاوت کر لیتی ہو۔ کیا قرآن پاک حفظ کر رکھا ہے؟''

''نہیں'' چند سورتیں زبانی یاد ہیں، جو میں نماز کے بعد دہراتی رہتی ہوں، تاکہ بھول نہ جائیں''۔ اس نے نظریں جھکا کر مدھم آواز میں بتایا۔

''اتنے نیک کام کرنے کے بعد اب یہ ضرور سوچنا کہ میرا تم سے جو رشتہ بن چکا ہے، اس کے بھی کچھ تقاضے ہیں جو بہر حال تمہیں پورے کرنا ہوں گے۔ اپنے پیا کے حکم پر نہیں قرآن کے حکم پر عمل کرنا ہے تمہیں''۔ اس نے سنجیدگی سے کہا تو وہ اس کے چہرے کو دیکھ کر شش و پنج میں پڑ گئی۔

''کیا مصیبت ہے؟'' وہ منہ میں بڑبڑائی۔

''یہ مصیبت اس ساٹھ سالہ بڈھے سے لاکھ درجے حسین اور بہتر ہے۔ اسے محبت سمجھ کر دیکھو گی تو زندگی بہت خوبصورت لگنے لگے گی''۔ علی نے اسے چاہت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ سنجیدہ لہجے میں بولی:

''میری زندگی پہلے بھی بہت خوبصورت تھی، الجھن تو اب پیدا ہوئی ہے''۔

''تمہارے پیا کی ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ ہے یہ اب ایک مرد سے یہ توقع رکھنا کہ وہ عورت سے دور رہے گا، اپنی عورت سے، حوروں جیسا حسن رکھنے والی عورت سے دور رہے گا، نہایت بچگانہ سوچ ہے۔ پھر اگر تم یاسین بیگ کی بیٹی کی حیثیت سے

میرے ہاں رہنے کے لیے آتیں تو میں صبر کر سکتا تھا، جبر کر سکتا تھا اپنے جذبات پر لیکن ایسا نہیں ہے، تم میری بیوی کی حیثیت سے اس گھر میں آئی ہو تو بیوی بن کر ہی رہنا ہو گا۔'' علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن آپ کو اس سے کیا فائدہ ہو گا دو ماہ بعد تو......'' وہ بولتے بولتے رک گئی۔

''مشکل ہے بیوی، بہت مشکل ہے''۔ وہ اسے بیڈ پر بٹھاتے ہوئے بولا''۔ عورت اور حسن مرد کی کمزوری ہے اور حسن اگر عورت کا ہو تو پھر بچنا بہت ہی مشکل ہے۔ شکر ہے کہ میرا نکاح تم سے ہو گیا ورنہ میں تو مفت میں گناہ گار بن جاتا۔''

''مجھے نیند آ رہی ہے''۔ وہ نظریں جھکا کر بولی۔

''تو سو جاؤ، نیند تو مجھے بھی آ رہی ہے۔ رات بھر تمہاری حسین صورت آنکھوں میں رہی، سونے ہی نہیں دیا۔ اب کوشش کر لیتے ہیں سونے کی''۔ وہ شوخ و شریر نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا اور اپنی جگہ پر لیٹ گیا۔ وہ بھی سمٹ کر ایک طرف لیٹ گئی۔

''صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی کہ وہ علی کے بازو کے حلقے میں ہے۔ وہ اس کے اس قدر قریب تھی کہ اس کی دھڑکن کی آواز اسے اپنے دل کے ساتھ اکھڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا دل عجیب انداز میں دھڑکا۔ جسم میں کرنٹ سا دوڑنے لگا۔ وہ اس کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھنے لگی۔ وہ بہت معصوم اور بے ضرر لگ رہا تھا۔ غصہ، رعب، دبدبہ، حاکمانہ انداز تو اس کی شخصیت کا حصہ لگ ہی نہیں رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنا جسم ہی بے دھیانی اور بے خبری کے عالم میں اس کے سپرد نہیں کر بیٹھی بلکہ اس کا دل اور روح بھی علی کے دل اور روح سے جا ملے ہیں۔ وہ اس احساس سے مضطرب ہو کر اس کے بازو کے حلقے سے نکل گئی۔

''یہ قربت، یہ محبت، یہ حسین شخص کی رفاقت صرف دو ماہ کی مہمان ہے۔ پھر

بھلا خود کو کیوں اس کا عادی بنایا جائے؟ بعد میں لمحہ لمحہ روح کانٹوں پر سفر کرے، دل انگاروں پر لوٹے اور جسم اس کے لمس کی اس کے قرب کی نرمی اور گرمی کو ترسے''۔
اس نے بے بسی سے سوچا اور سوچتی کڑھتی کمرے سے باہر گئی۔

☆☆☆

''ہم ہنی مون کے لیے پرسوں مری جا رہے ہیں۔'' شام کے وقت علی نے نیا شوشہ چھوڑ دیا۔
''میں مری نہیں جاؤں گی''۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔ ادھر بچنا ہی مشکل ہو رہا ہے تو ادھر ہنی مون ٹرپ میں کہاں بچ پائے گی۔ وہ اس کی شوخیوں، شرارتوں اور گستاخیوں سے۔
''تو اور کہاں جاؤ گی؟''
''کہیں بھی نہیں''۔ وہ بالوں میں برش پھیرتے ہوئے بولی'' آپ سب کچھ جانتے ہوئے بھی''۔
''تم کیا سمجھتی ہو کہ میں یہ دو ماہ ضائع کر دوں گا اور اس کے بعد تمہیں آزاد کر دوں گا۔'' علی نے اس کے قریب آ کر بہت تیز اور بارعب لہجے میں کہا تو وہ نظریں جھکا کر آہستگی سے بولی:
''پپا سے آپ کی یہی ڈیل ہوئی تھی''۔
''یہ رشتے ہیں بی بی! ڈیل بزنس میں ہوتی ہے۔ تمہارے مما پپا تمہاری شادی اپنے دولت مند بھانجے سے کرنا چاہتے ہیں۔ کیا بہت خوبصورت ہے تمہارا کزن عاصم؟'' علی نے اس کے ہاتھ سے ہیر برش لے کر بہت کاٹ دار لہجے میں پوچھا مگر وہ خاموش رہی۔
''میں کچھ پوچھ رہا ہوں تم سے''۔ وہ سخت لہجے میں بولا۔
''مجھے کیا معلوم کیسا ہے عاصم؟'' عینی نے ایمانداری سے کہا۔ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ ہاں تصویروں کی حد تک سرسری سا دیکھا ہے اور مجھے اس میں کوئی

انٹرسٹ نہیں ہے''۔
''لیکن تمہارے مما پپا کو تو وہ بہت پسند ہے''۔ علی نجانے کیا کہلوانا چاہ رہا تھا اس سے۔
''ظاہر ہے ان کا بھانجا ہے عاصم''۔ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا، انہیں تو پسند ہوگا ہی''۔
''تمہارا بھی تو کزن ہے وہ''۔ علی نے برش میز پر رکھ دیا۔ نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔
''تو آپ کیا چاہتے ہیں کہ میں ساری دنیا میں اعلان کراؤں کہ مسٹر عاصم میرے کزن ہیں۔'' وہ پہلی بار اتنے غصیلے لہجے میں بولی تھی۔ علی مسکراتے ہوئے بولا:
''میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم اس میں کس حد تک انوالو ہو؟''
''کتنے شکی مزاج اور تنگ ذہن ہوتے ہیں آپ مرد۔ جب میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ عاصم سے میں کبھی نہیں ملی اور نہ ہی مجھے اس میں کوئی انٹرسٹ ہے تو پھر آپ بار بار یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہیں؟ شاید آپ کو میرے کردار پر شبہ ہے۔ مسٹر علی، نفرت ہے مجھے آپ سے اور ان سب مردوں سے جن میں شک کرنے کی عادت ہے۔ میں اگر کہیں انوالو ہوتی تو آپ سے کسی صورت بھی شادی نہ کرتی۔ ایسی ہی مجبوری ہوتی تو اپنی پسند کے آدمی سے شادی کر لیتی یا ملک سے باہر چلی جاتی یا کم از کم آپ سے شادی کے بعد اپنی پرانی پسند کو فراموش کر دیتی۔ لیکن میرے دل پر کسی کا عکس نہیں پڑا۔ میری روح، میرا جسم، پاک صاف ہے۔ ان چھوٹی کلی آپ کے دامن میں آ گری ہے اور آپ خود اپنی باتوں سے، اپنے ہاتھوں سے اسے مسل دینا چاہتے ہیں۔ آئی ہیٹ یو مسٹر علی، آئی ہیٹ یو''۔ وہ غصے سے بولتی چلی گئی اور آخر میں دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
علی کا دل تڑپنے لگا۔ وہ تو مذاق کر رہا تھا۔ اس کے دل کا حال جاننا چاہتا تھا

کہ وہ اس کے بارے میں اس رشتے کے بارے میں کیا سوچ رہی ہے لیکن وار الٹا ہو گیا تھا۔ وہ خود ہی شرمندہ ہو گیا اور اسے شانوں سے تھام کر اپنے اندر سمیٹتے ہوئے ندامت آمیز لہجے میں بولا:

''آئی ایم سوری عینی۔ میں تم پر تمہارے کردار پر شک نہیں کر رہا تھا۔ میں تو صرف اپنے حصے کی محبت تمہارے اندر تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عینی میں محبت اور اپنائیت کا ترسا ہوا شخص ہوں۔ تمہیں پا کر مجھے ان جذبوں کا شدت سے احساس ہوا ہے اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں نے آج تک جو محبتیں جمع کر کر کے رکھی ہوئی تھیں، وہ سب میں تم پر نچھاور کر دوں اور تمہاری محبت سے اپنا دامن بھر لوں۔ میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔''

''آپ کا مقصد بھی نہیں ہے جو آپ کہہ رہے ہیں''۔ وہ اس کے بازوؤں کے حصار سے نکلتے ہوئے بھیگتے لہجے میں بولی تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا:

''اب ایسا تو نہ کہو، اس پر تو میرا پورا اور جائز حق ہے''۔

''تو آپ پپا سے صاف بات کریں۔ میں اس طرح تو آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ پپا نے بھی غلطی کی ہے۔ صرف نکاح کر دیتے۔ رخصتی ضرور کرنی تھی۔'' وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بھیگی آواز میں بولی۔

''اس میں بھی کوئی بہتری ہو گی۔'' وہ شوخی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''آپ کی ہو گی...... میری کیا بہتری ہو سکتی ہے؟'' وہ چڑ کر بولی۔

''ارے ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچو شاید تمہیں اپنے لیے بھی بہتری ہی بہتری نظر آئے''۔

''مجھے گھر جانا ہے''۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''تو یہ کیا دفتر ہے''۔ وہ مسکرایا۔

''میں پپا کے گھر جانا چاہتی ہوں۔''

''دو مہینے بعد جانا، میں خود لے کر جاؤں گا، ابھی تو تم میرے لیے اچھی سی کافی

بنا کر لاؤ''۔ وہ مسکراتے ہوئے بڑے آرام و اطمینان سے بولا۔

''کیا؟'' وہ غصیلے اور طنزیہ لہجے میں بولی۔

''میں کافی بناؤں اور وہ بھی تمہارے لیے ہونہہ''۔

''میں بدتمیزی برداشت نہیں کرتا۔ بہت نرمی برت رہا ہوں تمہارے ساتھ۔ جاؤ جا کر کافی بنا کر لاؤ ورنہ......'' وہ غصیلے لہجے میں بولتا ہوا جملہ ادھورا چھوڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

وہ بھی غصیلے لہجے میں بولی ''ورنہ کیا؟ تم میرے پپا کے ملازم ہو اور ملازم کبھی مالک نہیں بن سکتا۔ ہونہہ۔ بڑے آئے مجھ پر حکم چلانے والے۔ میں کوئی تمہاری زر خرید لونڈی نہیں ہوں کہ تمہاری خدمت کرتی پھروں۔ میں نے کبھی کچن میں قدم نہیں رکھا۔ خود سے اٹھ کر پانی تک نہیں پیا اور تم مجھ سے کافی بنواؤ گے۔ میری ملازمہ میرے ساتھ آئی ہے، بہت ہی طلب ہو رہی ہے کافی پینے کی تو اس سے کہہ دو، وہ بنا دے گی۔ تنخواہ کی فکر مت کرنا۔ اسے تنخواہ بھی میرے پپا دیں گے۔ تم جیسے کنگلے شخص کے پاس ایک ملازمہ کو تنخواہ دینے کی رقم کہاں جمع ہو گی۔ پپا نے بھی نجانے کیا دیکھ کر ایک پینڈو اور موٹر مکینک سے میری شادی کر دی''۔

''شٹ اپ، جسٹ شٹ اپ۔'' علی کی قوت جواب دے گئی تو اس نے چیخ کر کہا اور اپنا بھاری مضبوط ہاتھ اس کے رخسار پر اس قوت اور شدت سے مارا کہ وہ نیچے کارپٹ پر بہت دور جا گری۔ علی کی انگلیوں کے نشان اس کے سفید چہرے پر سرخ لائنوں کی طرح پست ہو گئے۔ وہ بری طرح سسک اٹھی۔

وہ غصے سے لال چہرہ لیے آنکھوں سے انگارے برساتا اس کی طرف بڑھا اور مضبوطی سے اس کا بازو پکڑ کر جھٹکا دے کر اسے اٹھایا۔ اس کی انگلیاں ہڈیوں میں چبھ رہی تھیں، وہ رو رہی تھی۔ چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ آج تک اسے کسی نے ڈانٹا تک نہیں تھا، مارنا تو دور کی بات تھی۔ اور علی نے تو انتہا کر دی تھی۔ اس پر اپنا مضبوط ہاتھ اٹھایا تھا۔ وہ ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح لڑکھڑا کر گری تھی۔ گرنے کی

چوٹ الگ تھی۔ وہ دور سے تڑپ اٹھی تھی۔ طبیعت ایک ہی تھپڑ میں صاف ہوگئی تھی۔ وہ اس سے بری طرح خوفزدہ ہوگئی تھی۔

''دوبارہ اگر تم نے اس قسم کی بدتمیزی کی اور بدزبانی کی تو میں زبان کاٹ دوں گا تمہاری۔ میں کوئی بھیک مانگنے نہیں گیا تھا تمہارے پپا کے پاس۔ انہوں نے خود مجھے تمہاری ذمہ داری سونپنے کا فیصلہ کیا تھا اور میں نے ان کی مجبوری اور پریشانی کو سمجھتے ہوئے ان کا یہ فیصلہ قبول کیا تھا۔ میں اپنی محنت اور قابلیت سے کماتا ہوں۔ تمہارے پپا مفت کی تنخواہ میری ہتھیلی پر نہیں سجا دیتے۔ میں نے اپنی محنت سے یہ مقام حاصل کیا ہے اور بہت ہے یہ سب میرے لیے، بہت امیر ہوں میں تمہارے پپا سے۔ تمہاری ملازمہ کی تنخواہ بھی دے سکتا ہوں، لیکن نہیں ...... اب میں تمہیں اس گستاخی اور بدتمیزی کی سزا ضرور دوں گا۔ کچن کا سارا کام تمہیں کرنا ہوگا سمجھیں۔'' اس نے اس کے روتے، تکلیف دہ چہرے کو دیکھتے ہوئے غصیلے، حاکمانہ اور سخت لہجے میں کہا۔

''مم...... جج...... کچھ کرنا...... نہیں آتا''۔ وہ ہچکیاں لے لے کر روتے ہوئے بولی۔

''کچھ کرنا چاہو گی تو کرنا بھی آجائے گا۔ یہاں تمہارے پپا کے ملازموں کی فوج نہیں ہے کہ تمہارے کام کردیا کرے گی۔'' وہ غصے اور طنز سے بولا۔ اسے زور سے بیڈ پر پٹخ دیا۔ اس کی چیخ نکل گئی اور بستر پر اوندھے منہ لیٹی وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ وہ غصے سے اسے دیکھتا کمرے سے باہر نکل گیا اور نسرین کو آواز دی۔

''نسرین ادھر آؤ''۔

''جی صاحب''۔ وہ کچن سے دوڑی چلی آئی۔

''کتنی تنخواہ دیتے ہیں تمہارے صاحب تمہیں؟'' اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔ وہ اسے اپنی اور عینی کی جھڑپ کی بھنک بھی نہیں پڑنے دینا چاہتا تھا۔

''جی وہ ہزار روپے اور روٹی، کپڑا بھی دیتے ہیں۔'' نسرین نے بتایا۔

''اس مہینے سے تنخواہ مجھ سے لینا۔ یہ سب تمہیں یہاں بھی ملے گا۔'' اس سپاٹ لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے صاحب جی!'' وہ جانے کے لیے مڑی۔ ''سنو!'' اس نے پکارا۔

''جی صاحب جی''۔ وہ واپس پلٹی اور اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''اپنی بی بی صاحبہ کو بھی کچن کا کام سکھا دو۔ انہیں بھی کچھ گھرداری آنی چاہیے''۔

''لیکن صاحب جی! عینی بی بی تو کبھی کچن میں گئی ہی نہیں، انہیں تو چائے پکانی بھی نہیں آتی''۔ اس نے حیران ہوکر اسے دیکھتے ہوئے بتایا۔

''اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ جب تم کام کیا کرو تو عینی بی بی کو بھی اپنے ساتھ لگا لیا کرو تاکہ انہیں بھی کچھ پکانا آجائے۔'' علی نے اس سنجیدگی سے کہا۔

''ٹھیک ہے صاحب جی''۔ نسرین نے کہا اور کچن میں چلی گئی اور وہ بالکونی میں آ کھڑا ہوا۔ غصے سے اس کا پورا وجود جل رہا تھا۔ کافی دیر وہ وہاں کھڑا رہا۔ پھر واپس نیچے آ کر ٹھنڈے پانی کا گلاس پینے کے بعد لاؤنج میں ٹی وی آن کر کے بیٹھ گیا۔ ٹی وی پر کوئی ڈرامہ آ رہا تھا۔ وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ نظریں ٹی وی پر مرکوز تھیں اور دھیان کہیں اور اٹکا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو دیکھا جو عینی کے نرم، ملائم دودھیا گال پر تباہی مچا چکا تھا۔ اپنے ہاتھ میں اسے عینی کے گال کی نرمی اور ملائمت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے مٹھی بند کرلی۔ ایک آگ سی تھی جو اس کی مٹھی میں بند ہوگئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آرام دہ حالت میں آ رہا تھا۔ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ عینی کا روتا چہرہ اس کی آنکھوں میں آ سمایا۔ کتنی دیر تک وہ پریشانی کے عالم میں اپنے ہاتھ کو دیکھتا رہا۔ اس کے کانوں میں عینی کی سسکیوں اور ہچکیوں کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ بے چین ہونے لگا۔ عینی ابھی تک کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ عشاء کی نماز پڑھ کر وہ تقریباً تین گھنٹے بعد بیڈ روم میں گیا تو اسے

اوندھے منہ لیٹا پایا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ وہ جس پوزیشن میں اسے چھوڑ کر گیا تھا، تین گھنٹے بعد بھی وہ اسی پوزیشن میں لیٹی ہوئی تھی۔ شاید سو رہی تھی۔ وہ سمجھ نہ سکا۔

''کہیں گزر تو نہیں گئی یہ نازک مگر ظالم لڑکی!'' اس نے سوچا اور بیڈ پر بیٹھ کر اسے شانوں سے پکڑ کر سیدھا کیا تو وہ اس کے چہرے پر اپنی انگلیوں کے نشان دیکھ کر کچھ نادم ہوا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا گردن پسینے میں تر تھی۔ اس نے آہستہ سے اس کے دوپٹے سے اس کا چہرہ اور گردن صاف کی۔ وہ بے سدھ سو رہی تھی۔ وہ بے اختیار ہو کر محبت سے اس پر جھک گیا۔ اس کے اس رخسار پر نرمی سے اپنا ہاتھ پھیرا جس پر اس کی انگلیوں کے نشان ثبت تھے۔ عینی نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں تو اسے خود پر جھکا پا کر ڈر کر چیخ اٹھی۔ اس کا یہ ردعمل اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھا کہ وہ خود بھی ڈر گیا اور سمجھ گیا کہ وہ اتنی خوفزدہ کیوں ہو رہی ہے اس سے؟

''اٹھو اور منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو جاؤ، ہم ڈنر باہر کریں گے''۔ وہ سنبھل کر نرمی سے بولا۔

''آپ اکیلے...... چلے...... جائیں، مجھے بھوک نہیں ہے''۔ وہ اس کے خوف اور قربت سے نروس ہوتے ہوئے بولی۔

اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا ''کیوں بھوک نہیں ہے؟''

''اچھی خاصی ہیوی خوراک تو دے چکے ہیں آپ''۔ وہ ذومعنی انداز میں بولی۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ وہ اس کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا تھا، مسکرا دیا اور اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر نرمی سے بولا:

''میں تم پر کبھی ہاتھ نہ اٹھاتا لیکن تم نے جو کچھ کہا تھا، وہ میری برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ اس انسلٹ پر یہی کرتا جو میں نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔ مجھے غصہ آ گیا تھا اور اس وقت تم بھی غصے میں ہو جب تمہارا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو تمہیں احساس ہو گا کہ غلطی واقعی تمہاری تھی۔ اب اٹھو، جانے کے لیے تیار ہو جاؤ''۔

''میں کوئی بچی تو نہیں ہوں کہ جسے پہلے مار پیٹ کر پھینک دیا جائے اور بعد میں لالی پاپ دے کر منانے کی کوشش کی جائے۔ میں ایک بالغ اور باشعور لڑکی ہوں مسٹر علی''۔ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر روئی روئی آواز میں بولی۔

''تو کیسے مانے گی یہ بالغ اور باشعور لڑکی!''

''آپ کو کیا فرق پڑتا ہے میرے ماننے یا نہ ماننے سے''۔ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''بہت فرق پڑتا ہے میری جان!'' اس نے جھک کر اس کے رخسار پر ثبت اپنی انگلیوں کے نشانات پر اپنی محبت کے نرم گرم گلاب کھلا دیئے۔ وہ سلگتا چہرہ لیے حیرت اور حیات اسے تکنے لگی تو وہ مسکراتے ہوئے شرارت بھرے لہجے میں بولا'' اب تو اس بالغ اور باشعور لڑکی کا غصہ، ختم ہو جانا چاہیے''۔

''پرے ہٹئے''۔ وہ سٹپٹا کر بولی۔

''پہلے غصہ اور ناراضگی کو ختم کرو؟'' وہ ڈٹا رہا۔

وہ شرم سے بے حال ہو گئی۔ جب اپنا دوپٹہ گردن میں موجود نہ پایا۔ دائیں جانب دیکھا، دوپٹہ رکھا ہوا تھا۔ اس نے فوراً دوپٹہ اٹھا کر اپنے شانوں سے سینے تک پھیلا لیا۔ وہ سخت ترین حجاب آمیز الجھن کا شکار ہو رہی تھی اور وہ اس کی حالت اور کیفیت سے خوب محظوظ ہو رہا تھا۔ شرارت آمیز لہجے میں بولا:

''کیا کچھ چھپاؤ گی مجھ سے اور کب تک چھپاؤ گی، ہوں؟''

''علی پلیز...... آپ کو اپنی بات کا پاس رکھنا چاہیے۔ مجھے ممی، پپا کے سامنے کتنی شرمندگی ہو گی۔ آپ کیوں میرے قریب آتے ہیں''۔ وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''تمہارا اور میرا رشتہ ہی ایسا ہے''۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھا تو وہ بھی فوراً ہی اٹھ کر سمٹ کر بیٹھ گئی اور بے بسی سے بولی: ''لیکن یہ رشتہ عارضی ہے، آپ کیوں نہیں سمجھتے؟''

''میں ہر رشتہ پوری دیانتداری سے نبھانے کا قائل ہوں خواہ وہ مستقل ہو یا

عارضی اور تمہارا میرا رشتہ مستقل ہے۔ کم از کم میرے جیتے جی تم کسی عاصم کی نہیں ہوسکتیں۔ یہ بات تم خود بھی سمجھ لو اور اپنے پپا کو بھی سمجھا دو اور میں ایک ہفتے کی چھٹی لے کر تمہیں اپنے ساتھ مری لے جاؤں گا بتا دینا اپنے پپا کو کہ تم ہنی مون منانے جا رہی ہو۔'' اس نے نہایت وراثت اور بارعب لہجے میں کہا۔

''میں نہیں جاؤں گی ہنی مون منانے ...... ممی پپا ڈانٹیں گے''۔ وہ سہمی ہوئی بولی۔

''اور میں تمہیں مار دوں گا۔'' وہ سخت اور دھمکی آمیز لہجے میں بولا تو وہ مزید خوفزدہ ہوگئی۔ وہ اسے خود سے یوں ڈرتا دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس نے دو ایک بار اسے کمپنی کے ملازمین کو خوب ہدایات جاری کرتے سنا تھا۔ خاصے رعب سے بات کرتی تھی وہ لیکن وہ اس ایک مرد سے کتنی ڈری اور سہمی ہوئی تھی۔ وہ اس کی حالت پر مسکرائے گیا لیکن چہرہ دوسری جانب کر لیا تا کہ اسے اپنی ہتک محسوس نہ ہو اور وہ مزید خوفزدہ اور دلبرداشتہ نہ ہو جائے اس سے۔

''تو مار دیں، ایک بار ہی کیوں نہیں مار دیتے؟'' وہ پرنم لہجے میں چیخی۔

''چلاؤ مت ورنہ دوسری خوراک بھی دے دوں گا''۔ ویسے بھی دو ماہ ہیں میرے پاس۔ ایک بار ہی مار کر کیا کروں گا۔ اب سیدھی طرح تیار ہو کر باہر آجاؤ''۔ وہ غصیلے اور حاکمانہ لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے چلا گیا۔ وہ بھی آنسو صاف کرتی اٹھ گئی۔

☆☆☆

صبح فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد علی نے اسے سوتا پایا تو جگانے کے لیے قریب چلا آیا۔ اس کا روشن اور دلکش چہرہ اسے بہت مقدس، پاکیزہ اور معصوم دکھائی دے رہا تھا۔ سوئی ہوئی عورت اتنی حسین بھی لگ سکتی ہے، وہ حیران تھا۔ اس کا سفید گلابوں جیسا دھلا نکھرا رنگ، گھنیری چمکدار پلکیں، چمکتا چہرہ، خوبصورت آنکھوں پر گھنیری پلکوں کی جھالر پڑی تھی۔ وہ یاقوتی ہونٹ، اف ...... وہ دنگ رہ گیا۔ آج

پہلی بار وہ اسے اتنے غور سے، اتنی وضاحت سے دیکھ رہا تھا اور حیران ہونے کے ساتھ ساتھ خوش بھی ہو رہا تھا کہ وہ اس کی ہے اپنی تمام تر خوبصورتی، حسن و دلکشی سمیت وہ اس کی ہے اپنی تمام تر خوبصورتی، حسن و دلکشی سمیت وہ اس کی جائز ملکیت ہے۔ اس کے ہونٹوں کی تراش ایسی تھی کہ وہ بے اختیار انہیں چھونے کی خواہش کر بیٹھا لیکن کسی خیال سے اپنی خواہش کو جھٹک دیا اور جھک کر اس کا گال تھپتھپایا۔ عینی نے سوتے میں ہی بڑبڑانا شروع کر دیا۔

''کیا مصیبت ہے، سونے دو''۔

''مصیبت کی بچی اٹھو۔ ویسے کیا کم مصیبت نازل کی ہے تم نے میرے دل و دماغ پر اٹھو فوراً وہ اتنے غصیلے لہجے میں بولا کہ وہ ڈر کر فوراً ہی اٹھ بیٹھی، علی کو سامنے کھڑا دیکھا تو اسے یاد آیا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ اسی کو گھور رہا تھا۔ اس کے دیکھنے پر رعب دار لہجے میں بولا:

''یہ تمہارے پپا کا گھر نہیں ہے اور نہ ہی میں تمہارا ملازم ہوں کہ تمہارے یہ نازنخرے برداشت کرلوں گا۔ یہ میرا گھر ہے اور یہاں میرا قانون چلتا ہے''۔

''تو اس وقت آپ کا قانون کیا کہتا ہے میرے بارے میں؟'' وہ سلگ کر بولی۔

''میں تمہارا شوہر ہوں اور تم پر حکم چلا سکتا ہوں''۔

''حکم کیا'' آپ تو بہت کچھ چلا سکتے ہیں''۔ وہ طنز سے بولی ''خنجر، تیر، تلوار، گولی، ہاتھ، زبان سب کچھ''۔

''میں صبح صبح تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا اٹھو وضو کر کے نماز ادا کرو اور ہاں یہ روز کی ڈیوٹی میرے ذمے ہی نہیں ہونی چاہیے۔ جگانے والی۔ کل سے تم مجھے نماز کے لیے جگاؤ گی۔ سمجھ گئیں۔'' وہ حاکمانہ لہجے میں بولا۔

''آپ خود سے جاگ تو جاتے ہیں''۔ اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''بحث نہیں چاہیے مجھے جو کہا ہے وہ کل سے ہوتا دیکھنا چاہتا ہوں میں''۔

وہ اپنی بات مکمل کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہاتھ میں پانی لیے دروازے سے داخل ہوا تو وہ اسی طرح بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور اپنا دایاں بازو، کندھا اور کان آہستہ آہستہ سہلا رہی تھی۔ بایاں حصہ تو علی کے تھپڑ کی زد میں آیا تھا اور دایاں حصہ سارے جسم کا بوجھ ایک دم سے گرنے سے زد میں آ گیا تھا۔ اس وقت تو اسے اتنا درد نہیں ہوا تھا، مگر اب اچھا خاصا درد ہو رہا تھا اور بائیں بازو میں بھی ہاتھ لگانے سے دکھن محسوس ہو رہی تھی۔ اُسے علی نے سختی سے پکڑ کر کھینچا تھا۔ گال الگ سوج رہا تھا۔ آنکھیں روتے رہنے سے سرخ اور سوجی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے جبڑے میں بھی درد ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنا گال سہلاتی رہی۔ پھر اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ علی چونکہ دروازے میں کھڑا یہ کارروائی دیکھ رہا تھا اس لیے وہ اسے دیکھ ہی نہ سکی تھی اور وہ اپنے اس رویے پر شرمندہ ہو رہا تھا جس کی وجہ سے وہ تکلیف سہہ رہی تھی۔ وہ پانی کا گلاس میز پر رکھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ ناشتے کے وقت بھی وہ موجود نہ تھا۔ اس نے آرام سے آرام سے دائیں جانب سے سلائس کھایا اور جوس پی کر اٹھ گئی۔ نہا کر کپڑے تبدیل کر لیے۔ بال سنوار رہی تھی کہ نسرین نے یاسین بیگ اور مسز یاسین بیگ کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ جلدی جلدی بالوں میں برش کر کے لاؤنج میں آ گئی۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے سب سے پہلے اس کے چہرے کو تشویش بھری نظروں سے دیکھا۔

''عینی بیٹا تمہارا گال، تمہاری آنکھیں سرخ کیوں ہیں، کیا ہوا ہے کیا علی سے کوئی جھگڑا ہوا ہے؟'' مسز یاسین بیگ نے اس کی تھوڑی پکڑ کر چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں مما علی سے بات ہی کہاں ہوتی ہے جو جھگڑا ہو''۔ وہ علی کو آتا دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ اسی وقت علی لاؤنج میں داخل ہوا۔ وہ اس کی بات سن چکا تھا۔

''السلام علیکم''۔

''وعلیکم السلام! آؤ علی میاں کہاں تھے تم؟'' یاسین بیگ نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

''بس جی یونہی نماز کے بعد باہر نکل گیا تھا۔ وقت گزرنے کا خیال ہی نہیں رہا''۔ وہ ان کے برابر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ نظریں عینی کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

''بیٹا علی، تم نے عینی سے کچھ کہا ہے کیا؟'' مسز یاسین نے پوچھا۔

''آنٹی آپ کی بیٹی آپ کے پاس بیٹھی ہے۔ آپ خود اس سے پوچھ لیں میں نے اسے کچھ کہا ہے یا نہیں''۔ علی نے عینی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''عینی بیٹا، بتاؤ نا کیا ہوا ہے؟ تمہارا چہرہ مرجھایا مرجھایا لگ رہا ہے''۔

مسز یاسین نے اسے ممتا بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی:

''مما دراصل کل شام میں واش روم میں پھسل گئی تھی، بہت چوٹ لگی تھی۔ رو رو کر میں نے علی کو بھی پریشان کر دیا تھا''۔ اس نے بڑی خوبصورتی سے کہانی گھڑی تھی۔ علی حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں شرمندہ بھی ہو رہا تھا۔

''تو بیٹا جان! ہمیں فون کر دیا ہوتا، ہم آ جاتے''۔ یاسین بیگ نے شفقت جاری سے سرشار لہجے میں کہا تو وہ ہنس کر بولی۔

''پپا جانی! آپ کو ڈاکٹر تھوڑی ہیں جو میں آپ کو فون کر کے زحمت دیتی۔ چوٹ لگنے پر تو ڈاکٹر کو کال کیا جاتا ہے نا تو علی نے فوراً ڈاکٹر کو فون کر کے بلوا لیا تھا۔ اور اب بھی یہ ڈاکٹر کو ہی چھوڑنے گئے تھے۔ آپ کو اس لیے نہیں بتا رہے تھے کہ آپ پریشان نہ ہو جائیں لیکن میرے چہرے پر میری تکلیف نمایاں تھی۔ جو آپ دونوں نے محسوس کر لی اور مجھے مجبوراً آپ کو اصل بات بتانا پڑی۔ بس اتنی سی بات تھی۔ اب تو کافی بہتر ہوں میں''۔

''جانے کیوں میں آپ کی برائی، آپ کی اصلیت انہیں نہیں بتانا چاہتی''۔

اس نے دل میں علی سے کہا۔

''اوہو بیٹا ایسا کرو کہ تم ہمارے ساتھ گھر چلو۔'' مسز یاسین بیگ نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا تو اس نے بے اختیار علی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ اسے ایک دم سے اداس اداس دکھائی دینے لگا یا شاید اس کا وہم تھا۔ وہ خود اسے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے بہانہ سوچنے لگی اور پھر مسز یاسین بیگ کے شانے پر اپنا سر رکھ کر لاڈ سے بولی:

''نہیں مما! میرا کہیں بھی جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ میں ادھر ہی آرام کروں گی''۔

''اوکے بیٹا! جیسے تمہاری مرضی۔'' مسز یاسین نے اسے تھپک کر کہا تو وہ مطمئن ہو کر مسکرا دی۔

''تو ہم چلتے ہیں اب۔ علی تم عینی کا خیال رکھنا، یہ ہماری نازوں پلی بیٹی ہے۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے دینا''۔ یاسین بیگ نے کھڑے ہو کر کہا تو وہ بھی کھڑا ہو گیا اور مسکراتے ہوئے بولا ''آپ بے فکر رہیے سر! یہ میری ذمے داری ہی نہیں میری بیوی بھی ہیں''۔

''لیکن صرف دو ماہ کے لیے''۔ یاسین بیگ نے یاد دلایا۔

''جی، دو ماہ کے لیے''۔ وہ مسکرا کر بولا۔

وہ دونوں وہاں سے چلے گئے تو عینی بیڈ روم میں گئی اور وہ لاؤنج میں ٹہلنے لگا۔ عینی کا یہ رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ ''اتنی ناز و نعم میں پلی بڑھی لڑکی! آرام و آسائش اور محبتوں سے بھرپور ماحول میں رہنے والی نازک مزاج اور پھولوں جیسے وجود کی مالک عینی علی...... جسے کبھی کسی نے ڈانٹا تک نہیں تھا جس کے بدن پر کسی نے ہلکی سی خراش تک نہیں آنے دی تھی۔ اتنی بڑی تکلیف اتنی آسانی سے اپنے کھاتے میں لکھوا گئی۔ عینی تم نے اتنی بڑی بات کیسے ہضم کر لی۔ تمہیں تو میرے تھپڑ کے بعد اس گھر سے چلے جانا چاہیے تھا۔ اپنے مما پاپا کو سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا۔ آخر تم یہ

بات کیوں پی گئیں؟''

وہ حیرت سے سوچ رہا تھا اور اس کا ممنون بھی ہو رہا تھا کہ اس نے اسے یاسین بیگ اور مسز یاسین بیگ کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچا لیا تھا۔ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ وہ یہ جاننے کے لیے اس کے پاس بیڈ روم میں ہی چلا آیا۔ وہ رسالہ پڑھ رہی تھی اس نے پوچھا ''تم نے اپنے مما پپا کو اصل بات کیوں نہیں بتائی؟''

''کون سی اصل بات؟'' وہ رسالہ دیکھتے ہوئے انجانے پن سے بولی۔

''یہی کہ تمہیں چوٹ میرے تشدد کرنے سے لگی تھی۔ کیوں نہیں بتایا تم نے انہیں؟''

''میرے پپا نے آپ کو میرے لیے بہت اعتماد اور اعتبار کے ساتھ منتخب کیا تھا۔ بہت تعریف کی تھی انہوں نے آپ کی اور میں انہیں آپ کی اس کارروائی کی تفصیل بتا کر شرمندہ اور پریشان نہیں کر سکتی تھی۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں بتایا۔

''تم نے تو مجھے بھی شرمندہ ہونے سے بچا لیا ہے۔ تھینک یو عینی۔'' وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا تو وہ ایک دم تیزی سے دور ہٹ گئی۔ وہ ہنس پڑا اور پھر بولا:

''تم جتنا مجھ سے دور بھاگو گی میں اتنا ہی تمہارے قریب آ جاؤں۔ اتنا قریب کہ خود تمہارے لیے مجھ سے علیحدگی اختیار کرنا ناممکن ہو جائے گا''۔

''تو آپ جان بوجھ کر مجھے تنگ کر رہے ہیں''۔ وہ حیا سے تپ کر بولی۔

''تم اسے تنگ کرنا سمجھتی ہو تو یونہی سہی۔ لیکن تم میری بیوی ہو۔ یہ بات تم اپنے ذہن میں رکھنا اور بتا دینا اپنے پپا کو بھی''۔ وہ پھر سے بارعب لہجے میں بولا۔

''پلیز علی رحم کریں مجھ پر''۔ وہ رسالہ ایک طرف رکھ کر بے بسی سے بولی۔

''رحم ہی تو کر رہا ہوں تم پر''۔ وہ وارفتگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا ''اگر اس سارے معاملے میں تمہارے پپا کی مرضی شامل نہ ہوتی تو تم اس طرح مجھ سے کتراتیں اور نہ ہی میں تمہاری محبت اور قربت کے لیے ترستا''۔

''تو انکار کر دیا ہوتا پپا کو''۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''مجھے کیوں الجھن میں

مبتلا کر دیا ہے''۔

''تمہیں دیکھے بغیر بہت نیک نیتی سے تمہیں اپنانے کا اقرار کر لیا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ خدا نے مجھے اتنا حسین تحفہ اس کے بدلے میں دینا تھا۔ جبھی تو میرا دل بے ایمان ہو گیا۔ اب انکار اور فرار ناممکن ہے۔ یہ رشتہ ہے کوئی نوکری نہیں ہے کہ دو ماہ کی مدت کے بعد ختم کر دی جائے۔ میرا ارادہ تمہیں ہمیشہ کے لیے زاہد قریشی اور اس جیسے دوسرے لوگوں سے بچا کر اور چھپا کر رکھنے کا ہے''۔

''آپ پپا کو نہیں جانتے وہ بہت بری طرح پیش آئیں گے آپ سے''۔ اس نے اسے ڈرانے کی کوشش کی تو وہ ہنس کر بولا:

''اور پھر میں تمہارے ساتھ بہت بری طرح پیش آؤں گا''۔

''بزدل، عام مردوں جیسے گھٹیا ارادے، ہونہہ''۔ وہ بڑبڑائی، وہ سن رہا تھا مگر اس بار غصے میں نہیں آیا بلکہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

☆☆☆

''ہاں تو یاسین بیگ! پھر کیا سوچا تم نے آج اتوار ہے؟'' زاہد قریشی اپنے پروپوزل کے جواب کے لیے ان کے روبرو ان کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔

''زاہد صاحب! میں نے آپ کو اس روز بھی بتایا تھا کہ ایسا ناممکن ہے۔ آپ کوئی اور کام بتایئے''۔ یاسین بیگ نے سنجیدگی سے کہا۔ مسز یاسین بیگ بھی ان کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھیں اور دل ہی دل میں زاہد قریشی کو کوس رہی تھیں۔

''کوئی اور کام نہیں یاسین بیگ! صرف یہی کام۔ آخر تمہاری بیٹی ہے عینی اور تمہیں اس کی زندگی کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ پھر یہ کیسے ناممکن ہے؟'' زاہد قریشی نے سنجیدگی سے کہا۔

''یہ اس لیے ناممکن ہے کہ عینی کی شادی ہو چکی ہے''۔

''واٹ؟'' زاہد قریشی کے سر پر جیسے بم پھٹا تھا۔ بری طرح اچھل کر بولا ''لیکن وہ شادی شدہ تو نہیں لگتی''۔

''آپ بھی تو شادی کی عمر کے نہیں لگتے''۔ مسز یاسین بیگ نے طنز سے کہا۔

''مرد کے لیے شادی اور عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی'' وہ بجائے شرمندہ ہونے کے بڑی ڈھٹائی سے بولا۔

''ٹھیک ہے لیکن ہماری بیٹی کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ اپنے گھر میں ہے۔ اس روز وہ یہاں رہنے کے لیے آئی ہوئی تھی اور آپ کی خواہش جان کر فوراً ہی واپس چلی گئی تھی''۔ مسز یاسین بیگ نے سنجیدگی سے بتایا۔

''میں نہیں مانتا''۔ اور غصے سے بولا ''کیا ثبوت ہے تم اپنی بیٹی کی شادی کر چکے ہو؟''

''ثبوت کے لیے آپ اس کے گھر اس کے شوہر سے مل کر یا نکاح نامہ دیکھ کر اپنی تسلی کر سکتے ہیں اور اگر آپ کہیں تو ہم آپ کو اس کی شادی کی تصاویر کا البم بھی دکھا سکتے ہیں۔'' یاسین بیگ نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

''دکھاؤ کہاں ہے البم؟''

''میں لے کر آتی ہوں'' مسز یاسین بیگ اٹھ کر بیڈ روم میں چلی گئیں تو زاہد قریشی غصے اور شکست و شرمندگی کے عالم میں ڈرائنگ روم میں ٹہلنے لگا۔

''یہ لیجیے، غور سے دیکھ لیں یہ عینی اور اس کے شوہر کی شادی کی تصاویر ہیں''۔

''مسز یاسین بیگ نے البم کھول کر اس کے سامنے کر دی وہ جوں جوں تصاویر دیکھتا گیا، شکست کے احساس سے اس کا چہرہ سرخ ہوتا گیا۔ عینی کی علی کے ساتھ شادی کی تصاویر کے علاوہ اور بھی تصاویر تھیں۔ وہ تصاویر جو انہوں نے یاسین بیگ کے کہنے پر دو دن پہلے خصوصی پوز بنوا کر ان کے اور اپنے گھر میں کھنچوائی تھیں۔ تصویروں میں وہ دونوں بہت خوش رنگ رہے تھے۔

''دیکھ لوں گا میں''۔ زاہد قریشی نے البم غصے میں آ کر صوفے پر پھینک دیا۔

''دیکھ تو آپ چکے ہیں۔ اب اور کیا دیکھیں گے۔ ہماری بیٹی ہے عینی۔ ہم اس کی زندگی کا فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور ہم نے بہت سوچ سمجھ کر علی سے عینی کی

شادی کی تھی۔'' یاسین بیگ نے سنجیدہ اور پراعتماد لہجے میں کہا۔

''زاہد صاحب! آپ کے لیے ہم کوئی اور لڑکی ڈھونڈ سکتے ہیں۔ آپ نے آنے میں بہت دیر کردی۔ ورنہ شاید آپ کی قسمت عینی کے ساتھ جاگ جاتی''۔

مسز یاسین نے مصنوعی تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا تو اس سے وہاں مزید رکنا محال ہوگیا اور وہ غصے میں تیزی سے باہر نکل گیا۔

''یا اللہ، تیرا شکر ہے، یہ بڈھا بھوت تو ٹلا۔'' مسز یاسین بیگ خوشی سے بولیں۔

''شکر ہے، اب تم انجم آپا سے فون پر معلوم کرلو کے وہ کب پاکستان آرہی ہیں تاکہ عاصم اور عینی کی بات شروع کی جاسکے۔'' یاسین بیگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یاسین، کہیں عاصم انکار نہ کردے یا علی اپنی عینی کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا تو کیا ہوگا؟'' مسز یاسین بیگ کے اندیشوں میں گھر کر کہا تو وہ گویا ہوئے:

''علی میری بات ضرور مانے گا اور عاصم اور عینی ایک دوسرے کو دیکھ لیں گے۔ جان لیں گے، پھر ہی حتمی فیصلہ ہوگا۔ عینی نے تو عاصم کو صرف تصویروں میں ہی دیکھا ہے اور یہ شادی تو ہم نے بہت مجبوری میں کی ہے۔ عاصم اور انجم آپا سمجھ جائیں گے۔ اور علی اور عینی کی شادی تو محض پیپر میرج ہے۔ عملاً وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ وہ محض مہمان بن کر علی کے گھر رہ رہی ہے اور میرا خیال ہے کہ میں اسے گھر لے آتا ہوں اب تو بات کلیئر ہو ہی گئی ہے۔ اب کیا کرے گا زاہد قریشی؟ اپنا سا منہ لے کر چلا گیا ہے''۔

''نہیں یاسین! میرے خیال میں ابھی عینی کو کچھ دن علی کے ہاں ہی رہنے دیں۔ کیا خبر زاہد قریشی تصدیق کے لیے وہاں پہنچ جائے یا دوبارہ یہاں آجائے اور عینی کو یہاں پا کر وہاں نہ پا کر شک میں پڑ جائے اور بنی بنائی بات بگڑ جائے۔'' مسز یاسین بیگ نے سمجھداری سے کہا۔

''بات تو تمہاری درست ہے چلو ٹھیک ہے، ایسا ہی کرلیتے ہیں۔'' یاسین بیگ نے سوچتے ہوئے کہا اور مطمئن ہوگئے۔

☆☆☆

''نسرین مجھے چائے پکانا تو سکھا دو اور روٹی کیسے پکاتی ہو تم مجھے بھی سکھا دو پلیز''۔

عینی نے شاید پہلی بار کچن میں قدم رکھا تھا۔ وہ بھی علی کے خوف سے کیونکہ اس نے اسے رات باتوں باتوں میں کہا تھا۔ اچھی بیویاں اپنے شوہروں کے دل جیتنے کے لیے ان کے معدے کا خیال رکھتی ہیں۔ تم روزانہ نہ سہی کم از کم ہفتے میں ایک بار تو اپنے شوہر کو اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھلا ہی سکتی ہو''۔

''مجھے کوکنگ نہیں آتی''۔ اس نے جواب دیا تھا۔ اور اس نے سنجیدگی سے کہا تھا:

''تو نسرین سے سیکھ لو، میں نے اسے کہہ دیا ہے۔ عجیب لڑکی ہو تم تمہیں چائے تک پکانا نہیں آتی''۔

''مجھے کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اور ملازم جو موجود تھے گھر میں تو میں کچن میں کام کیوں کرتی؟'' اس نے منہ بسور کر کہا۔

''اب تو تمہیں کچن میں کام کرنا پڑے گا کیونکہ میں تمہارے ہاتھ کا ذائقہ چکھنا چاہتا ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ طنزیہ انداز میں بولی:

''ویسا ہی ذائقہ جیسا آپ کے ہاتھ کا میں چکھ چکی ہوں''۔ اس کا اشارہ تھپڑ کی طرف تھا، وہ فوراً سمجھ گیا اور غصے میں آنے کے بجائے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا اور پھر بولا تھا: ''ہمت ہے تمہارے ان نازک ہاتھوں میں ایسا ذائقہ چکھانے کی''۔

''ہمت پیدا ہو ہی جاتی ہے''۔ اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا تھا۔

''لگتا ہے کہ تم ایک بار پھر میرے ہاتھوں پٹنے کے موڈ میں ہو''۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''اب تو عمر بھر کا پٹنا ہے''۔ اس نے خود کلامی کی تھی مگر اس نے واضح طور پر سنی تھی اس کی یہ بات اور مسکراتے محبت لٹاتے لہجے میں بولا تھا:

''محبت کی مار بھی مزہ دیتی ہے لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ تم ذہین ہو، حسین ہو اور تمہاری ذہانت کو''۔ تمہارے حسن کو چار نہیں، چودہ چاند لگ جائیں گے، اگر تم عورت ہونے کے ناتے، بیوی ہونے کے ناتے اپنی گھریلو ذمے داریاں سمجھو اور نبھانے کی کوشش کرو۔ عورت کا اصل روپ اور ہنر تو اس کی گھرداری میں جھلکتا ہے۔ میں کون سا تمہیں ملازمہ بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تمہیں کوکنگ آنی چاہیے تاکہ کبھی کبھار تم اپنے اس فن سے مجھے بھی فیض یاب کر سکو۔ اچھے اچھے پکوان پکا کر کھلا سکو۔ اتنی سی بات ہے عینی! ورنہ میں تو ملازم کے ہاتھ کا پکا کھانا کب سے کھاتا چلا آرہا ہوں۔ بیوی کے ہاتھ کے پکے کھانے کا ذائقہ، مزہ کیسا ہوتا ہے، یہ میں بھی چکھنا اور محسوس کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم میری خاطر میری یہ مان لوگی''۔

''کیوں آپ کی خاطر کیوں جبکہ یہ رشتہ؟'' وہ بولتے بولتے خاموش ہوگئی تھی۔

''اگر اس رشتے کی تمہاری نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے اور نہ ہی میں تمہارے لیے کوئی اہمیت، کوئی حیثیت اور مقام رکھتا ہوں تو مت سیکھو کوکنگ لیکن میں تم سے چائے، کافی تو بنوا سکتا ہوں اور اسے اپنی گزشتہ گستاخی کا بدتمیزی کی سزا کا حصہ سمجھنا''۔ علی نے نہایت سنجیدہ اور رعب دار لہجے میں کہا تھا اور وہ خاموش ہوگئی تھی۔

اور اب ناشتے کی تیاری کے وقت وہ کچن میں کھڑی تھی۔ علی لاؤنج میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کی باتوں پر اس کے کان لگے تھے، وہ مسکرا رہا تھا۔

''تو گویا تمہاری نظر میں اس رشتے کی اور میری اہمیت ہے'' علی نے خوشدلی سے سوچا۔

''عینی بی بی! آپ کوکنگ سیکھیں گی''۔ نسرین نے حیران ہو کر اسے دیکھا تو وہ

بے پرواہی سے بولی:

''ہاں تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ یوں بھی اب میں فارغ بیٹھے بیٹھے بور ہو جاتی ہوں، ٹائم پاس کرنے کے لیے یہ مشغلہ برا نہیں اور پھر میرا اصل کام تو کچن سنبھالنا ہی ہے نا۔ مجھے کچھ تو پکانا آنا چاہیے، خیالی پلاؤ کے علاؤ''۔

''لیکن عینی بی بی! جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں آپ کی شادی کو اور ابھی تو آپ کے ہاتھوں کی مہندی نہیں اتری''۔ نسرین حیرت کے سمندر میں غوطے لگاتی ہوئی بولی۔

''مہندی بھی اتر جائے گی۔'' عینی نے چائے کی کیتلی میں پانی ڈالتے ہوئے کہا'' کام کروں گی تو اتر جائے گی، کوئی ہمیشہ تھوڑی رچی بسی رہے گی میرے ہاتھوں میں۔ تم مجھے سب سے پہلے چائے پکانا سکھا دو۔ کتنی شرمندگی کی بات ہے کہ میں اپنے شوہر کو ایک کپ چائے بھی خود سے بنا کر پیش نہیں کر سکتی اور چائے کے بعد مجھے تم روٹی بنانا سکھانا۔ آہستہ آہستہ میں سیکھ ہی جاؤں گی۔ مما پاپا نے بھی مجھے کچن سے دور رکھا۔ کم از کم کوکنگ تو مجھے سکھانی چاہیے تھی۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ بہت وقت فارغ بیٹھنے سے تو کوکنگ سیکھنا ہی بہتر ہے۔ اب تم مجھے چائے پکانے کی ترکیب بتاؤ، جلدی سے''۔

''اچھا جی!'' نسرین ہنس کر بولی اور اسے ترکیب بتانے کے ساتھ ہی چائے پکا کر دکھائی تو وہ حیرت سے مسکراتے ہوئے بولی'' ارے یہ تو بہت آسان ترکیب ہے، میں تو سمجھ رہی تھی کہ بہت مشکل ہوگی۔ بس اب صبح کی چائے میں خود بنایا کروں گی، تم مجھے آملیٹ اور روٹی بنانے کی ترکیب بتا دو''۔

''آپ مجھے پکاتے ہوئے دیکھتی رہنا اور خود بنانے اور پکانے کی کوشش کیجیے گا پھر آپ کو یہ بھی آسان لگے گا۔'' نسرین نے چائے، چائے دانی میں انڈے ملتے ہوئے کہا۔

''آسان ہو ہی جائے گا۔ سیکھنے کی صلاحیت مجھ میں بہت ہے''۔ وہ ڈبل روٹی

کے سلائس ٹوسٹر سے نکالتے ہوئے بولی تو علی جو ان دونوں کی گفتگو پوری توجہ سے سن رہا تھا۔ اپنی محبت کے پہلے سبق کی کامیابی پر خوش دلی سے مسکرا رہا تھا۔

ناشتے کے بعد وہ آفس پہنچا تو یاسین بیگ نے اسے فوراً ہی اپنے دفتر میں طلب کر لیا۔

''جی سر! خیریت سے ہے، آپ بہت پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔'' علی نے ان کے چہرے پر پھیلے پریشان کن تاثرات کو دیکھتے ہوئے پوچھا تو انہوں نے ایک کاغذ اس کے سامنے میز پر رکھ دیا اور فکرمند لہجے میں بولے:

''یہ نوٹس ہیں تین کروڑ کا قرض جو میں نے اس کمپنی کے قیام کے لیے لیا تھا، بعد میں معاف کروا لیا تھا لیکن اب زاہد قریشی نے عینی والے معاملے میں منہ کی کھانے کے بعد یہ فائل دوبارہ اوپن کرا دی ہے۔ ہمیں تین کروڑ فوری طور پر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ صورت دیگر سزا، قید، جرمانہ، جائیداد ضبطی، ہمارا راستہ تک رہی ہے۔ اب تم بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''سر میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ قرضہ واپس کر دیں، کیونکہ گورنمنٹ نے قرض نادہندگان کی لسٹیں جاری کرنے کا آرڈر دے دیا ہے اور قرض نادہندگان کی سخت سزا تجویز کی ہے۔ اس سے پہلے کہ آپ کو کورٹ تک جانا پڑے یا قرض نادہندگان کی لسٹ میں آپ کا نام آئے، آپ یہ قرض فوراً ادا کر دیجیے اور ٹیکس کی فائلز بھی منگوا کر چیک کیجیے۔ جتنا ٹیکس بنتا ہے، اسے ادا کرنے کا اہتمام کیجیے ورنہ زاہد قریشی آپ کو بری طرح پھنسوا سکتا ہے اور اگر اس نے فائلز اوپر پہنچا دیں تو آپ کو اپنی کمپنی سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جائیں گے۔ حکومت سب کچھ ضبط کر لے گی۔ علی نے ان کی بات سننے اور نوٹس پڑھنے کے بعد پوری سنجیدگی سے انہیں اپنی سمجھ کے مطابق مشورہ دیا۔

''ہوں...'' وہ اس کی بات سمجھتے ہوئے بولے ''لیکن علی اس طرح تو ہم دیوالیہ ہو جائیں گے۔ یہ سب ملا کر تقریباً چار ساڑھے کروڑ بنتے ہیں۔ اگر ہم یہ رقم

اپنے اکاؤنٹس سے نکلوا کر حکومت کے اکاؤنٹس میں منتقل کر دیں گے تو ہم کنگال ہو جائیں گے۔

''سر دولت کا ہاتھ سے نکل جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے، مگر عزت کا چلے جانا بہت بڑی اور تکلیف دہ بات ہوتی ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ پہلے اپنی اور اپنی کمپنی کی عزت بچائیں، شہرت ماشاءاللہ بہت اچھی ہے، کمپنی کی ساکھ پر انشاءاللہ کوئی فرق نہیں آئے گا، ہمارا کام تو چل ہی رہا ہے اور جتنی رقم اس وقت کمپنی کے اکاؤنٹس میں موجود ہے، وہ ادا کرنے کے بعد ہم وقتی طور پر غیر متوازن ضرور ہو جائیں گے لیکن بالکل دیوالیہ نہیں ہوں گے۔ ہم بھروسے پر بزنس کرتے ہیں اگر کمی بیشی ہوگی تو ہم اپنے اکاؤنٹس سے تعاون کی درخواست کر سکتے ہیں، کمپنی کے ورکرز بھی انشاءاللہ ہمارا ساتھ دیں گے۔'' علی نے بہت سنجیدگی اور دانشمندی سے کہا تو وہ رنجیدہ لہجے میں بولے:

''ٹھیک ہے علی، جیسے تم مناسب سمجھتے ہو، ویسے ہی کرو۔ میں یہ کیس تمہارے سپرد کر رہا ہوں جہاں بھی دستخط چاہیے ہوں، مجھے بتا دینا۔ تم یہ قرض ادا کر دو اور ٹیکس وغیرہ کے گوشوارے بھی چیک کر لینا۔ اس کمبخت زاہد قریشی نے مجھے بلیک میل کرنے کے لیے ایک ایک دستاویز سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ اور اب سامنے لے آیا ہے اپنی گندی سوچ کے ساتھ۔

''آپ فکر نہ کیجیے سر! میں یہ معاملات ہینڈل کر لوں گا۔ مگر سر آپ کو آئندہ احتیاط سے کام لینا ہوگا، لیکن اس ملک کا حق ہے۔ امیر لوگوں کو ایمانداری سے ٹیکس ادا کرنا چاہیے اور قرض بھی واپس لوٹانا چاہیے تاکہ غریب عوام کو بھی ان کا حق مل سکے اور ملک ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکے۔ ہمارے ہاں اثر و رسوخ والے تو کروڑوں کے قرضے لے کر معاف کرا لیتے ہیں لیکن ایک غریب آدمی کو اول تو کوئی قرضہ دیتا ہی نہیں ہے بالفرض دے بھی دیتا ہے تو اس کی واپسی اس کے لیے عذاب بنا دی جاتی ہے۔ سر اس ملک کو قرض خواروں اور ٹیکس چوروں کی نہیں،

ایمانداروں اور دیانتداروں کی ضرورت ہے۔ آئی ہوپ آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے''۔

''بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں علی''۔ وہ شرمندگی سے بولے۔ ''اب تم مجھے مزید شرمندہ تو نہ کرو۔ اس کیس کو ہینڈل کرو جو میں نے تمہارے سپرد کیا ہے''۔

''او کے سر!'' وہ نوٹس کا کاغذ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

''اور ہاں علی، اس کیس کا کیا حال ہے جو ہم نے اپنی بیٹی کی صورت میں تمہارے سپرد کیا ہے؟'' یاسین بیگ کو عینی کا خیال آیا تو فوراً پوچھا۔ وہ دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا اور مسکراتے ہوئے بولا: ''سر نہ تو آپ نے وہ کیس مستقل اور مکمل طور پر میرے سپرد کیا ہے اور نہ ہی اس کیس کی اہم رکن مکمل طور پر میری سپردگی میں آنا چاہتی ہے۔ خاصا کمپلیکیٹڈ کیس آپ نے میرے سپرد کیا ہے''۔

''علی تمہارا بہت احسان ہے مجھ پر۔ بس عاصم لندن سے آ جائے تو اس کمپلی کیٹڈ کیس کو تم اپنی زندگی سے خارج کر دینا''۔ یاسین بیگ نے سنجیدہ اور ممنون لہجے میں کہا۔

''سر اب ایسا تو ناممکن ہے کیونکہ میں جو کیس ایک بار لیتا ہوں اسے مکمل طور پر ہینڈل کر کے ہی رہتا ہوں''۔ علی نے ذومعنی بات کہی اور آفس سے نکل گیا۔

''یاسین بیگ اس کی بات پر غور کرتے رہ گئے اور اس سے پہلے کہ وہ بات کو پوری طرح سمجھ پاتے، لیکن فون کی گھنٹی نے انہیں اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

☆☆☆

''عینی ایک کپ چائے تو بنواؤ''۔ وہ لاؤنج میں بیٹھا اسی کیس کی فائل اسٹڈی کرتے ہوئے بولا۔

''اچھا۔'' عینی نے کہا اور وہیں بیٹھے بیٹھے نسرین کو آواز دی۔

''جی عینی بی بی''۔

''نسرین صاحب کے لیے چائے بنا کر لاؤ''۔

''اچھا جی''۔ وہ جانے لگی تو علی نے اسے روک لیا اور سنجیدہ لہجے میں بولا:

''نسرین تم جاؤ اور جو کام تم کر رہی تھیں، وہ کرو جا کر''۔

''جی بہتر صاحب''۔ نسرین حکم کی تعمیل میں فوراً واپس چلی گئی۔

''عینی نے حیرت سے علی کی طرف دیکھا تو وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا: ''تم میرے لیے چائے بنا کر لاؤ''۔

''وہ خاموشی سے اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔ وہ مسکراتا ہوا فائل پر جھک گیا۔

''یہ لیجیے چائے''۔ دس بارہ منٹ کے بعد وہ چائے کا کپ لیے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''رکھ دو''۔ علی نے اس کی طرف دیکھے بغیر مگن انداز میں کہا تو اسے اس کا یہ بے نیازانہ اور نظرانداز کر دینے والے انداز بہت بری طرح محسوس ہوا، مگر ضبط کر گئی اور کپ میز پر رکھ کر ریموٹ کنٹرول اٹھایا اور ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئی اور اس کی نظریں علی پر جم گئیں۔ سوچیں ذہن کے دریچوں سے جھانکنے لگیں۔

''کیا میں اس شخص سے دور رہ سکتی ہوں؟ کیوں سہہ رہی ہوں میں اس کی کڑوی کسیلی باتیں؟ میں علی کے سامنے اتنی کمزور کیوں پڑتی جا رہی ہوں۔ نروس کیوں ہو جاتی ہوں؟ پپا نے کہا تھا کہ یہ رشتہ صرف دو ماہ تک رہے گا۔ پھر طلاق۔ نہیں۔ میں طلاق نہیں لوں گی۔ علی مجھ سے محبت کرتے ہیں اور شاید...... میں بھی''۔

وہ اس اظہار پر جھجک رہی تھی۔ یہ اعتراف اسے خود سے کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہو رہی تھی۔ ''پپا تو مجھے طلاق دلوا دیں گے۔ نہیں علی مجھے طلاق نہیں دیں گے۔ اف!''۔

وہ بے دھیانی اور الجھن میں سوچوں میں غرق با آواز بے بسی سے بولی تو علی نے سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ بہت پریشان لگ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھا۔

''کیا ہوا عینی!'' علی نے بے تابی سے پوچھا تو اس کی آواز پر وہ چونک گئی۔

''کک ...... کچھ نہیں''۔ وہ بوکھلا کر بولی۔

''تم نے ''اف'' جو کیا، تو میں سمجھا شاید کہیں درد ہو رہا ہے''۔ وہ بڑی محبت سے بولا۔

''درد...... نہیں ...... ابھی تو درد نہیں ہو رہا''۔ وہ معصومیت سے بولی، وہ مسکرانے لگا۔

''پہلے جو درد ہو رہا تھا وہ درد ہو گیا نا؟'' علی کا اشارہ اس تھپڑ اور اس کے نیچے گرنے کے نتیجے میں لگنے والی چوٹ کی طرف تھا۔ لہجہ اتنا شیریں، شہد آگیں اور محبت بھرا تھا کہ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ دل خود بخود اس کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا۔

''جی...... ہو گیا''۔ اس نے اپنی دلی کیفیت سے گھبرا کر ٹی۔ وی پر نظریں جما کر آواز کھول دی۔ میوزک کا پروگرام چل رہا تھا۔ علی نے مسکرا کر اسے دیکھا اور چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ سہمی سہمی اور قدرے شرمندہ سی اسے دیکھنے لگی۔

علی نے تین چار گھونٹ بھرنے کے بعد اس کے چہرے کو دیکھا اور شریر لہجے میں بولا ''بہت میٹھی چائے سے کیا چینی کے ساتھ اپنی محبت بھی اس میں گھول دی ہے''۔

''نہیں تو!'' وہ ایک دم سے ٹپٹا کر بولی تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ وہ بس اسے دیکھنے لگی۔ وہ چائے کا ایک ایک گھونٹ مزے لے لے کر پی رہا تھا۔ کپ خالی کر کے اس نے میز پر رکھ دیا اور اس کے شانوں پر اپنا بازو رکھ کر اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے نرم اور دلنشین لہجے میں بولا:

''جائزہ تو تم نے میرا نظر بھر کے لے لیا ہے اب ایمانداری سے بتاؤ، اتنے ہینڈسم، اسمارٹ اور ڈیشنگ شخص کی بیوی ہو کر اس سے بچنا، کترانا، جھجکنا، چھپنا، سمٹنا، اس سے دور رہنا، کیا اچھا لگتا ہے تمہیں؟''

''مجھے نہیں پتا۔ میں آپ کے اور پپا کے بیچ رولنگ سٹون بن کر رہ گئی ہوں۔ آپ دونوں مجھے اپنی مرضی پر چلانا چاہتے ہیں۔ میں تو آپ دونوں کے حکم اور مرضی کی ٹھوکروں کی زد میں پس کر رہ گئی ہوں۔'' وہ بھیگتے لہجے میں بولی تو علی کو اس پر بے انتہا پیار آنے لگا۔ نرمی سے بولا:

''تو تم ہم دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کیوں نہیں کر لیتیں؟''

''ایسا کرنا بھی آپ دونوں کے اختیار میں ہے، جو طاقتور ہوگا، وہی مجھے اپنی طرف آنے پر مجبور کر دے گا۔'' وہ آنسو پلکوں سے جھپک جھپک کر پیچھے دھکیلتے ہوئے بولی۔

''کیا میری محبت میں اتنی طاقت نہیں ہے عینی کہ تم میری طرف آ سکو؟'' وہ بہت آس بھرے اور سنجیدہ لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''آپ کی طرف تو میں کب کی آ چکی ہوں''۔ اس نے دل میں کہا۔

''پہلے اس بندھن کی پائیداری کی ضمانت دیجیے۔ اس کے بعد مجھ سے یہ سوال کیجیے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ تو وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''یہ زاہد قریشی کا پھیلایا ہوا جال کٹ جائے اس کے بعد میں تمہارے پپا سے دوٹوک بات کروں گا۔ کتنے مزے سے وہ مجھ سے ہی میری بیوی کی دوسری شادی کی باتیں کر رہے تھے۔ میں صرف ان کے پرابلمز کی وجہ سے اب تک خاموش ہوں، ورنہ یہ معاملہ اب تک کلیئر کرا چکا ہوتا''۔

عینی نے اس کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر ٹی۔ وی دیکھنے لگی۔ بہت ہی شوخ و چنچل نغمہ ٹیلی کاسٹ ہو رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ نغمہ اس کے جذبات کا ترجمان ہے۔ علی بھی اس کے حسین چہرے اور نغمے کے بولوں میں کھو گیا۔

''او ظلمی پیا، ہمرا اتنا بتا تو نے یہ کیا کیا
کا ہے چھین لیا جورا جوری مارا جیا

نغمہ فضا میں گونج رہا تھا۔ عینی نے نظریں ٹی۔ وی سکرین سے ہٹا کر علی کی طرف

دیکھا تو اسے مسکراتے ہوئے اپنی ہی جانب دیکھتے پا کر بلش ہوگئی اور نظریں چرا کر وہاں سے اٹھ کر بیڈروم میں چلی گئی۔

''ارے کب تک بچو گی، کب تک چھپو گی عینی ڈارلنگ!'' علی نے بند دروازے کو دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے سوچا۔

☆☆☆

علی نے قرض اور ٹیکس کے تمام واجبات ادا کرنے کے بعد حکام بالا کی طرف سے ستائشی کلمات سنے تو وہ خوش اور مطمئن ہو کر آفس گیا۔ تمام فائلز کلیئر کرانے اور اس مسئلے سے مبرا ہونے کی خوشخبری یاسین بیگ کو سنائی تو وہ خوشی سے کھل اٹھے۔

''او علی یو آر سو انٹیلی جنٹ، سو گریٹ اینڈ ٹیلنٹڈ بوائے۔ تم نے تو مجھے اور کمپنی کو ایک بہت بڑے نقصان سے بچالیا ہے۔ وہ لوگ تو میری بات ہی نہیں سن رہے تھے۔ تمہیں تو وکیل ہونا چاہیے تھا۔ ہر کیس خوب ذہانت سے لڑ سکتے ہو تم''۔

''سر آپ فکر نہ کیجیے۔ ضرورت پڑنے پر میں اپنا ہر ایک کیس بھی خوب ذہانت سے لڑوں گا۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا تو وہ ہنس پڑے۔

''تم باتیں بھی بہت خوب بناتے ہو''۔

''جی سر، مجھے بنانا اور سنوارنا ہی آتا ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے میں نے کبھی بگاڑنا نہیں سیکھا۔ اور نہ ہی مستقبل میں کسی سے بگاڑنا چاہتا ہوں۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''ارے بھئی کہاں چل دیے تم، بیٹھو میں چائے منگواتا ہوں۔'' یاسین بیگ نے جلدی سے کہا۔

''شکریہ سر، چائے تو میں گھر جا کر ہی پیوں گا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی نظروں میں عینی کی صورت گھوم گئی۔ اس کے ہاتھ کی بنی چائے اسے بے حد پسند تھی۔

جب وہ گھر پہنچا تو وہ کچن میں ہی موجود تھی۔ وہ آج کل روٹی پکانا سیکھ رہی تھی

اور کچھ کامیاب بھی ہو رہی تھی۔ علی اسے ڈھونڈتا ہوا کچن ہی میں چلا آیا۔ گلابی کاٹن کے سوٹ میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ شادی کے بعد سے اس نے ایک دن بھی علی کے سامنے علی کے لیے بناؤ سنگھار نہیں کیا تھا۔ صرف علی کی پہنائی ہوئی سونے کی زنجیر جس پر علی کے نام کا اے لکھا ہوا تھا، اس کے گلے میں پڑی تھی جو اس نے علی کے غصے کے خوف سے نہیں اتاری تھی۔ گرمی میں یوں بھی اسے جیولری پہننے سے الجھن ہوتی تھی۔ علی نے اس کا یہ روپ دیکھا تو سوچنے لگا۔

''اس بے تحاشا حسین کے آگے تو بڑے بڑے زاہدوں کا ایمان خطرے میں پڑ جائے۔ بیچارہ زاہد قریشی اب اتنا بھی قصوروار نہیں ہے عینی ڈیئر۔ مقناطیسی کشش ہے تمہارے حسن میں۔'' وہ سنک کے قریب کھڑی اپنے ہاتھ دھو رہی تھی۔ علی نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ ڈر گئی اور علی کو اس کے خوفزدہ انداز پر ہنسی آگئی۔

''یار میں کوئی جن بھوت ہوں جو تم مجھ سے ڈرتی ہو؟''

''جن بھوت اگر آپ کی طرح خوبصورت اور گریس فل ہوتے تو لوگ جنوں، بھوتوں سے ہرگز نہ ڈرتے، بلکہ اپنے آپ سے ڈرتے۔ اصل جن اور حقیقی بھوت تو انسان کے اندر چھپا ہوتا ہے۔'' عینی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''میری تعریف کرنے کا بے حد شکریہ، بھئی تم تو بہت سمجھدار اور ذہین ہو، بہت گہری اور فلسفیانہ بات کہی ہے تم نے۔ لیکن تم مجھ سے خوفزدہ کیوں رہتی ہو؟ میں تمہیں خود سے ڈرانا تو نہیں چاہتا، تم تو جان ہو میری!'' علی نے ستائشی لہجے میں کہا اور اس کے چہرے پر اپنی محبت کی مہر بھی ثبت کر دی۔ وہ سلگتے ہوئے چہرے کے ساتھ تیزی سے پرے ہٹی اور شرم و حیا سے نظریں جھکائے دروازے کی جانب بڑھنے لگی تو علی نے اسے اپنی بانہوں کے حلقے میں لے لیا۔

''پلیز علی''۔ وہ نظریں جھکائے شرمگیں لہجے میں بولی۔

''تم خود کو تو پابند کیے ہوئے ہو، کم از کم مجھے تو پابند مت کرو''۔ وہ شہد آگیں

لہجے میں بولا۔

''آپ جانتے ہیں کے اس سب کا...... نتیجہ کیا ہو گا؟'' وہ نظریں جھکائے بہت مدھم آواز میں بولی۔

''جانتا ہوں''۔

''تو پھر بھی آپ''۔ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

''پھر بھی میں اپنی محبت کے اظہار سے باز نہیں آ سکتا کیونکہ تم میری بیوی ہو، جائز رشتے سے جائز اظہار کرتا ہوں میں۔ کوئی گناہ، کوئی جرم تو نہیں کرتا۔ حالانکہ یہاں تو لوگ ناجائز رشتوں کے لیے یہ اظہار جائز سمجھ لیتے ہیں۔ بغیر کسی رشتے کے یہ اظہار محبت کر گزرتے ہیں''۔

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں لیکن آپ کو اس جائز رشتے کا حقدار بنا کر بھی یہ اظہار ناجائز قرار دیا تھا پپا نے آپ کے لیے۔ آپ نے خود ان سے اسی بنیاد پر قبول کیا تھا۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ تو علی نے مسکراتے جذبے لٹاتے لہجے میں کہا۔

''اس وقت مجھے اس رشتے کی گہرائی اور اپنے جذبوں کی شدت کا اندازہ نہیں تھا۔ مجھے تو خبر ہی نہیں تھی کہ مجھے محبت ہو جائے گی۔ تمہارے پپا! تمہیں اپنے گھر ہی رکھتے تو شاید میں اس جائز تعلق کو بھی عملاً اپنانے سے گریز کیے رہتا لیکن انہوں نے تمہیں میری تحویل میں دے کر میرے اندر کے محبت بھرے علی کو جگا دیا ہے اور اب یہ علی اس وقت ہی سوئے گا جب تمہاری محبت سے محروم ہو جائے گا''۔

''علی......'' عینی نے بے قراری سے نظریں اٹھا کر اس کے چہرے کو دیکھا۔

''ہاں عینی! میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا''۔ وہ اس کے اس قدر قریب ہو کر محبت بھرے لہجے میں یہ روح کو سرشار کرنے والا اعتراف کر رہا تھا کہ عینی کو اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ وہ شرم و حیا سے کچھ بول ہی نہ سکی۔

''کچھ تو ہو عینی!'' وہ محبت سے اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔ وہ سخت الجھن کا

شکار تھی۔

''پپا ممی سے مجھے...... بہت شرم آئے گی...... انہوں نے تو منع کیا تھا''۔ اس نے حجاب آمیز لہجے میں کہا۔

''تو تم انہیں مت بتانا اور یوں بھی اگر ہم دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق بھی رہیں تو کون یقین کرے گا کہ ہم نے اتنے مضبوط بندھن کے ہوتے ہوئے ایک چھت تلے رہتے ہوئے ایک گھر میں ایک ساتھ رہتے ہوئے ایک دوسرے کو چھوا نہ ہو۔'' وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

''م...... میں نے تو نہیں...... آپ کو چھوا''۔ وہ بوکھلا کر بولی تو وہ مسکراتے ہوئے بولا:

''مگر میں نے تو نہیں چھوا ہے اور بہت زیادہ اور بہت قریب سے چھوا ہے تمہارے نہ چھونے سے تمہاری بات پر تو کوئی بھی یقین نہیں کرے گا''۔

''کیوں؟'' اس نے ہونقوں کی طرح سوال کیا تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

''کیونکہ میں تمہیں اس قابل رہنے ہی نہیں دوں گا''۔ اس نے بہت شرارت بھرے لہجے میں کہا تو وہ حیران، پریشان، سہمی ہوئی، معصوم نظروں سے اسے تکنے لگی اور وہ اس کی حالت پر صورت سے جھلکتی۔ بے پناہ معصومیت سے بے خود ہی تو ہو گیا اور شرارت اور شوخی سے بھرے لہجے میں بولا:

''اب ایسی معصومیت پر مجھے پیار نہ آئے تو کیا غصہ آئے گا؟'' پھر کہتی ہو کہ مجھے چھوئیں نہیں، میرے قریب مت آئیں، تم میرے لیے شجر ممنوعہ تو نہیں ہو جان! تم کیوں مجھے آزمائش میں ڈال رہی ہو''۔

''میں نے آپ کو کب آزمائش میں ڈالا ہے''۔ وہ معصومیت اور بے چارگی سے بولی''۔ آپ تو جو چاہتے ہیں، کر لیتے ہیں۔ آزمائش میں تو میں ہوں، بے بس اور بے اختیار''۔

''اختیا تو میں تمہیں دے چکا ہوں تم جو چاہو، کر سکتی ہو، مگر وہی کچھ''۔ وہ

شرارت آمیز لہجے میں مسکراتے ہوئے بولا ''جو میں اب تک تمہارے ساتھ پورے استحقاق کے ساتھ کر چکا ہوں''۔

''میں ایسا کچھ نہیں کر سکتی۔'' وہ شرم سے کٹ کر بولی تو وہ ہنس کر بولا۔

''مرضی ہے تمہاری، جلد مدیر ایسا بہت کچھ تمہیں کرنا پڑے گا''۔

''آپ کس قسم کے انسان ہیں؟'' وہ زچ ہو کر بولی تو وہ ہنسنے لگا۔

''شکر ہے، تمہیں میرے بارے میں جاننے اور سوچنے کا خیال تو آیا۔ میں چینج کر کے ذرا مارکیٹ تک ہو آؤں۔ واپسی پر بات ہوگی اس موضوع پر۔''

وہ اپنی محبتوں کے پھول اس پر لٹاتا کچن سے باہر چلا گیا وہ جو پور پور اس کے محبت بھرے لمس کے حصار میں قید ہوگئی تھی، اب بہت شرم محسوس ہو رہی تھی خود سے بھی اور علی سے بھی۔ ممی پاپا کا خیال اور ہدایت الگ شرمندہ کر رہے تھے۔ علی کے اتنے شدید اور والہانہ اظہار محبت کے بعد بھی اس کے اندر کوئی کونپل نہ پھوٹے یہ کیسے ممکن ہے؟'' کیسی بیوی ہوں میں نہ شوہر کی محبت پر دل سے خوش ہو سکتی ہوں اور نہ ہی اپنی محبت کا ان سے اظہار کر سکتی ہوں۔ اوہ! پپا یہ آپ نے مجھے کس آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ آپ خود ایک مرد ہیں، آپ کو سوچنا تو چاہیے تھا کہ ایسا ناممکن ہے۔ وہ بھی ایک مضبوط اور جائز بندھن کے ہوتے ہوئے، یہ کیسے ممکن ہے کہ دو امنگوں بھرے جذبات سے پر شباب کے جوب پر گلاب چہرے، دل اور جسم ایک دوسرے کے ہوتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب نہ آئیں، ایک دوسرے سے بے تعلق، بے پرواہ بے نیاز بن کر رہیں۔ نہیں پپا! بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ میں تھک گئی ہوں پپا۔ علی کی محبتوں کے سامنے ہار گئی ہوں۔ میں اپنا دل اپنی روح، اپنا جسم سب کچھ علی کی محبت میں ہار گئی ہوں۔ اب ان سے جدائی کا تصور بھی میرے لیے موت ہے موت!''

وہ سوچتے سوچتے کچن سے باہر آگئی تھی۔ علی چینج کر کے کمرے سے نکلا تھا:

''ہیلو جان علی! کہاں کھوئی ہو؟'' علی نے اس کے سامنے آ کر محبت پاش نظروں سے

اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ چونک گئی اور ایک نظر علی کے چہرے پر ڈال کر جھکا لی۔

''ابھی تو ایک بوند محبت برسائی ہے میں نے تم پر، ابھی تو سمندر موجزن ہے میرے دل میں۔ محبت کا سمندر صرف تمہارے لیے ہے''۔

''اچھا تو پپا سے کہنے جا کر، مجھ سے کیوں کہہ رہے ہیں؟'' وہ حیا آلود لہجے میں بولی۔

''جس سے محبت ہوگی اسی سے کہوں گا نا'' وہ ہنس کر اس کی ٹھوڑی کو پکڑ کر پیار سے بولا تو وہ بلش ہوگئی۔

''میں مارکیٹ تک جا رہا ہوں۔'' وہ محبت سے اسے دیکھتا جانے کے لیے مڑا۔

''سنئے!'' اس نے بے اختیار پکارا۔

''جی''۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب آیا تو وہ گھبرا گئی۔ نظریں جھکا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی جو انجانے خوف سے کانپ رہے تھے یا اس کی محبت کے بے تحاشا اظہار پر خوشی سے بے قابو ہو رہے تھے۔ علی نے بڑی چاہ سے اسے دیکھا۔

''وہ مجھے......'' وہ بولتے بولتے خاموش ہوگئی۔

''کیا کچھ منگوانا ہے مارکیٹ سے؟'' علی نے بہت نرم لہجے میں پوچھا۔

''جی''۔ وہ بولی۔

''کیا؟'' علی کا لہجہ اپنائیت سے بھرپور تھا۔

''وہ......مجھے......'' وہ کہتے ہوئے جھجک رہی تھی کہ کہیں وہ اس کا مذاق نہ اڑانے لگے۔

''مجھے آپ......وہ؟''

''اوہو! ارے بابا اتنا ڈر کیوں رہی ہو، میں تمہیں کھا تھوڑی جاؤں گا۔ بتاؤ شاباش کیا منگوانا ہے؟'' علی نے اس کے ہاتھ تھام کر بہت نرمی اور محبت سے کہا۔

''آپ...... مجھے...... وہ...... کھانا پکانے کی...... ترکیبوں والی، کتابیں لا دیں

گے۔'' اس نے نروس ہوتے ہوئے جھجکتے ہوئے اٹک اٹک کر بہ مشکل اپنی بات مکمل کی تو وہ خوشدلی سے ہنس دیا اور پھر اسی نرمی اور محبت سے بولا:

''ہاں لا دوں گا......اور کچھ؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا تو وہ شرارت سے اس کے دھنک رنگ بکھیرتے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''عینی جان! تم بھی کمال کرتی ہو، کتابوں کے لیے اتنا کنفیوز ہو رہی تھیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ شاید تمہیں اپنی ذاتی ضرورت اور استعمال کے لیے کوئی چیز منگوانا ہے جو تم اس قدر جھجک رہی ہو، شرما رہی ہو، گھبرا رہی ہو، بہت معصوم ہو تم''۔

''نہیں''۔ اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے وہ شرم سے گلابی ہو گئی۔

''اچھا پھر بھی اگر کبھی منگوانا ہو تو بلا جھجک بتا دینا، ارے شوہر سے کیسا پردہ!'' علی نے اس کی ٹھوڑی کو چھو کر پیار سے کہا تو شرما کر کمرے کی طرف بھاگی تھی اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

مارکیٹ سے واپسی پر وہ اس کے لیے کھانا پکانے کی ترکیبوں کی تین کتابیں لایا تھا۔ اب وہ ان کتابوں میں تحریر تراکیب کو بہت غور سے پڑھ رہی تھی اور سب سے پہلے اس نے چکن کڑاہی کی ترکیب آزمانے کا ارادہ کیا تھا۔ چکن فریزر میں موجود تھا جو علی ہفتے بھر کے کچن کے سامان کے ساتھ ہی لایا تھا۔ وہ ناشتے کے بعد ہی کچن میں مصروف ہو گئی۔ وہ ہر کام بہت صفائی اور سلیقے سے کرنے کی عادی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ اس قسم کا کام اسے اب شادی کے بعد کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ ایپرن باندھے چولہے پر رکھی کڑاہی میں چکن فرائی کر رہی تھی۔ آج آفس سے علی کی چھٹی تھی لیکن اسے یاسین بیگ کے کام کے سلسلے میں کہیں جانا تھا، وہ تیار ہو کر سیدھا کچن میں چلا آیا۔

''عینی میں جا رہا ہوں''۔ وہ اسے کام کرتے دیکھ کر حیران ہو کر بولا۔

''کہاں جا رہے ہیں؟'' اس نے ایک لمحے کو کڑاہی سے نظریں ہٹا کر اس کی

طرف دیکھا اور پھر سے کڑاہی میں نظریں جمالیں اور چمچ ہلانے لگی۔

''تمہارے پیا جان کے کام سے جا رہا ہوں حالانکہ آج میری چھٹی کا دن ہے''۔ اس نے فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے بتایا۔

''تو آپ نے معذرت کر لی ہوتی پیا سے''۔

''معذرت تو میں تمہارے معاملے میں ہی کروں گا ان سے، جب وہ مجھ سے تمہاری واپسی کا مطالبہ کریں گے۔ فی الحال اس کام کے لیے تو میں ان سے معذرت نہیں کر سکتا کیونکہ ایک تو وہ میرے باس ہیں، مشکل میں ہیں، اور دوسرا یہ کہ تمہارے حوالے سے میرا ان سے داماد سسر کا رشتہ بھی تو ہے اور سسر بھی باپ کے برابر ہوتا ہے اور اچھی اولاد اپنے باپ کو مشکل میں اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتی ناں۔'' علی نے پانی پیتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر کہا تو اس نے پسندیدہ اور محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

''پیا اسی لیے تو آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں''۔

''جبکہ آپ ہمیں تعریف کے قابل بھی نہیں سمجھتیں۔'' اس نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ نروس ہو گئی۔ چولہے کی آگ بہت تیز تھی۔ اس سے کم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ ہاتھ جو کانپ رہے تھے علی کے سامنے اس کی حالت ایسی ہی ہو جاتی تھی۔ نروس اور شپٹائی ہوئی رہتی تھی وہ حالانکہ کبھی وہ خود دوسروں کو نروس کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھی۔ ''یہ کیا ہو گیا ہے مجھے؟'' عینی نے پریشانی سے سوچا۔

''یہ چولہے کی آنچ کم کر دیجیے۔'' اس نے ہار کر علی سے کہا کیونکہ وہ چکن جلانا نہیں چاہتی تھی۔ علی جو بہت دلچسپ سے اسے دیکھ رہا تھا، چولہے کی آنچ کم کر کے مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا: ''چولہے کی آنچ تو میں نے کم کر دی ہے۔ لیکن ان جذبوں کی آنچ کیسے کم ہو گی جو تمہیں دیکھتے ہی لہو کو گرمانے لگتی ہے''۔

''آپ جائیے، آپ کو دیر ہو رہی ہے'' عینی نے نظریں چرا کر مصالحے والی پلیٹ اٹھاتے ہوئے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے اسی لہجے میں اسی انداز میں بولا۔

''دیر تو واقعی ہو رہی ہے بھئی ڈارلنگ!'' لیکن میری طرف سے نہیں تمہاری طرف سے ہو رہی ہے دیر''۔

''آپ واپس کب تک آئیں گے؟'' اس نے نروس ہوتے ہوئے بلا ارادہ یہ سوال پوچھ لیا۔

''کیوں کیا یہاں سے بھاگنے کا ارادہ ہے؟'' وہ اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

''نہیں''۔ اس نے فوراً گھبرا کر کہا تو وہ ہنس پڑا۔ وہ مزید سٹپٹائی اور چولہا جلتا چھوڑ کر کچن سے باہر جانے لگی تو اس نے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا اور اسے اپنے قریب کرتے ہوئے نرم لہجے میں بولا:

''بھئی! تم مجھ سے کیوں ڈرتی اور بچتی رہتی ہو؟ تم اسے دو ماہ کا تعلق سمجھ رہی ہو۔ بے وقوف لڑکی! یہ تعلق اب عمر بھر کا ہے۔ تم اس لیے کتراتی ہو مجھ سے کہ دو ماہ تک کچھ ہو نہ جائے۔ تو میری جان! کچھ ہونے کے لیے دو ماہ کا عرصہ تو طویل ہوتا ہے۔ ایسے رشتے اور تعلق میں تو دو منٹ بھی بہت ہوتے ہیں۔ اور کیا خبر کچھ ہو ہی گیا ہو۔ میری محبت اور قربت اتنی بے اثر تو نہیں ہو سکتی کہ تمہارے اندر کوئی شگوفہ نہ پھوٹے، کوئی کونپل نہ کھلے، کوئی کرن نہ جگمگائے''۔

''یہ...... یہ...... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' اس کی حالت دیدنی تھی۔ بوکھلا کر بولی۔

''سچ کہہ رہا ہوں، ذرا اپنے اندر جھانک کر دیکھو، پوچھو اپنے دل سے کیا میرا ہلکا سا عکس بھی تمہارے اندر نہیں بنا؟'' علی نے مسکراتے ہوئے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ پہلے ہی نروس ہو رہی تھی حیا سے بے حال ہو رہی تھی۔ رہی سہی کسر ٹیلی فون کی گھنٹی نے چیخ کر پوری کر دی جو علی کی بات کے مکمل ہوتے ہی چیخی تھی۔

''علی''۔ عینی نے ڈر کر اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔

''عینی! کیا تمہیں ایسا محسوس نہیں ہوا کہ جیسے یہ علی کی پکار تمہارے دل سے نکلی

ہے؟''

''میرے کچھ محسوس کرنے سے کیا ہوگا، اگر پپا نہیں چاہیں گے تو''۔ وہ روہانسی ہوگئی'' اور اگر انہیں معلوم ہو گیا تو''۔

''یہ جو تمہارے پپا ہیں نا، ایمان سے بڑے ہی بے ایمان شخص ہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

اس نے خائف نظروں سے اسے دیکھا اور مسکرا دیا اور بہت نرم اور دوستانہ لہجے میں گویا ہوا:

''میں سچ کہہ رہا ہوں، اب دیکھو نا، انہوں نے مجھے اپنی کمپنی میں جاب دی ہے تو میری محنت اور قابلیت کو دیکھ کر دی ہے، لیکن وہ مجھے اپنا احسان مند بنا کر مجھ سے کئی ایکسٹرا کام بھی کروا چکے ہیں۔ اب یہ زاہد قریشی والا پھڈا میرا پھیلایا ہوا تو نہیں تھا مگر میں نے ہینڈل کیا ہے۔ ساری گڑبڑ تمہارے پپا کی تھی۔ جس سے بھی قرض لیا تھا تو بعد میں واپس بھی کر دیتے، ٹیکس بروقت ادا کر دیتے، سامان کسٹم ڈیوٹی ادا کرنے کے بعد کمپنی تک پہنچاتے تو نوبت ہی نہ آتی۔ اب کمپنی اکاؤنٹس سے ساڑھے چار کروڑ روپے نکلوائے ہیں اور اکاؤنٹس تقریباً خالی ہو چکے ہیں۔ خیر وہ تو پھر سے بھر جائیں گے اور میں آج اسی سلسلے میں جا رہا ہوں۔ لیکن تمہارے پپا بہت مشکل سے قانون کی گرفت سے بچ سکے ہیں۔ تم انہیں سمجھانا کہ قوم کا پیسہ اس طرح اپنی تجوریوں میں بھرنا اچھی بات نہیں ہے۔ اللہ بھی ناراض ہوتا ہے اور زاہد قریشی جیسے لوگوں سے بھی بلیک میل ہونا پڑتا ہے ویسے اس بے ایمانی کے سارے چکر میں مجھے بہت بڑا فائدہ پہنچایا ہے تمہارے پپا نے''۔

''کیسا فائدہ؟'' عینی نے اس کے چہرے کو دیکھا۔

''یہ فائدہ''۔ علی نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کے چہرہ پر محبت بھری نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا تو حیا کے رنگ اس کے چہرے کو گلابی بنا گئے۔ آپ ہی آپ حیا کے بوجھ سے جھکتی چلی گئی۔

''ایک جنت کی حور انہوں نے میری زندگی میں بھیج دی ہے۔ جس سے میرا گھر ہی نہیں، میرا دل بھی آباد ہو گیا ہے۔ ان کا مجبوری کا یہ رشتہ میرے لیے محبت کا رشتہ بن گیا ہے اور کمپنی کے چکروں میں پھنس کر میں ہنی مون بھی ملتوی کیے بیٹھا ہوں، جونہی فراغت ہوگی، ہم سیر کے لیے نکل چلیں گے۔ تم اگر مری، بھوربن جیسے خوبصورت مقامات پر نہیں جانا چاہو گی نا تو بھی، ہم ہنی مون اپنے اس خوبصورت گھر میں ہی منالیں گے اور میرے لیے تو مری، بھوربن، سوات اور گلگت کا حسن تمہارے وجود کی صورت میں ہی موجود ہے''۔

''ٹیلی فون کی گھنٹی کب سے بج رہی ہے۔ سن لیجیے شاید کوئی ضروری فون ہو۔'' عینی نے حجاب آمیز آواز میں کہا تو وہ پیار بھری خفگی سے بولا:

''بجنے دو، یہ ٹیلی فون تمہارے لیے کیا مجھ سے زیادہ اہم ہے''۔

''بے جان چیزیں کبھی بھی انسانوں سے زیادہ اہم نہیں ہوتیں''۔ عینی نے سنجیدگی سے کہا۔

''واہ، کیا خوبصورت بات کہی ہے''۔ وہ سراہتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اتنی اچھی اچھی باتوں سے کیوں محروم رکھتی ہو مجھے۔ میرے قریب رہا کرو تاکہ میں تمہاری ان صلاحیتوں سے بھی محظوظ ہو سکوں، مستفید ہو سکوں۔ ہوں۔ اب میں چلوں گا کیونکہ ٹھیک بیس (20) منٹ بعد مجھے میٹنگ ہال میں موجود ہونا ہے اور ہاں جب میں واپس آؤں تو تمہارے ہاتھ کا کھانا میز پر سجا ہوا ہونا چاہیے''۔

''آپ واپس کتنی دیر تک آجائیں گے؟''

''تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟'' وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بولا۔

''ایک بیوی کو اپنے شوہر سے اتنا پوچھنے کا حق تو ہوتا ہی ہے''۔ اس نے کڑاہی میں کفگیر چلاتے ہوئے کہا تو وہ خوش ہو کر بولا:

''ارے بیوی بن کر پوچھو گی تو تمہارا یہ شوہر تمہیں ضرور بتائے گا۔ صد شکر کہ تم نے مجھے اپنا شوہر تسلیم کیا، مجھ سے کچھ پوچھا تو''۔

''میں نے اس لیے پوچھا ہے کہ اگر آپ پانچ دس منٹ بعد واپس آجائیں گے تو اتنی دیر میں تو کھانا تیار نہیں ہو سکتا اور پھر آپ مجھ پر غصے ہوں گے''۔ اس نے بات بنا کر کہا۔

''بے فکر رہو میں تم پر غصے نہیں ہوں گا بلکہ تم کو پیار کروں گا، اگر آج تم نے کھانا پکا لیا تو۔ میں بارہ بجے تک گھر آجاؤں گا تب تک کے لیے اللہ حافظ''۔

وہ محبت سے اسے دیکھتا اس کا شانہ تھپک کر واپس چلا گیا۔ اور وہ اس کی محبت پر روح تک سے سرشار ہو گئی اور بہت دل لگا کر چکن کڑاہی کتاب میں لکھی ترکیب کے مطابق بنائی اور نسرین کو چیک کرا کے چولہا بند کرا دیا۔ اب چپاتیاں پکانے کا مرحلہ تھا۔ آٹا نسرین نے گوندھ دیا تھا۔ اس نے بہت کوشش اور محنت سے پانچ چھ چپاتیاں پکائیں اور نسرین سے چپاتیاں الگ سے پکوالیں تاکہ وہ علی کو پیش کر سکے۔ اپنی پکائی گئی چپاتیوں پر اسے بھروسا نہیں تھا۔ کیا خبر علی کو پسند آئیں، نہ آئیں اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ علی کھانا کھائے بغیر ہی میز پہ سے اٹھ جائے۔ کھانا پک کر تیار ہو گیا تو وہ نسرین کو بارہ بجے کھانا میز پر لگا دینے کا حکم دے کر کمرے میں گئی، پسینہ خشک کرنے کے بعد لان کا سوٹ نکالا اور نہا کر پہن لیا۔ اس کے گھنے سیاہ سلکی بال جو فرنٹ سے بہت دیدہ زیب اسٹائل میں کٹے ہوئے تھے، بہت اچھے لگ رہے تھے اس کے چہرے پر، وہ بالوں میں برش کر کے وہیں کمرے میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں دیوار پر آویزاں علی کی بڑی سی تصویر پر جم گئیں۔ وہ کتنی اسمارٹ اور ڈیشنگ پرسنالٹی کا مالک تھا۔ کیسی چمک تھی اس کی سیاہ آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور اس کی مسکراہٹ تو عینی کا دل موہ لیتی تھی۔ اس کی ہنسی اسے دل میں میٹھی میٹھی امنگ جگاتی محسوس ہوتی تھی۔ عینی نے مسکراتے ہوئے سوچا اور اپنے گلے میں علی کی پہنائی ہوئی زنجیر پکڑ کر دیکھنے لگی۔ وہ کتنی دیر اس زنجیر سے کھیلتی رہی اور جانے کن خیالوں میں گم ہو کر اس نے ''اے'' والا حصہ اپنے ہونٹوں میں دبالا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے علی کے تصور میں سفر کر رہی تھی۔ میرا اور علی کا نام ''ح'' سے اور ''بلکہ'' سے

شروع ہوتا ہے اور کتنا خوبصورت لگتا ہے۔ میرے نام کے ساتھ علی کا نام ''عینی علی'' ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی تخلیق ہوئے ہیں۔ کتنے خوبصورت ہیں علی۔ ان کی سوچ، ان کی باتیں، ان کی محبت اور شرافت کی گواہی دیتی ہیں، مگر ہائے! بیچارے علی! میری وجہ سے کتنی مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ میں بھی تو ان کی وجہ سے مشکل میں گرفتار ہوں۔ وہ تو مرد ہیں، مضبوط ہیں، اپنا حق چھین کر بھی لے سکتے ہیں، اپنی بات منوا سکتے ہیں۔ لیکن میں ایک کمزور لڑکی۔ میں تو ان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ علی! میں شروع دن سے آپ کی محبت کی اسیر ہوں۔ میں آپ سے علیحدہ ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ کیسے کہوں میں یہ سب حقیقت علی سے؟ پپا نے مجھے بہت بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ اور پپا! میں فیل ہوگئی ہوں اس امتحان میں۔ علی کی بے پناہ محبت نے چاہت نے مجھے کلین بولڈ کر دیا ہے۔ پپا اب آپ کو ہی ایمپائر بن کر یہ فیصلہ علی کے حق میں کرنا ہوگا کیونکہ میں اب نئے سرے سے زندگی کی پچ پر شادی کی دوری اننگز اسٹارٹ نہیں کرسکتی۔''

عینی نے بہت سنجیدگی اور سہولت سے اپنے دل و دماغ میں اپنے آپ سے، علی سے، پپا سے وہ ساری باتیں کہہ لیں جو درحقیقت وہ کہتے ہوئے خوف اور شرم محسوس کر رہی تھی۔ علی کمرے میں داخل ہوا تو اسے کرسی پر آنکھیں بند کیے بیٹھا دیکھا کر مسکراتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ زنجیر والا ''اے'' اب تک عینی کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا، علی نے کرسی کی ہتھیلیوں پر اپنی ہتھیلیاں جمائیں۔ ایک لمحے کو اس کے چہرے کو بہت غور سے دیکھا جونہی اس کے ہونٹوں سے زنجیر نکالنے لگا، وہ بری طرح ہڑبڑا گئی اور علی زنجیر نکال کر اس کی حالت پر ہنس پڑا اور وہ شرمندہ سی ہو کر سمٹ گئی۔ علی کو وہ اس وقت بالکل ایک چھوٹی بچی لگ رہی تھی۔ جو چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔

''اس لاکٹ کے "A" کو تو تم نے بہت دیر سے اپنے رسیلے ہونٹوں سے لگا رکھا تھا۔ اب اس اے فار علی کو بھی اسی اعزاز سے نواز دو جو زندہ سلامت تمہارے

سامنے موجود ہے اور سارے کا سارا تمہارا ہے صرف تمہارا۔''

علی نے بہت محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ اس کے لہجے کی شرارت پر شرما بھی گئی اور اپنی اس بے دھیانی اور بے اختیاری میں کی گئی بچگانہ حرکت پر شرمندہ بھی ہوگئی۔ علی نے بہت شوخ نظروں سے اسے دیکھا اور پھر ایک دم ہی شوخ جسارت کر بیٹھا۔ وہ سر سے پاؤں تک تپ گئی۔ چہرہ سرخ گلاب بن گیا۔ شرم سے اس کا برا حال تھا۔ وہ محظوظ ہو رہا تھا۔

''پلیز آگے سے ہٹیے''۔ اس نے شرم سے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''تمہاری اس درخواست پر ہمدردانہ غور کرتے ہوئے ہٹ رہا ہوں۔ جاؤ معصوم لڑکی، معاف کیا۔ اب اس خوشی میں کھانا کھلوا دو۔ میں آتا ہوں چینج کر کے''۔

وہ یہ کہہ کر پیچھے ہٹ گیا اور وہ موقع غنیمت جان کر تیزی سے باہر بھاگی۔ وہ ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد کھانے کی میز پر آیا۔ چکن کڑاہی، چپاتیاں، سلاد اور پانی سے بھرا جگ اور گلاس میز پر رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ''بسم اللہ'' پڑھ کر سالن والا ڈونگا اٹھایا، چکن کڑاہی چمچ سے اپنی پلیٹ میں نکال کر ڈونگا واپس رکھ دیا، سلاد لیا اور پھر ہاٹ پاٹ میں سے دسترخوان کھول کر چپاتی نکالی جو عینی نے پکائی تھی۔ اس کی شکل وصورت ہی بتا رہی تھی کہ یہ کارگزاری عینی ہی کی ہوسکتی ہے۔ علی نے پہلے چپاتی کو دیکھا۔ اس کے بعد عینی کے چہرے کو جیسے ان دونوں میں کوئی مماثلت تلاش کر رہا ہو۔ عینی محجوب سی ہو کر نظریں جھکا گئی تو وہ مسکراتے ہوئے بولا:

''یہ چپاتی تم نے ہی پکائی ہے نا''۔

''جی'' وہ آہستہ سے بولی۔ تو اس نے نوالہ توڑتے ہوئے کہا:

''اچھی کوشش ہے، پریکٹس کرتی رہو، ایک دن ایکسپرٹ ہو جاؤ گی۔ واہ بھئی چکن کڑاہی تو بہت لذیذ ہے''۔ علی نے نوالہ چباتے ہوئے ایمانداری سے تعریف کی تو وہ جو کنفیوز سی اسے دیکھ رہی تھی، تعریف سن کر مطمئن ہوگئی۔

"پہلی کوشش ہی اتنی مزیدار ہے، تم تو دنوں میں کوکنگ سیکھ سکتی ہو۔" علی نے دوسرا نوالہ کھاتے ہوئے کہا تو وہ اس کی تعریف پر کھل اٹھی، بولی کچھ نہیں۔ بس خاموشی سے اسے کھانا کھاتے ہوئے دیکھے جا رہی تھی۔ خود کھانا نہیں کھا رہی تھی۔

"تم کھانا کیوں نہیں کھا رہیں؟" علی نے اسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا دیکھ کر پوچھا۔

"پہلے آپ کھالیں، میں بعد میں کھالوں گی"۔

"بعد میں کیوں؟" وہ چکن پیس توڑتے ہوئے بولا "کہیں اس کھانے میں تم نے زہر تو نہیں ملا دیا"۔

"آپ ایسی باتیں کیسے سوچ لیتے ہیں اور پھر کہہ بھی دیتے ہیں؟" وہ تڑپ کر تاسف بھرے لہجے میں بولی:

"تمہاری معصوم اور سہمی ہوئی صورت دیکھ کر ایسی باتیں خود بخود ہونٹوں سے پھسل جاتی ہیں۔ بہرحال چکن بہت لذیذ پکایا ہے تم نے ویل ڈن۔ چپاتی بھی سیکھ جاؤ گی۔" اس نے مزے سے کھانا کھاتے ہوئے کہا تو وہ چپاتی کی شکل دیکھ کر شرمندہ ہوگئی۔

"آپ یہ چپاتی لے لیجیے"۔ اس نے نسرین کی چپاتی پاٹ میں رکھے دستر خوان میں سے نکال کر اس کی پلیٹ میں رکھ دی۔

"اس چپاتی میں کوئی خاص بات ہے؟" علی نے اس کے چہرے کو دیکھا۔

"یہ نسرین نے پکائی ہے۔ میں نے اس لیے پکوائی تھی کہ آپ کو میرے ہاتھ کی پکی چپاتی پسند نہیں آئے گی تو آپ یہ تو کھالیں گے۔" اس نے صاف گوئی سے وضاحت کی تو وہ مسکرا دیا۔

"پاگل کہیں کی، ایسا کیوں سوچا تم نے۔ میں تمہارے ہاتھ کی پکی چپاتی ہی کھاؤں گا۔ آخر تم نے اتنی محنت اور محبت سے میرے لیے بنائی ہے" علی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور بہت پیار بھرے لہجے میں کہا تو اس کی آنکھوں میں اس

کی بے پناہ محبت سمٹ آئی۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکال لیا اور گلاس میں پانی انڈیلنے لگی۔ وہ مسکراتے ہوئے دوبارہ کھانا کھانے لگا۔ اس نے پانی سے بھرا گلاس اس کے سامنے رکھ دیا اور خود بھی کھانے لگی۔

"سویٹ ڈش نہیں بنائی تم نے۔" علی نے پانی پیتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں"۔ وہ شرمندگی سے بولی۔

"چلو کوئی بات نہیں، سویٹ ڈش کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ اتنا لذیذ چکن کڑاہی کھا کر مزہ آ گیا۔ تمہارے ہاتھ نہ صرف خوبصورت ہیں بلکہ خوش ذائقہ بھی ہیں۔ اس عمدہ کھانے کا شکریہ، تم نے گرمی میں بہت محنت کی۔ اب سویٹ ڈش میں تمہیں کھلاؤں گا لیکن شام کو ابھی تو باہر بہت دھوپ ہے"۔

"تو باہر کی دھوپ سے سویٹ ڈش کا کیا تعلق ہے؟" عینی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تعلق ہے اور وہ یہ کہ آئس کریم باہر سے ملے گی جسے خریدنے اور کھانے کے لیے ہمیں باہر تو جانا ہی ہوگا نا۔ شام کو ہم باہر گھومنے چلیں گے۔ ادھر میز پر ایک شاپنگ بیگ رکھا ہے۔ اس میں تمہارے لیے چند ڈریسز ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک تم شام کو پہن لینا۔ اور ہاں کہیں میں زبردستی تو نہیں کروں گا تم پر۔ آئس کریم پسند ہے تمہیں؟"

"جی بہت پسند ہے"۔ عینی نے جواب دیا۔

"پہلے بتایا ہوتا تو میں روز شام کو تمہیں آئس کریم کھلانے لے جاتا۔ خیر اب بھی دیر نہیں ہوئی۔ تم کھانا کھا کر کمرے میں آ جانا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا اور کرسی کھسکا کر اٹھ گیا اس کے جانے کے بعد اس نے کھانا کھایا تو نسرین نے برتن سمیٹ لیے۔ وہ لاؤنج میں ہی بیٹھ گئی اور علی کے لائے ہوئے کپڑے دیکھنے لگی۔ چار بہت ہی دیدہ زیب رنگوں کے سوتی ریڈی میڈ سوٹ تھے۔ اسے بہت پسند آئے۔ وہ شام کے لیے ایک ڈریس کا انتخاب کرنے کے بعد وہیں صوفے پر لیٹ گئی اور لیٹے

لیٹے اسے نیند بھی آ گئی۔

نسرین کچن میں موجود تھی اور ہفتے کے لیے مختلف سالن پکا کر فریزر میں رکھ رہی تھی۔ اسے اپنی بھانجی کی شادی میں شرکت کے لیے جانا تھا۔ وہ ساری دوپہر کچن میں مصروف رہی۔ شام کو عصر کی اذان کے وقت عینی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے وضو کر کے نماز ادا کی اور بیڈ روم میں آئی تو علی کو محوِ خواب پایا۔ اس نے بیڈ کے قریب آ کر اسے آواز دی:

''علی اٹھیے، نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ علی''

''کیا ہے بھئی، اس وقت کیا ہوا ہے؟'' وہ آنکھیں بند کیے اسی کے الفاظ دہرا رہا تھا۔

''نمازِ عصر کا وقت ہوا ہے، اٹھیے وضو کر کے نماز ادا کیجیے''۔ اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو علی نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور ایک دم یاد آنے پر بولا:

''تو تم اب آئی ہو کمرے میں، میں نے کیا کہا تھا تم سے کہ کھانا کھا کر کمرے میں آ جانا۔ تم اس وقت سے کھانا ہی کھا رہی تھیں اب تک؟''

''نن ...... نہیں۔ وہ مجھے صوفے پر ہی نیند آ گئی تھی۔'' وہ اس کے غصے سے گھبرا کر بولی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور سائیڈ ٹیبل پر رکھی اپنی ریسٹ واچ اٹھا کر ٹائم دیکھا اور ریسٹ واچ واپس وہیں رکھ دی۔

''تم نے نماز پڑھ لی''۔ اس نے بیڈ سے اترتے ہوئے پوچھا۔

''جی پڑھ لی''۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے، تم تیار ہو جاؤ، میں نماز پڑھ لوں۔ اس کے بعد ہم باہر آئس کریم کھانے چلیں گے''۔

وہ نرم لہجے میں کہہ کر واش روم میں چلا گیا اور عینی نے سکون کا سانس لیا اور ڈریسر والا شاپنگ بیگ اٹھا لائی۔ منتخب کردہ لباس پہن لیا۔ بالوں کو ہیئر بینڈ میں

مقید کر لیا، پرفیوم چھڑکا۔ سفید، سبز اور نارنجی رنگ کے سوٹ میں وہ بہت نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ علی نماز پڑھ کر آیا تو ایک لمحے کو اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ سادگی میں بھی قیامت خیز حسن لیے کھڑی تھی وہ۔ علی نے بڑی مشکل سے نظریں اس کے چہرے سے ہٹائیں اور رسٹ واچ کلائی پر باندھ کر موٹر بائیک کی چابی اٹھا لی۔

''آؤ چلیں عینی!'' علی نے کہا۔ وہ اس کے ساتھ باہر آ گئی۔

دوپٹہ سر پر اس طرح اوڑھ لیا کہ وہ تقریباً چھپ گئی تھی اس میں۔ علی کو اس کا یوں خود کو سمیٹنا بہت اچھا لگا۔ اس نے بائیک اسٹارٹ کر دی اور وہ اس کے پیچھے بیٹھ گئی اور بائیک کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ علی نے مسکراتے ہوئے بائیک آگے بڑھا دی۔

آئس کریم پارلر میں دونوں نے اپنی اپنی پسند کے فلیور کا آرڈر دیا، ویٹر آئس کریم لے کر آیا، دونوں یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان دونوں کی پسند ایک ہی تھی۔ پستہ اور بادام کی آئس کریم۔ خالص دودھ اور مکھن سے بنی، میووں سے ٹھنڈی ٹھار آئس کریم، دونوں نے بہت مزے لے لے کر کھائی۔

''تم اگر یونہی میرے ساتھ رہو گی نا تو تمہاری اور میری پسند اسی طرح ہر معاملے میں ایک ہو جائے گی۔ اب اگر آج ہم آئس کریم کھانے نہ آتے تو ہمیں ایک دوسرے کی پسند کا کیسے پتا چلتا کہ حیرت انگیز طور پر ہماری پسند ایک ہی ہے''۔

علی نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا تو مسکراہٹ کا ہلکا سا عکس اس کے ہونٹوں پر آتے آتے ایک دم غائب ہو گیا۔ زاہد قریشی اپنی فیملی کے ساتھ وہاں موجود تھا اور مسلسل اسے گھور رہا تھا۔ اس کے دیکھنے پر بڑی خباثت سے مسکرا رہا تھا۔

''علی چلیں۔'' وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ علی نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو وہ اس کی اس جلد بازی کا سبب سمجھ گیا اور ویٹر کا انتظار کیے بغیر بل ادا کرنے کے لیے خود ہی کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ زاہد قریشی اسے اکیلا پا کر فوراً ہی اس کے پاس چلا آیا اور بہت عامیانہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔''

''ہیلو عینی ڈارلنگ!''

''ہیلو انکل۔'' عینی نے اچٹتی نگاہ اس پر ڈالی اور پھر علی کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیا اکیلی آئی ہو یہاں؟'' وہ علی کو اس کے ساتھ دیکھ چکا تھا پھر بھی بات کرنے کے لیے پوچھ رہا تھا۔

''نہیں، میرے شوہر بھی میرے ساتھ ہیں''۔ اس نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

''اچھا، لیکن باہر کوئی گاڑی وغیرہ تو نہیں کھڑی۔'' زاہد قریشی نے شیشے سے باہر کار پارکنگ ایریا میں اپنی دو گاڑیوں کے علاوہ تیسری گاڑی کھڑی نہ پا کر کہا:

''ہماری گاڑی اس طرف کھڑی ہے''۔ عینی نے دوسری جانب اشارہ کیا۔

''اوہ یعنی موٹر بائیک چہ چہ چہ۔ عینی ڈارلنگ! موٹر بائیک کی سواری تمہارے شایانِ شان نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ چلو میں اپنی گاڑی میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا بلکہ تمہیں نئی گاڑی خرید کر تحفے کے طور پر دوں گا۔'' زاہد قریشی اپنی عمر اور حیثیت، مقام اور نام کا لحاظ کیے بغیر عامیانہ لہجے میں بولا۔

''تھینک یو، مجھے ہرایرے غیرے سے بات کرنا اور تحفے لینا پسند نہیں ہے۔'' عینی نے سخت لہجے میں کہا اور تیزی سے واپس پلٹی تو علی کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ سب کچھ سن چکا تھا۔ زاہد قریشی کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولا:

''مسٹر زاہد، آپ کو اپنے نام کا تو کچھ پاس رکھنا چاہیے تھا۔ دوسروں کی بہن، بیٹی پر میلی نظریں جماتے ہوئے شرم نہیں آتی آپ کو''۔

''دادا ابو چلیں آئس کریم کھلائیں نا''۔ ایک پانچ سالہ بچہ زاہد قریشی کا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولا تو وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا۔

''اپنے اس پوتے کا ہی کچھ خیال کر لیجیے۔ اس پر کیا اثر پڑے گا آپ کی اس آوارہ مزاجی کا۔ اپنا ذہن صاف کر لیجیے مسٹر زاہد ورنہ مجھے آپ جیسوں کا ذہن اور مزاج درست کرنا خوب آتا ہے۔'' علی نے سخت اور غصیلے لہجے میں کہا۔

''علی چلیں پلیز۔'' عینی نے اس کا بازو پکڑ کر پریشان کن لہجے میں کہا۔ اس کے غصے سے وہ اچھی طرح واقف جو تھی۔ اس لیے یہاں سب کے سامنے تماشا بننا نہیں چاہتی تھی۔

''چلو بیٹا''۔ زاہد قریشی کھسیانا ہو کر اپنے پوتے کا ہاتھ تھامے اپنی ٹیبل کی طرف بڑھ گیا، مگر نظریں اب بھی عینی کے چہرے پر جمی تھیں۔

''چلیں نا علی، یہ کمینہ مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا ہے''۔ وہ سخت الجھن میں بولی۔

''گھور گھور کر تو میں بھی تمہیں دیکھتا ہوں۔ اب تم مجھے بھی اس خطاب سے نوازو گی کیا؟'' وہ اس کے ساتھ باہر آتے ہوئے بولا۔

''پلیز علی، آپ کا اس کمینے سے کیا مقابلہ، بہت ہی گھٹیا آدمی ہے وہ''۔ وہ اس کے پیچھے موٹر بائیک پر بیٹھتے ہوئے بولی اس نے مسکراتے ہوئے موٹر بائیک اسٹارٹ کر دی۔

''لیکن وہ گھٹیا اور کمینہ آدمی تم پر عاشق ہو چکا ہے اس عمر میں بھی''۔ علی نے بائیک سڑک پر دوڑاتے ہوئے کہا۔

''علی بس کیجیے'' وہ غصیلے لہجے میں بولی۔ ''میں اس کے متعلق کوئی بات سننا اور کہنا نہیں چاہتی۔ پتا نہیں کہاں سے نازل ہو گیا تھا اچانک میرا بس چلے تو میں اس کا منہ نوچ لوں۔''

''ارے ارے بس عینی ڈیئر۔'' علی کو ہنسی آ گئی تھی اس کے اس انداز اور ردعمل پر۔

☆☆☆

جولائی کا مہینہ تھا، گرمی، حبس اور تپش نے چرند پرند، انسان، حیوان سب کو اپنی لپیٹ میں لے کر نڈھال کر رکھا تھا۔ علی ائیر کنڈیشنڈ روم میں بیٹھا آفس کا کام کر رہا تھا اس کے باوجود اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی کام ختم کیا اور رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ کوئی اہم کام تھا نہیں۔ چھٹی کے دن

بھی وہ آفس کے کام میں لگا رہا تھا۔ یاسین بیگ نے اسے اگلے روز چھٹی کرنے کی اجازت دے دی تھی لیکن وہ ضروری کام نمٹانے کے لیے آفس آ گیا تھا۔ اب جبکہ فارغ ہو چکا تھا تو اس نے گھر جانے میں ہی سکون محسوس کیا، پھر وہاں اسے عینی کی موجودگی کا احساس بھی خوشی اور راحت بخشتا تھا۔ وہ چپڑاسی کو آفس بند کرنے کا کہہ کر بائیک پر سوار ہوا اور سیدھا گھر کی طرف بڑھ گیا۔ تیز دھوپ نے اسے پسینے میں شرابور کر دیا تھا۔ فلیٹ کی ایک چابی اس کے پاس ہوتی تھی، دوسری چابی اس نے عینی کو دے دی تھی۔ اس نے آرام سے دروازے کا لاک کھولا۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اسے گھر میں غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا۔ نسرین اور عینی بھی کہیں دکھائی نہ دیں مکمل سناٹا راج کر رہا تھا گھر میں۔ وہ رومال سے چہرہ صاف کرتا ہوا کچن میں آ گیا۔ فریج سے پانی کی بوتل نکال کر پانی پیا۔ برابر والے بیڈ روم میں جھانکا، عینی وہاں بھی نہیں تھی۔ تو وہ وہیں کھڑے سوچنے لگا۔

”عینی اپنے میکے تو نہیں چلی گئی۔ لیکن مجھے بتائے بغیر، مجھ سے پوچھے بغیر وہ جا تو نہیں سکتی۔ اس کا بیچاری کو تو میں نے اتنا ڈرا دیا ہے خود سے کہ وہ تو مجھے دیکھتے ہی نروس ہو جاتی ہے، ہاتھ کانپنے لگتے ہیں اس معصوم کے۔ اصل مشکل میں تو وہ ہے۔ اپنے پیا کا حکم مانے یا میری خواہش پوری کرے۔ سچ کہہ رہی تھی وہ۔ ہم دونوں کے بیچ رولنگ اسٹون بن کر رہ گئی ہے لیکن نہیں اسٹون تو میں اور اس کے پیا ہیں۔ وہ تو گلاب کا پھول ہے اور کیسے کیسے اس کے جذبات اور احساسات اس امتحان میں مسلے جا رہے ہیں۔ کتنی پریشان رہتی ہے وہ مجھے یاسین بیگ صاحب سے بات کرنا ہی ہوگی۔ میں اب عینی کو مزید اپنے سے خوفزدہ نہیں رکھ سکتا۔ وہ میری ہے اور مجھی سے خوفزدہ رہتی ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ مجھے ہی کچھ کرنا ہے، اس معصوم کی کون سنے گا“۔ وہ سوچتے سوچتے بیڈ روم میں داخل ہوا اور اندر کا منظر دیکھ کر اس کے دل کے تار جھنجھنا اٹھے۔ آنکھیں حیرت سے مزید چمکدار ہو گئیں۔ اس نے آہستگی سے دروازہ بند کر دیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا بیڈ کے قریب آ کھڑا ہوا۔

عینی نے ہلکے نیلے رنگ کی سلیولیس قمیض اور ٹراؤزر نما شلوار زیب تن کی ہوئی تھی۔ جارجٹ کا دوپٹہ بے نیازی سے بیڈ پر ایک طرف پڑا تھا۔ بالوں کا اس نے بہت اسٹائلش جوڑا بنایا ہوا تھا اور اس کے کٹے ہوئے بال اس کے چہرے کے حسن کو بڑے ناز کے ساتھ وم رہے تھے۔ میک اپ نام کی کوئی چیز اس کے چہرے پر موجود نہیں تھی۔ اس کے گورے گورے گداز پاؤں ٹخنوں تک نظر آ رہے تھے۔ اس کے سڈول بازو بے تحاشا حسن کی نمائش کر رہے تھے۔ علی کے اندر جذبات کا تلاطم بپھر گیا۔ اس نے اسے اس سے پہلے اتنا مکمل کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کے حسن و دلکش کے جلوؤں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ جو کانوں پر ہیڈ فون لگائے میوزک سننے اور ہاتھوں میں میگزین تھامے محویت سے پڑھنے میں مگن تھی۔ اس کی آمد سے بے خبر ہی تو تھی۔ علی نے ایک دن اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے ہیڈ فون اس کے کانوں سے ہٹایا تو وہ اس اچانک صورتحال پر ٹپٹا کر چیخ اٹھی۔ میگزین اس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اپنے اس حلیے پر اسے سخت ندامت محسوس ہونے لگی۔ شدید گرمی سے گھبرا کر اس نے یہ لباس پہنا تھا۔ وہ تو اس کی عدم موجودگی میں انجوائے کرنا چاہتی تھی وہ یوں اچانک اور بے وقت گھر آ جائے گا، اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اس علم ہوتا تو وہ یہ لباس ہرگز نہ پہنتی مگر اب تو وہ پھنس چکی تھی۔ علی نے ہیڈ فون ایک طرف رکھ کر اپنے ہاتھ اس کے دائیں بائیں رکھ لیے۔

”کیا اتنی خوفناک ہے میری صورت جو مجھے دیکھتے ہی چیخ اٹھتی ہو؟“ علی نے پوچھا۔

”نن..... نہیں..... وہ ہیں..... ہاتھ تو ہٹائیے“۔ اس نے شرم اور بوکھلاہٹ سے کہتے ہوئے نظروں کے ساتھ ساتھ اپنا سر بھی جھکا لیا۔ علی اس کی بات سمجھ گیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

”بہت حسین لگ رہی ہو اس روپ میں، سچ دل پر بجلیاں گرا رہی ہو“۔

”آ..... آپ..... اتنی جلدی کیسے آ گئے۔ آپ نے تو شام میں آنا تھا۔“ وہ

بہت پزل تھی۔

"تمہارا یہ روپ دیکھنے کے لیے جلدی گھر آ گیا ہوں۔ تم کہتی ہو تو واپس چلا جاتا ہوں"۔ وہ شوخ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اب کیا فائدہ اب تو سب کچھ دیکھ لیا ہے"۔ اس نے خود کلامی کی جو اس نے ہمیشہ کی طرح بہت محظوظ ہو کر سنی اور ہنس کر شرارت بھرے لہجے میں بولا:

"ابھی سب کچھ کہاں دیکھا ہے، ابھی تو بہت کچھ دیکھنا باقی ہے"۔

"اف"۔ وہ شرم و حیا سے کٹ کر رہ گئی۔ اس کی قربت کے ساتھ لفظوں اور لہجے کی شرارت اور شوخی نے اسے مزید حواس باختہ کرنا شروع کر دیا۔

اس نے بیڈ پر پڑے اپنے دوپٹے کی طرف دیکھا اور بچوں کی طرح چوری چوری آہستہ سے اپنا ہاتھ بڑھانے لگی جو نہی اس کا ہاتھ دوپٹے کے سرے پر پہنچا، علی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ایک کرنٹ سا اس کے پورے وجود میں سرایت کر گیا۔ ملتجی نظروں سے اسے دیکھا جو آنکھوں میں زمانے بھر کی شوخیاں سجائے اسے دیکھ رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے بولا:

"یہ تمہارے حسن کی کشش ہی تھی جو مجھے اس وقت آفس سے گھر کھینچ لائی ہے"۔

"دوپٹہ دے دیں پلیز"۔ اس نے دبی دبی آواز میں کہا تو وہ جان بوجھ کر اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھنے لگا: "یہ نسرین کہاں ہے، باہر تو نہیں دکھائی دی؟"

"وہ اپنی بھانجی کی شادی میں شرکت کے لیے گئی ہے ایک ہفتے کی چھٹی پر۔ آج کل اس وقت گرمی زیادہ ہو جاتی ہے تو — اس لیے وہ صبح آپ کے آفس جانے کے بعد ہی چلی گئی تھی۔" عینی نے تفصیل سے بتایا تو وہ مسکراتے، شوخ لہجے میں بولا:

"چلو اچھا ہوا وہ بھی کچھ دن انجوائے کر لے گی اور ادھر ہم بھی"۔

"میں آپ کے لیے ٹھنڈا پانی لے کر آتی ہوں، آپ دھوپ میں سے آئے ہیں، آپ کو پیاس لگ رہی ہوگی۔" عینی اس کے ادھورے جملے پر شرم سے بے حال ہوتے ہوئے جانے کا بہانہ بناتے ہوئے بولی۔ اس کے ہاتھ دونوں جانب رکھے تھے۔ اس لیے اس کے لیے اٹھنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ اس کی حالت سے جی جان سے محظوظ ہو رہا تھا۔ ہاں۔ پیاس تو لگ رہی ہے بلکہ بہت بڑھ گئی ہے اور تمہیں اس حلیے میں دیکھ کر احساس ہو رہا ہے کہ واقعی آج گرمی بہت زیادہ ہے، ہے نا"۔

علی نے اس کے بے لباس بازوؤں کو دیکھتے ہوئے شوخ و شریر لہجے میں کہا تو وہ مزید شرمسار ہو گئی۔ علی کے کپڑوں سے پسینے اور پرفیوم کی ملی جلی مہک اٹھ رہی تھی جو اس کے اندر ہلچل مچا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی، ندامت کا رنگ، پسینے کے شبنمی قطرے ایک ساتھ نمودار ہو گئے تھے۔ اس نے شرم سے اپنے بازو سینے پر باندھ لیے اور سکڑ کر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ علی اس کے ہر ہر انداز پر نثار ہو رہا تھا اور وہ اتنا ہی شرم و حیا سے مٹی جا رہی تھی۔ علی کو آخر اس پر رحم آ ہی گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ ہٹا لیے اور سنجیدہ لہجے میں حکم صادر کیا۔

"اپنے پیا کو بتا دینا کہ ہم ہنی مون کے لیے جا رہے ہیں، بہت صبر کر لیا ہے اب ناممکن ہے اور ہاں میں نہانے جا رہا ہوں۔ میری واپسی تک میز پر سکن جبین سے بھرا جگ رکھا ہونا چاہیے"۔

"جی اچھا۔" اس نے نظریں جھکائے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے اس پر ایک بھرپور نگاہ ڈال کر واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے فوراً دوپٹہ اٹھایا اور شانوں پر پھیلا لیا۔ اور بیڈ سے اتنی بوکھلاہٹ اور تیزی سے نیچے اتری کہ اس کا پاؤں مڑ گیا اور وہ لڑکھڑا گئی۔

"سنبھل کر میری جان!" علی نے پلٹ کر اسے بازو سے تھام لیا اور گرنے سے بچا لیا۔ قدم تو میرے ڈگمگانے چاہئیں، تم کیوں نروس ہو رہی ہو؟" وہ شوخی سے بولا۔ وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ جاؤ شاباش سکن جبین بنا کر لاؤ۔ بنا لو گی نا۔"

''جی۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''تو جاؤ میرے واپس آنے سے پہلے جگ میز پر موجود ہونا چاہیے ورنہ......''
اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ عینی نے ہراساں ہو کر اسے دیکھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ وہ سہمی ہوئی اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ جبھی تو وہ اسے اس انداز میں ڈیل کرتا تھا۔ وہ اس کے واش روم میں جاتے ہی وارڈ روب کی طرف بڑھ گئی۔

''اف کیا کروں؟ پہلے کپڑے تبدیل کروں کہ سکن جبین بناؤں۔ دیر ہو گئی تو علی غصے ہوں گے۔ علی کی محبت بھی قیامت ہے اور غصہ بھی قیامت، میں تو دونوں کی زد میں آ کر ماری جاتی ہوں۔ پہلے سکن جبین بنالیتی ہوں۔ اس میں دیر لگتی ہے۔ کپڑے تو دو منٹ میں تبدیل کرلوں گی۔'' وہ سوچتے ہوئے وارڈ روب بند کر کے کچن کی طرف بھاگی۔ فریج سے لیموں نکالے، چینی گھولی، لیموں کا رس بڑی محنت اور مشکل سے نکال پائی، نمک ڈالا، روح افزا ملا کر پانی ڈالنے لگی اور ساتھ ہی برف کی کیوبز نکال کر جگ میں ڈال دیں۔ ہاتھوں کے ساتھ ساتھ اس کی سوچ کے تار بھی بننے لگے۔ میں علی کے بعد اب کسی اور کی ملکیت نہیں بن سکتی۔ کتنی شرم آئے گی مجھے ایک شخص مجھے اپنی قربت اور محبت سے نوازتا رہے۔ مجھے چھولے اور میں اسے چھوڑ دوں۔ اور بعد میں نہ علی قرار کے ان لمحات کے سحر سے باہر نکل سکیں گے اور نہ ہی میں ان کے لمس کی حدتوں اور شدتوں کو بھلا سکوں گی۔ ایک شخص پر اپنا سب کچھ ظاہر کر کے اس سے منہ موڑ کر کسی دوسرے شخص کے قریب جانا میرے لیے ناممکن ہے۔ علیحدگی کے بعد اگر کبھی علی سے سامنا ہو گیا تو کتنی شرمندگی ہوگی مجھے۔ یہ لمحات ان کے دل و دماغ سے ذہن و نگار سے کبھی مٹ نہیں سکیں گے اور مجھے اپنا آپ ان کے سامنے بے حجاب محسوس ہوگا۔ نہیں۔ میں علی کے علاوہ کسی دوسرے مرد کی ملکیت کبھی نہیں بنوں گی کسی کو اپنے وجود سے زندگی کی حرارت کشید کرنے نہیں دوں گی۔ اپنا آپ علی کے سوا کسی دوسرے کی سپردگی میں کبھی نہیں دوں گی۔ کبھی نہیں۔

میں تو علی کو ان کا جائز حق بھی نہیں دے پا رہی۔ ترسا ترسا کر محبت اور قربت کا جام پلانا کتنا مشکل ہے۔ میں اب علی سے الگ نہیں رہ سکتی اور اب تو بات بہت آگے تک چلی گئی ہے۔ اب واپسی ناممکن ہے۔ قطعی ناممکن۔ اب میں صرف علی کی بیوی ہوں۔ نہ مجھے علی سے طلاق لینا ہے اور نہ ہی کسی دوسرے مرد کی بیوی بننا ہے۔ نو نیور پیا۔''

اس نے سوچے سوچے ایک گلاس سکن جبین خود پی لی۔ پھر جگ میں اور برف ڈالی۔ گلاس اور جگ ٹرے میں رکھ کر کمرے میں لے آئی۔ علی ابھی واش روم سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ دی اور تیزی سے وارڈ روب کی طرف لپکی۔

''تھینکس گاڈ! علی نہیں آئے، میں جلدی سے کپڑے تبدیل کرلوں۔ اس نے وارڈ روب کھولی اور کپڑے دیکھنے لگی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون سے کپڑے پہنے۔ مارے گھبراہٹ کے اس کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔

''ہائے اللہ! کون سے کپڑے پہنوں، ابھی علی باہر آ جائیں گے اور......''

''اور تمہاری جان عذاب میں آ جائے گی۔'' علی نجانے کب اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا تو وہ ڈر کر مڑی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی نظر میں اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ اس نے فوراً دوپٹہ ٹھیک کرلیا۔

'میں نے سکن جبین بنا دی ہے، جگ گلاس میز پر رکھا ہے، پی لیجیے؟'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''پی لوں گا، اتنی جلدی بھی کیا ہے؟'' علی نے وارڈ روب کا دروازہ بند کر دیا۔

''وہ...... میں نے کپڑے لینے تھے۔'' وہ شرم اور گھبراہٹ میں انگلیاں آپس میں پیوست کرتے ہوئے بولی۔ وہ اس کی بات خوب سمجھ رہا تھا۔ انجان بنتے ہوئے پوچھا:

"ان کپڑوں کو کیا ہے؟"

"یہ ٹھیک نہیں ہیں۔" وہ شرمندگی سے بولی تو اس نے اسے پکڑ کر خود سے قریب کرلیا ہلکے بادامی رنگ کے شلوار قمیض میں وہ بے حد جچ رہا تھا۔ گریبان کے اوپر کے دو بٹن کھلے ہوئے تھے اور اس کے کشادہ سینے کے بال اس میں سے جھانک رہے تھے۔ چہرہ اور بال بھیگے بھیگے سے تھے۔ اس کے بدن کی خوشبو، صابن کی بھینی بھینی مہک اور اس کی قربت اور محبت کی پیاس نے عینی کو پاگل کردیا۔ وہ محبت اور بے بسی کے عالم میں اسے دیکھے جارہی تھی۔

"یہ کپڑے ٹھیک نہیں ہیں تو تم نے پہنے کیوں تھے۔" وہ اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"گرمی بہت تھی اور میں — گھر میں اکیلی بھی تھی اس لیے پہن لیے۔ پہلی بار پہنے تھے اور —"

"اور پکڑی گئی ہو، ہے نا"۔ وہ شوخی سے ہنسا۔

"جی۔" وہ شرم سے لال ہوگئی۔

"اب تو پکڑی گئی ہو اور بقول تمہارے اب تو میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے نا تو چیخ کرنے کا کیا فائدہ۔ کون سا یہاں کوئی دیکھ رہا ہے۔"

"آپ تو۔" وہ اتنا ہی بول پائی اور وہ ہنس پڑا اور پھر بولا:

"میں تو تمہارا شوہر ہوں، کوئی غیر تو نہیں ہوں، مجھ سے کیسا پردہ اور کیسی شرم۔ آؤ بیٹھو ادھر۔" وہ اسے بیڈ تک لے آیا اور بیڈ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔

علی نے سکنجبین کا گلاس بھر کر بڑے مزے سے پی لیا اور دوسرا گلاس بھر کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"میں نے پی لی ہے، آپ پئیں۔" عینی نے آہستہ سے کہا اسے اپنے حلیے کی وجہ سے اس سے نظریں ملاتے ہوئے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

"ایک گھونٹ ہی پی لو، تمہارا حلق خشک ہو رہا ہے۔" علی نے مسکراتے ہوئے

کہا۔ اس نے بیچ بیچ ایک گھونٹ پی کر گلاس اسے پکڑا دیا تو وہ ہنس پڑا۔ وہ مزید نروس ہوگئی۔

"عینی میں تمہارا شوہر ہوں۔" وہ نرمی سے بولا۔ گلاس میز پر رکھ دیا۔

بے وقوف لڑکی، کتنی بار سمجھاؤں تمہیں کہ اب تمہارے گریز اور احتجاج کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں نے کہا جو ہے کہ میں تمہارے پپا سے بات کرلوں گا۔"

"کب بات کرلیں گے، جب کچھ ہو جائے گا؟" وہ بیڈ پر آرام سے بیٹھتی ہوئی بولی۔

"اب اس سے زیادہ اور کیا ہوگا؟" علی نے یہ کہتے ہوئے اسے اپنی محبت بھری بانہوں میں سمیٹ لیا اور اس پر اپنی بے قراری عیاں کردی۔

"مت کریں علی —" عینی کی مزاحمت صرف لفظوں تک ہی محدود رہی۔ یہ واجبی سی مزاحمت دراصل خود سپردگی کی ایک شکل تھی جو بڑھے ہوئے طوفانوں کے سامنے بند نہیں باندھا کرتی بلکہ ان کے جوش و غضب کو اور ابھارا کرتی ہے۔ علی مضبوط اور بااختیار مرد تھا اور وہ نرم و نازک سی چھوٹی سی لڑکی جو اس کی محبتوں کے آگے مجبوری اور گریز کے بند باندھتے باندھتے تھک گئی تھی اور آج علی کی محبتوں اور شدتوں نے وہ سارے بند ایک لمحے میں توڑ دیئے تھے۔ حیا کے لبادے میں لپٹی سمٹی، وہ اس سے نظریں ملانے کی تاب نہیں لا رہی تھی۔ اور وہ اسے اب اور زیادہ اپنی نظروں کے حصار میں لیے ہوئے تھا۔ اس کی حالت پر اسے بہت پیار آ رہا تھا۔

رات کو مما کا فون آ گیا، وہ اسے گھر آنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔

"آؤں گی مما، ذرا انہیں فراغت مل جائے"۔ اس نے مدھم آواز میں کہا۔ علی کمرے میں تھا اور وہ لاؤنج میں فون سن رہی تھی۔ اس کی پشت دروازے کی جانب تھی اور علی اچانک ہی باہر نکلا تھا۔ اسے فون پر بات کرتے دیکھ کر خاموشی سے وہیں کھڑا ہو گیا۔

"میں گاڑی بھیج دیتی ہوں، تم ڈرائیور کے ساتھ آ جاؤ۔" مسز یاسین بیگ

نے کہا۔

"نہیں مما میں علی کی اجازت کے بغیر نہیں آ سکتی۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"علی کی اجازت کی کیا ضرورت ہے تمہیں؟" وہ تیز لہجے میں بولیں" وہ عمر بھر کے لیے تو تمہارا حاکم نہیں بنایا گیا۔"

"کچھ بھی سہی مما وہ میرے شوہر تو ہیں نا۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "آپ نے اور پپا نے دو مہینے کی میعاد مقرر کر کے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ آپ لوگ مجھے اس کمینے زاہد قریشی کے پلے ہی باندھ دیتے۔ کم از کم میں یوں علی کی گنہگار تو نہ بنتی۔ پیاسے کو سمندر کے پاس بھیج دیا جائے اور اس پر ساتھ ہی یہ پابندی بھی عائد کر دی جائے کہ سمندر کا ایک قطرہ بھی اس پر حرام ہے، وہ اس سمندر سے اپنی پیاس نہیں بجھا سکتا۔ یہ تو ظلم ہے، مما بہت کڑا امتحان ہے اور ناممکن ہے۔ ایسا کیسے ممکن ہے کہ سمندر سامنے ہو اور ساحل پر کھڑا شخص پیاسا رہ جائے اونو مما اٹس امپاسبل۔"

"تو کیا تم علی کو پسند کرنے لگی ہو؟" مسز یاسین بیگ نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"جی مما، بلکہ اس سے بھی زیادہ، یہ تو بہت چھوٹا سا لفظ ہے۔" وہ بڑے جذبے سے بولی۔ علی تو خوشی سے کھل کھل گیا۔ وہ اس کے دل میں گھر کر چکا ہے۔ یہ جاننا اس کے لیے فرحت آگیں احساس تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے سے سب کچھ شیئر کرتے رہے ہو۔" وہ غصے سے بولیں۔

"مما اب میں تھک چکی ہوں، علی ہنی مون کے لیے جانا چاہتے ہیں۔"

"واٹ؟" وہ غصے سے بلند آواز میں بولیں۔ "دماغ تو خراب نہیں ہو گیا علی کا؟"

"علی کا تو مجھے نہیں پتا لیکن ممکن میرا دماغ ضرور خراب ہو جائے گا۔ پپا نے جلد

بازی میں، چند منٹوں میں میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کر دیا اور وہ بھی عارضی طور پر۔ بہت غلط کیا ہے پپا نے۔ بھلا کوئی باپ اپنی بیٹی کی عارضی شادی بھی کراتا ہے۔ کرانی ہی تھی تو صرف نکاح کرایا ہوتا، بھیج دیا مجھے یہاں۔ آپ لوگ میری رخصتی نہ کرتے تو کیا تھا؟"

"وہ ہماری مجبوری تھی اور اس وقت علی ہر لحاظ سے بہتر تھا۔" مسز یاسین بیگ نے کہا۔

"تو اب علی میں کیا خرابی پیدا ہو گئی ہے جو آپ اس رشتے کو ختم کرنے پر مصر ہیں۔" اس نے سنجیدہ اور پریشان لہجے میں پوچھا۔

"اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔" وہ سنجیدہ لہجے میں بولیں۔ "نہ دوست نہ رشتے دار اور ہمارا اسٹیٹس ایک لاوارث شخص کو اپنا داماد بنانے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ تمہارے پپا کی کمپنی میں ملازم ہے۔ گھر تک تو کمپنی نے اسے دیا ہے۔"

"ان کی محبت کے صلے میں دیا ہے"۔ اس نے علی کا دفاع کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی سہی، تمہیں عاصم سے شادی کرنا ہو گی اور سنو، ہم تمہیں لینے آ رہے ہیں۔ تمہارے پپا عاصم کے آنے کے بعد علی سے خود طلاق نامے پر دستخط کروا لیں گے۔" مسز یاسین بیگ نے نہایت سنجیدہ اور اٹل لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔

"مما پلیز، ہیلو مما، میری بات تو سنیں، میں ایسا نہیں چاہتی، پلیز مما۔" عینی نے بے تابی سے کہا مگر لائن کٹ چکی تھی۔ اس نے ریسور کریڈل پر رکھ دیا اور غصے اور بے بسی سے رو پڑی۔ غصے میں آ کر میز پر زور سے ہاتھ مارا۔ جگ گلاس اور علی کی آفس کی فائلیں دور جا گریں۔

"ارے ارے پاگل ہوئی ہو کیا؟" علی نے آگے بڑھ کر اسے بازوؤں سے پکڑ کر رخ اپنی طرف کیا تو وہ غصیلے لہجے میں بولی۔

"ہاں آپ نے پاگل کر دیا ہے مجھے۔"

"تو کیا برا کیا ہے۔ تم نے بھی تو پاگل کر رکھا ہے مجھے۔" وہ مسکراتے ہوئے

بولا۔

''پپا آپ کا سارا پاگل پن دور کر دیں گے''۔ وہ غصے سے روتے ہوئے بولی۔

''شٹ اپ۔'' علی کو ایک دم ہی غصہ آ گیا۔ سخت لہجے میں بولا۔ ''دیکھ لوں گا میں تمہارے پپا کو، اور تم کو۔ اٹھاؤ یہ سب چیزیں اور میز پر رکھو۔ میری فائلز بھی ترتیب سے سیٹ کر کے رکھو۔ یہ سب تمہارے پپا کا کیا دھرا ہے، اس لیے مجھ پر زیادہ غصہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

''تو آپ مجھ پر غصہ کیوں کرتے ہیں؟'' اس نے ہتھیلیوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''پیار کی بات تم سمجھتی جو نہیں ہو۔''

''پیار سے کب بات کرتے ہیں آپ؟'' اس نے ناراضگی اور شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔ ہر وقت غصے اور رعب سے بات کرتے ہیں، ڈراتے رہتے ہیں مجھے۔''

''تمہیں اگر اب بھی میرے پیار پر اعتبار نہیں ہے تو ایک بار تم پوری طرح سے میری بن کر دیکھو، پھر دیکھنا تمہیں مجھ پر، میرے پیار پر کیسے اعتبار آتا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

اسی وقت ڈور بیل بجی۔ اس نے علی کے چہرے کو دیکھا تو اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

''اس وقت کون آ گیا؟ میں دیکھتا ہوں، تم یہ چیزیں اٹھا کر رکھو، کوئی مہمان آ جائے تو کیا سوچے گا کہ یہ لاؤنج ہے یا کباڑ خانہ؟'' وہ سنجیدگی سے اسے حکم دیتا دروازے کی طرف چلا گیا۔

عینی نے جلدی جلدی چیزیں کارپٹ سے اٹھا کر میز پر رکھیں۔ یہ فائلیں سیٹ کر رہی تھی کہ علی کے ساتھ مما پپا کو آتا دیکھ کر حیران بھی ہوئی اور خوش بھی۔ فائلیں

میز پر چھوڑ کر ان کی طرف لپکی۔

''پپا مما۔'' وہ ان کے بازو سے لگ گئی۔

''کیسی ہے ہماری بیٹی؟'' یاسین بیگ نے اس کے سر پر دست شفقت پھیرا۔

''پہلے جیسی نہیں ہے آپ کی بیٹی۔'' عینی نے علی کی طرف دیکھتے ہوئے پرنم لہجے میں کہا۔

''وہ تو ہم بھی دیکھ رہے ہیں۔'' یاسین بیگ نے عینی کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر علی سے مخاطب ہوئے۔ ''علی تم نے عینی کو ڈانٹا ہے یا مارا ہے؟''

''میں نے عینی کے ساتھ کیا کیا ہے، یہ آپ عینی سے خود کیوں نہیں پوچھ لیتے۔ یہ آپ کے ساتھ ہی تو کھڑی ہے۔'' علی نے اطمینان سے جواب دیا۔

''پپا انہوں نے تو مجھے کچھ نہیں کہا، ڈانٹا اور مارا بھی نہیں ہے۔'' عینی نے اس کی پوزیشن کلیئر کرتے ہوئے کہا۔

''تو تم رو کیوں رہی تھیں؟'' یاسین بیگ نے اس کی روئی روئی آنکھوں کو دیکھا۔

''یہ اپنی مما سے فون پر بات کر رہی تھیں۔ اس کے بعد ہی روئی ہیں۔ آپ آنٹی سے پوچھیے کہ انہوں نے اسے ایسا کیا کہا تھا جو یہ رونے لگی۔'' علی نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا تو عینی نے حیرت سے اسے دیکھا اور سوچا ''تو کیا علی نے ساری باتیں سن لی ہیں۔''

''علی میں تم سے کچھ پوچھنے آیا ہوں۔'' یاسین بیگ نے عینی کو اپنے ساتھ صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''تو پوچھیے سر۔''

''تم عینی کے ساتھ آئس کریم کھانے گئے تھے۔''

''جی گیا تھا۔ میں خود عینی کو اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔'' اس نے صاف گوئی سے بتایا۔

''کیوں؟''

''کیا مطلب کیوں؟'' وہ مسکرایا ''سر آپ اپنی بیوی کو لے کر میرے گھر کیوں آئے ہیں۔ آپ اپنی بیوی کے ساتھ گھر سے باہر کیوں جاتے ہیں؟ کیا میں نے آپ سے کبھی یہ سوال پوچھا؟ سر عینی میری بیوی ہے اور میں اسے لے کر کہیں بھی جاسکتا ہوں۔''

''ہنی مون پر بھی۔'' مسز یاسین بیگ نے کہا۔

''میں آف کورس۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''علی تم ایسا نہیں کرو گے۔ تم نے مجھ سے معاہدہ کیا تھا۔ صرف دو ماہ کے لیے۔'' وہ بولے۔

''سر اول تو میں نے آپ سے کوئی معاہدہ نہیں کیا تھا۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ نے میرے سامنے اپنی مجبوری پیش کی تھی۔ جسے میں نے پوری دیانتداری سے دور کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ معاہدہ اگر ہوا ہے تو میرے اور عینی کے درمیان ہوا ہے، نکاح نامے کی شکل میں۔ یہ تحریری معاہدہ ہے اور اس معاہدے میں کہیں ذکر نہیں تھا کہ یہ رشتہ دو ماہ تک رہے گا، اس کے بعد ختم ہو جائے گا۔ اس معاہدے پر میں آج بھی قائم ہوں۔''

''لیکن اب تمہیں یہ معاہدہ منسوخ کرنا ہوگا۔'' یاسین بیگ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''پپا نہیں پلیز۔'' عینی نے بے قرار ہو کر کہا۔

''تم خاموش رہو، اس نے تمہیں ڈرا دھمکا کر اپنی طرف کر لیا ہے۔'' یاسین بیگ نے اسے سختی سے خاموش کرا دیا۔ اس نے بے بسی سے علی کی طرف دیکھا۔

''سوری سر! میں یہ معاہدہ عمر بھر کے لیے نبھانے کا عہد کر چکا ہوں اور شادی جیسے رشتے چند دنوں کے لیے نہیں جوڑے جاتے۔ یہ عمر بھر کے رشتے ہوتے ہیں۔'' علی نے سنجیدگی سے کہا۔

''لیکن تم نے یہ رشتہ میرے کہنے پر عارضی طور پر قبول کیا تھا۔''

''مگر دل سے قبول کیا تھا اس لیے اس رشتے کی جڑیں میرے دل اور روح تک پھیل چکی ہیں۔ میں یہ رشتہ کسی طور ختم نہیں کر سکتا۔ آپ کوئی اور بات کیجیے سر۔''

''کوئی اور بات یہ ہے کہ تم نے اگر ہماری بیٹی کو ملازمہ بنا کر رکھنا تھا تو ہمیں پہلے بتا دیا ہوتا۔ ہم دو چار ملازم ساتھ بھیج دیتے۔'' یاسین بیگ نے سخت اور طنزیہ لہجے میں کہا۔

''کس نے کہا آپ سے کے میں نے عینی کو ملازمہ بنا کر رکھا ہے؟'' علی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ''ہمیں بتانے والے بہت ہیں۔'' مسز یاسین بیگ نے تیز لہجے میں کہا۔ ''غضب خدا کا ہماری بیٹی نے کبھی کچن کی شکل تک نہیں دیکھی تھی اور تم اس سے کھانے پکوا رہے ہیں۔''

''تو کون سا جرم اور گناہ کر رہا ہوں۔'' علی نے سنجیدہ سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''آنٹی جی سب بیویاں یہ کام کرتی ہیں اور عینی اپنی مرضی سے یہ کام کر رہی ہے، سیکھ رہی ہے۔''

''بہر حال ہم عینی کو لینے آئے ہیں۔ چلو عینی۔'' یاسین بیگ جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

''عینی آپ کے ساتھ نہیں جائے گی۔'' علی کا سخت اور اٹل لہجہ انہیں بہت کچھ باور کرا گیا۔ وہ سنبھل کر بولے:

''کیوں نہیں جائے گی۔ بیٹی ہے ہماری ہم اسے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔''

''آپ اسے میری اجازت کے بغیر اپنے ساتھ کہیں نہیں لے جا سکتے کیونکہ یہ میری بیوی ہے۔'' علی نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا اور پھر عینی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ''چلو عینی اندر کمرے میں جاؤ۔''

"علی۔" وہ بس اسے پکار ہی سکی۔ علی کی آنکھوں سے جھلکتا غصہ اسے ہراساں کر گیا۔

"سنا نہیں تم نے، جاؤ اپنے کمرے میں۔" علی نے غصیلے اور سخت لہجے میں کہا تو وہ ڈر کر ان سے پیچھے ہٹ گئی۔ یاسین بیگ غصے سے سلگ کر بولے:

"تو تم ہماری بیٹی کے ساتھ سختی اور زبردستی بھی کرتے ہو۔"

"سر آپ کی بیٹی میری بیوی بھی ہے اور میں اپنی بیوی کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہوں۔" علی نے بہت اطمینان سے کہا۔ عینی ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔

"تمہیں عینی کو طلاق دینا ہوگی ہم اس کی شادی عاصم سے کرنا چاہتے ہیں۔"

"تو سر کر دی ہوتی اس کی شادی عاصم سے، مجھے کیوں اس کا مختار بنایا تھا؟" علی نے تیز لہجے میں کہا تو وہ جل کر بولے۔

"علی تم ہماری مجبوری کا فائدہ اٹھا رہے ہو۔"

"تو سر، میں کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہا۔ آپ نے اپنی مرضی سے اپنی بیٹی کو میرے نکاح میں دیا تھا۔ میں نے آپ سے کسی قسم کا معاہدہ نہیں کیا تھا۔ عینی اپنے ساتھ اپنی ضرورت اور اپنے استعمال کا سامان لے کر آئی تھی۔ مجھے نہ تب آپ سے کسی مادی شے کی طلب تھی اور نہ ہی مجھے اب عینی کے حصے کی جائیداد سے کوئی دلچسپی ہے۔" علی سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"علی ساری جائیداد عینی کی ہے، یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔" یاسین بیگ نے غصے سے کہا۔

"تو ہم آپ کو لکھ کر دے دیتے ہیں کہ ہمیں آپ کی جائیداد سے ایک روپیہ بھی نہیں چاہیے۔ عینی سے ابھی لکھوا سکتے ہیں آپ۔"

"علی میں نے تمہیں ایک شریف آدمی سمجھا تھا۔"

"سر آپ نے مجھے بالکل صحیح سمجھا تھا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں ایک شریف آدمی ہوں اسلیے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دوں گا۔ اور شریف آدمی اپنی بیوی

کی دوسری شادی کی بات سننا بھی پسند نہیں کرتے۔ اس لیے مہربانی آپ اس موضوع کو یہیں ختم کر دیں۔"

"عینی چلو ہمارے ساتھ۔" مسز یاسین بیگ نے عینی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"عینی تم اب تک یہیں کھڑی ہو، جاؤ اپنے کمرے میں۔" علی نے غصیلے اور سخت لہجے میں کہا تو وہ ڈرتی ہوئی کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ وہ دونوں دیکھتے رہ گئے۔

"تم ہماری بیٹی کو ڈراتے، دھمکاتے ہو۔" مسز یاسین بیگ نے غصے سے کہا۔

"شادی کے بعد دلہنیں مہینہ بھر کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتیں اور تم نے ہماری بیٹی کو آتے ہی کچن میں گھسا دیا۔ تم بلیک میل کرنا چاہتے ہو ہمیں۔"

"آنٹی میں اپنی بیوی کے ساتھ بہت آرام اور اطمینان سے رہ رہا ہوں۔ آپ لوگ طلاق کا مطالبہ اپنے ذہنوں میں دفن کر دیجیے۔ میں آپ کو بلیک میل نہیں کر رہا لیکن میں اپنی عزت کا مذاق اڑانے کی اجازت بھی آپ کو نہیں دے سکتا۔" علی نے نرم لہجے میں کہا اور یاسین بیگ نے احسان جتاتے ہوئے کہا۔

"علی، آج تم جو کچھ بھی ہو، میری وجہ سے ہو۔"

"نہیں سر! آج میں جو کچھ بھی ہوں، اللہ تعالیٰ کی رحمت، اپنی محنت، ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے ہوں۔ آپ خود یہ جانتے ہیں کہ آپ کا مجھ پر کوئی احسان نہیں ہے لیکن پھر بھی میں خود کو آپ کا احسان مند سمجھتا ہوں اور آپ کی ابھی تک بہت عزت کرتا ہوں، کیونکہ عینی کی وجہ سے آپ میرے لیے قابل احترام ہیں۔"

"عینی کو ہمارے ساتھ جانا ہے۔ تم اسے زبردستی اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے"۔ یاسین بیگ نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"سر یہ گھر بھی میرا ہے اور یہاں حکم بھی میرا چلتا ہے۔ یہ آپ کا آفس نہیں ہے جہاں میں آپ کا ہر حکم ماننا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ آپ نے عینی سے رشتے کی بات مجھ سے اپنے آفس میں کی تھی۔ شاید آپ رشتوں میں بھی بزنس کے قائل ہیں

لیکن اگر آپ اس موضوع پر مزید کوئی بات کرنا چاہتے ہیں تو اپنے آفس میں ہی کیجیے گا۔''

''تو ٹھیک ہے کل صبح آفس میں بات ہوگی۔ چلو بیگم۔'' یاسین بیگ نے سپاٹ لہجے میں کہا اور مسز یاسین بیگ کے ساتھ واپس چلے گئے۔ وہ کمرے میں آیا تو عینی پر نگاہ پڑی جو بیڈ پر گھٹنوں پر سر رکھے پریشان بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر خوفزدہ بھی ہوگئی۔ وہ اپنی مسکراہٹ ضبط کرتا اس کے قریب بیٹھ گیا۔

''چلے گئے مما پپا۔'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔

''ہاں چلے گئے۔'' وہ بولا۔

''کیا فیصلہ ہوا؟'' اس نے بے چینی سے پوچھا تو اس نے سنجیدگی سے کہا:

''فیصلہ کل ان کے آفس میں ہوگا۔ تمہارے پپا طلاق دلوانا چاہتے ہیں تمہیں اور اس کے بعد تمہاری شادی عاصم سے کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تم بھی عاصم سے شادی کرنا چاہتی ہو؟''

''کس کس سے شادی کروں گی میں؟ نہیں کرنی مجھے کوئی شادی۔ یہ ایک شادی ہی بہت ہے میرے لیے۔'' وہ غصے سے چیخ کر بولی اور پھر گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔ علی بے قرار ہوگیا۔

''اچھا اب روؤ نہیں، میں سنبھال لوں گا سب۔'' علی نے اس کے سر کو تھپک کر نرمی سے کہا یہ تو وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ اور اس سے علیحدگی نہیں چاہتی اس لیے وہ بہت مطمئن اور مسرور بھی تھا۔

☆☆☆

''تو پھر کیا فیصلہ کیا تم نے؟'' یاسین بیگ نے اگلی صبح اپنے آفس میں اسے بلا کر وہی سوال دہرایا تو اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

''سر میں اپنا فیصلہ آپ کو رات ہی سنا چکا ہوں۔ میں عینی کو کسی قیمت پر بھی طلاق نہیں دوں گا اور آپ کیسے باپ ہیں کہ اپنی بیٹی کو طلاق دلوانا چاہتا ہیں۔ کون

کرے گا دوبارہ آپ کی طلاق یافتہ بیٹی سے شادی؟''

''یہ تمہارا دردسر نہیں ہے۔''

''یہ میرا ہی دردسر ہے سر!'' علی سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''کیونکہ آپ کی بیٹی میری بیوی ہے اور مجھے اس سے بہت انسیت اور محبت ہے، بہت عزت ہے میرے دل میں اس کی۔ آپ اس طرح زبردستی اسے طلاق دلوا کر عاصم سے بیاہ بھی دیں گے تو بھی وہ خوش نہیں رہ سکے گی۔ عاصم اس کے کردار پر شک کرے گا۔ زاہد قریشی سے اس کا ضرور کوئی افیئر تھا جبھی آپ نے اپنی آن اور عزت کی خاطر عینی کی شادی مجھ سے کردی اور جب مجھ سے عینی نے طلاق لے لی تو یہ بھی اس کے کردار کی خامی شمار ہوگی۔ وہ کبھی بھی عاصم یا کسی اور شخص کی نظروں میں باکردار اور معزز نہیں ٹھہرے گی۔ اور یہی میں نہیں چاہتا کہ وہ معصوم لڑکی! جو میری بیوی بھی ہے اور محبت بھی۔ کبھی کسی کی نظروں میں مشکوک اور بری ٹھہرے۔''

''تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔'' یاسین بیگ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''زندگی کا آخری فیصلہ تو نہیں ہے ہاں البتہ اس معاملے میں یہ میرا آخری اور حتمی فیصلہ ہے''۔ علی نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''علی تم جانتے ہو کہ آج تم جس گھر میں ہو وہ میرا دیا ہوا ہے۔ یہ ملازمت بھی میں نے تمہیں دی تھی۔ آج اگر میں تم سے یہ سب چھین لوں، واپس لے لوں تو تم فٹ پاتھ پر بھیک مانگتے نظر آؤ گے یا پھر گاڑیوں کے ٹائر بدلتے دکھائی دو گے۔'' یاسین بیگ نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا تو علی کو بھی غصہ آ گیا۔

''سر آپ میری توہین کر رہے ہیں۔ میں بھیک مانگنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ گاڑیوں کے ٹائر بدلنا، ورکشاپ میں کام کرنا کوئی عیب یا جرم نہیں ہے۔ محنت سے روزی کمانے میں کوئی عار نہیں ہے بلکہ محنت سے اپنے ہاتھ سے روزی کمانے والا تو اللہ کا پسندیدہ بندہ شمار ہوتا ہے اور مجھے فخر ہے کہ میں نے یہ مقام اپنی محنت سے حاصل کیا اور آپ نے میری صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے میری کارکردگی

سے خوش ہو کر مجھے گاڑی اور بنگلے کی آفر کی تھی۔ لیکن میں نے اپنی ضرورت سے زیادہ کی طلب کبھی بھی نہیں رکھی سر! آپ نے جو فلیٹ مجھے دیا ہے وہ میری قابلیت، ذہانت اور محنت کا ثمر ہے۔ کمپنی کے اکثر ملازمین کو آپ نے یہ سہولت دی ہے اگر مجھے دی ہے تو کوئی احسان نہیں کیا۔ میرا حق تھا یہ اور آپ نے ہی مجھ سے یہ سب کہا تھا۔ اتنا غرور نقصان دہ ہوتا ہے سر۔ آپ کی کمپنی میں ملازمت کرنے سے پہلے بھی میں مطمئن تھا، میرے سر پر اپنی چھت تھی، تن پر اچھا لباس تھا اور میں دو وقت کی روٹی بھی اپنی محنت اور خون پسینے کی کمائی سے خوب سیر ہو کر کھاتا تھا۔ مجھے کوئی فکر تھی اور نہ ہی اللہ کے کرم سے کبھی فاقوں کی نوبت آئی تھی۔ آپ نے اگر مجھے اپنی کمپنی میں اہم عہدے پر جاب دی تھی تو سر یہ آپ کی ضرورت تھی اور ہے۔ مجھے آپ کی نہیں بلکہ آپ کو اور آپ کو میری ضرورت تھی اسی لیے آپ نے اب تک مجھے اپنا منظور نظر بنا رکھا تھا۔'' ......علی نے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف گوئی سے کہا۔

''میں تمہیں اس جاب سے ڈس مس بھی کر سکتا ہوں۔ مسٹر علی!'' یاسین بیگ نے آخری پتا پھینکا۔

''شوق سے کیجیے۔ سر!'' وہ اطمینان سے مسکراتے ہوئے بولا ......'' میرے پاس فارن کمپنیوں کی طرف سے بھی آفرز ہیں۔ میں دو دھائی لاکھ روپے ماہوار تنخواہ اور تمام سہولیات کے پیکج کی آفر پر امریکہ یا جاپان کے لیے بھی کام کر سکتا ہوں۔ آپ خود بھی بارہا تسلیم کر چکے ہیں کہ میری عمدہ کارکردگی کی وجہ سے کمپنی کو لاکھوں، کروڑوں کا فائدہ پہنچا ہے۔ یہ فائدہ میں بھی اٹھا سکتا تھا۔ سر! مگر بے ایمانی کی کمائی پر میں لعنت بھیجتا ہوں۔ میں نے پوری دیانتداری سے اپنی ڈیوٹی ادا کی ہے بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ کام کیا ہے۔ آپ کی کمپنی کو اپنی کمپنی سمجھ کر اپنا دھیان، اپنی ساری توجہ، محنت اور صلاحیت صرف کی ہے اس کے کام پر۔ اور اب آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ میں تمہیں ڈس مس بھی کر سکتا ہوں۔ ایسا کر کے بھی آپ عینی کو حاصل نہیں کر سکیں گے۔ سر!''

''کتنے دن رکھو گے تم عینی کو اپنے اس ڈربے نما فلیٹ میں؟'' یاسین بیگ نے طنزیہ لہجے میں کہا'' اب تک تو وہ صرف اس لیے تمہارے اس تنگ فلیٹ میں رہنا گوارہ کر رہی تھی کہ یہ اس کا عارضی ٹھکانا ہے۔ وہ کھلے اور کشادہ بنگلے میں پلی بڑھی ہے۔ ہمیشہ سے کھلی فضا میں رہتی آئی ہے۔ تمہارے فلیٹ میں بہت جلد اس کا دم گھٹنے لگے گا اور اس کی مہینے بھر کی پاکٹ منی تمہاری مہینے بھر کی تنخواہ سے ڈبل ہے۔ کہاں سے پورے کرو گے اس کے اخراجات، اس کی ضروریات؟''

''سر! مجھے اپنے قوت بازو پر مکمل بھروسا اور اعتماد ہے اور عینی اب تک اسی ڈربے نما فلیٹ میں رہ رہی ہے۔ میں اس کے اخراجات اور ضروریات اپنی محنت کی کمائی سے پورے کر سکتا ہوں۔ جہاں تک میں عینی کو سمجھ پایا ہوں وہ بہت ذہین، سلیقہ مند اور سمجھدار لڑکی ہے۔ وہ مجھ سے طلاق نہیں لے گی علی میں تمہیں جیل بھجوا دوں گا عینی کو حبس بے جا میں رکھنے اور فراڈ کرنے کے جرم میں میں نے آپ کو بہت عزت دی ہے سر لیکن اگر آپ مجھے بنا قصور کے ان گھٹیا اور خود ساختہ الزامات اور جرائم میں ملوث کریں گے تو یاد رکھیں کہ آپ خود بھی پھنس جائیں گے۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟'' یاسین بیگ نے الجھن آمیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہی سر! کہ اب تک آپ نے میرا ایک ہی روپ دیکھا ہے۔ مخلص، ایماندار اور ہمدرد کا روپ۔ آپ نے میرا غصہ اور انتقام نہیں دیکھا۔ مجھے مجبور مت کیجیے سر کے میں غصے میں آ کر آپ کے غرور کو خاک میں ملا کر رکھ دوں۔ کوئی آپ سے یہ کہے کہ آپ اپنی بیوی کو طلاق دے دیں میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو ......''

''بکواس بند کرو۔'' یاسین بیگ نے غصے سے چلا کر کہا۔ ''تمہیں جرأت کیسے ہوئی یہ گھٹیا بات کہنے کی؟''

''یہی سوال میں بھی آپ سے پوچھ سکتا ہوں۔ سر! کہ آپ کو جرأت کیسے ہوئی مجھ سے یہ گھٹیا بات کہنے کی؟'' علی نے سخت لہجے میں کہا۔ ''آپ اپنی بیوی کے متعلق

یہ بات سننا گوارہ نہیں کر سکتے تو مجھے کیوں کہہ رہے ہیں؟ میرے احساسات اور جذبات کا اندازہ اب تو آپ کو بخوبی ہو جانا چاہیے۔ مجھ سے دوبارہ عینی کو طلاق دینے کی بات مت کیجیے گا۔ سر! ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''تم میری بیٹی پر جبر کرتے ہو، تشدد کرتے ہو، اس سے ملازموں کی طرح کام لیتے ہو اور......''

''سر! میں نے آپ سے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔'' علی نے ان کی بات کاٹ کر سخت لہجے میں کہا۔ ''میں اپنی بیوی کو جس طرح اور جہاں چاہوں گا، جیسے چاہوں گا رکھوں گا۔ لہٰذا آپ میرے نجی معاملات میں دخل اندازی نہ ہی کریں تو بہتر ہے، آپ کے لیے بھی اور آپ کی بیٹی کے لیے بھی۔''

''علی اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میں تمہاری زندگی حرام کر دوں گا۔'' یاسین بیگ نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

''اور میں آپ کی بیٹی کی زندگی حرام کر دوں گا۔'' علی ان کا وار انہیں کو لوٹاتے ہوئے کہا۔

''یاد رکھیے سر! کہ عینی میری دسترس میں ہے۔ قانون، مذہب اور شرع کی رو سے وہ میری بیوی ہے، میری ملکیت ہے، میری منکوحہ ہے۔ اگر آپ کو اپنی بیٹی کی زندگی اور خوشی عزیز ہے تو اسے میرے ساتھ رہنے دیجیے ورنہ......''

''بلیک میلنگ!'' یاسین بیگ نے طنز سے کہا۔

''آپ کچھ بھی سمجھیں اور کہیں سر! میں عینی کو آپ کے حوالے نہیں کر سکتا جب تک آپ کے ذہن سے اس کا گھر اجاڑنے کا خیال نکل نہیں جاتا۔'' علی نے غصیلے لہجے میں کہا اور تیزی سے آفس سے باہر نکل گیا۔ جاتے ہوئے آفس کا دروازہ اس نے اتنے زور سے بند کیا کہ یاسین بیگ کے دل کی دیواریں تک لرز اٹھیں۔

علی غصے اور جولائی کی آگ میں جلتا، سلگتا اور تپتا ہوا اپنی موٹر بائیک دوڑاتا اپنے پرانے غم خوار، دوست اور ہمدرد خان لالہ کی ورکشاپ پر جا کر رکا۔ اس کا چہرہ

غصے سے گلنار ہو رہا تھا، کنپٹیاں جل رہی تھیں، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ساری دنیا کو آگ لگا دے، جلا کر بھسم کر دے۔

''آؤ بھئی! بسم اللہ آج تو ہمارا علی بابا آیا ہے۔'' خان لالہ نے اسے دیکھتے ہی خوشی سے بلند آواز میں کہا اور اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھا دیا۔

''السلام علیکم لالہ۔''

''وعلیکم السلام! علی بابا۔ آج تو تم ٹماز کی طرح لالو لال ہو رہے ہو۔ آؤ بیٹھو۔'' خان لالہ اسے اپنے آفس نما کمرے میں لے آیا۔

''لالہ ٹھنڈا یخ پانی پلاؤ بہت آگ جل رہی ہے اندر۔'' علی نے کرسی پر نڈھال ہو کر گرتے ہوئے کہا۔

''وہ تو تمہارے چہرے سے ظاہر ہو رہا ہے۔ لو پانی پیو۔'' خان لالہ نے واٹر کولر سے ٹھنڈا پانی گلاس میں بھر کر گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ خان لالہ نے گلاس دوبارہ بھر کر اس کے سامنے میز پر رکھ دیا اور اسے تشویش بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا ''علی بابا! کیا بات ہے کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ کیا؟''

''ہاں لالہ! ایسا ہی سمجھو۔'' اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور دونوں کہنیاں میز پر ٹکا کر سر ہاتھوں میں گرا لیا۔ خان لالہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا:

''تو مجھ کو بتاؤ نا! آخر میں کس لیے ہوں تمہارا دوست اور بھائی ہوں......؟''

''کیا بتاؤں لالہ؟'' وہ لمبا سانس لے کر بولا۔ ''میری زندگی میں خوشیاں اچانک آئی تھیں، بھولی بھٹکی کسی حسین یاد کی طرح......اور اچانک وہ خوشیاں مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں وہ لوگ۔''

''کون لوگ؟ بابا! ہم کو بتاؤ۔ ہم ان کو ایسا سبق سکھائے گا وہ یاد کرے گا۔'' خان لالہ نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

"میں اس مسئلے کو خود ہی حل کرلوں گا۔ لالہ!" علی نے میز پر رکھی گولڈ لیف کی ڈبی اٹھائی اور سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگالی۔ ماچس بھی میز پر موجود تھی۔ اس نے سگریٹ سلگائی اور لمبے لمبے کش لینے لگا۔ اس کے اندر باہر آگ ہی آگ تھی، دھواں ہی دھواں تھا، وہ غصہ ضبط کرنے کی کوشش میں سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔

"علی بابا! آج ہم نے تم کو دوسری دفعہ اتنا غصے میں دیکھا ہے اتنا پریشان دیکھا ہے۔ تم نو سال ہمارے ساتھ رہا ہے اس لیے ہم تم کو اچھی طرح جانتا ہے۔ ضرور کوئی بہت بڑی بات ہوئی ہے جو تم اتنا غصے میں ہو۔ جب تمہارے تایا نے تمہارے مکان پر قبضہ کیا تھا تب تمہیں غصہ آیا تھا، پریشان ہوا تھا......اس کے بعد آج ہم نے تم کو اتنے زیادہ غصے میں، پریشانی میں دیکھا ہے۔ آخر بات کیا ہے؟"

"لالہ! ایک بار پھر مجھ سے میرا گھر چھیننے کی کوشش کی جارہی ہے۔ صرف گھر ہی نہیں اس بار میرا دل بھی ویران کر دینا چاہتے ہیں وہ۔" علی نے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے فضا میں چھوڑتے ہوئے بے چینی سے کہا۔

"کون خانہ خراب ہیں وہ بتاؤ تو بابا؟"

"میرے باس اور سسر اپنی بیٹی کو طلاق دلوانا چاہتے ہیں۔"

"او خانہ خراب کا بچہ دماغ تو نہیں الٹ گیا اس کا۔ کیسا باپ ہے وہ، پہلے شادی کر دیا اب بربادی کرانا چاہتا ہے۔" خان لالہ نے غصے سے کہا۔

"لیکن میں انہیں ایسا کرنے تو نہیں دوں گا۔" علی نے دوسرا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "اور تایا سے تم نے خوب یاد دلایا لالہ! میں سوچ رہا ہوں کہ تایا کے ظلم کا حساب بھی بے باق کر ہی دوں۔ اب مجھے شعور بھی حاصل ہو گیا۔ اور میں قانون کا راستہ بھی جانتا ہوں۔ تایا نے جس طرح میرے سر سے چھت چھینی تھی، مجھے میرے حق سے محروم کیا تھا، میں وہ اذیت وہ ناانصافی اور دھوکا آج تک نہیں بھولا۔"

"علی بابا! تمہارے تایا کو اس ناانصافی کی بڑی سزا مل گئی ہے۔ اس کی بیٹیوں کی وٹے سٹے کی شادی ناکام ہو گیا۔ جھگڑا پڑا، داماد قتل ہو گیا۔ ایک بیٹی بیوہ ہو گئی،

ایک طلاق لے کر میکے بیٹھی ہے۔ زمینیں فصلیں سب تباہ ہو گئیں۔ مویشی مر گیا۔ اب تو تمہارا تایا تمہارے مکان میں سر چھپائے بیٹھا ہے۔ کہتا ہے کہ میں نے علی کا حق مارا تھا۔ مجھے یتیم بھتیجے کی آہ لگی ہے۔ وہ بہت شرمندہ ہے اپنے کیے پر۔ بہت روتا ہے تم سے ملنا چاہتا ہے۔" خان لالہ نے اسے تفصیل سے بتایا۔

"میں اس سے نہیں ملوں گا۔ لالہ!" اگر قدرت نے اس سے انتقال لے لیا ہے تو اب میں اس سے کوئی انتقام نہیں لوں گا اگر وہ میرے مکان میں سر چھپائے بیٹھا ہے تو میں اس کا سر ننگا نہیں کروں گا۔ اسے دربدر اور بے آسرا نہیں کروں گا۔ وہ اس مکان میں آرام سے رہے۔ میں نے معاف کیا اسے۔ میرا اللہ بھی اسے معاف کرے اور اس کی حالت پر رحم کرے۔" علی نے بہت مدھم اور افسردہ تھکے تھکے لہجے میں کہا تو خانہ لالہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"واہ علی بابا! تم بھی بہت کمال کا آدمی ہے۔ تمہارا غصہ بھی غضب کا ہے اور تمہاری محبت اور معافی کا بھی جواب نہیں ہے۔ ہم کو تمہارا یہی خوبی تو بہت پسند ہے کہ تم غصہ کر کے جلدی ٹھنڈا بھی پڑ جاتا ہے اور پیار کر کے ساری زندگی نبھاتا ہے۔ اللہ پاک کا مہربانی ہے کہ تمہارا غصے سے ابھی تک کسی کو نقصان نہیں پہنچا۔ آج جو غصہ تم کو چڑھا ہے اسے بھی ختم کر دیا اور پیار کی بات کرو۔"

"پیار کی بات ہی تو ان سے برداشت نہیں ہو رہی لالہ۔" علی نے سگریٹ کا ٹکڑا ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا۔

"تم بولے تو ہم بیگ سے بات کرے، اسے سمجھائے۔"

"نہیں لالہ! ان کے لیے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں، میں سمجھا لوں گا انہیں۔" علی نے اگلا سگریٹ ہونٹوں سے لگا کر کہا۔

"چھوٹے کڑک سا چائے لاؤ یارا اپنا علی بابا آیا ہے۔ او کدھر گم ہو جاتا ہے تم لوگ؟" خان لالہ نے اپنے ملازم کاریگر کو آواز دے کر کہا۔

"او استاد! چائے کا آرڈر تو میں نے علی بابو کے آتے ہی دے دیا تھا۔" چھوٹا

چائے کے کپ اور چائے دانی ٹرے میں رکھے کمرے میں داخل ہوا۔ ٹرے میز پر رکھ کر واپس چلا گیا۔

''لالہ تم گاؤں گئے تھے کیا؟'' علی نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! وہ ہفتے پہلے گیا تھا، ادھر ہی تمہارے تایا کا پتا چلا تو ملنے کو چلا گیا تھا۔'' خان لالہ نے چائے کپ میں انڈیلتے ہوئے بتایا۔

''گزر بسر کے لیے تایا کو رقم کی ضرورت تو نہیں ہے اگر ہے تو......''

''او نہیں یارا!'' خان لالہ نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''ابھی زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا ہے اس کے پاس جس سے اس کا گزر بسر ہو رہا ہے۔ تم اب حاتم طائی بننے کی کوشش نہ کرو اور یہ چائے پیو۔''

''سردرد کی دو گولیاں بھی منگوا دو لالہ۔''

''اب سردرد کی گولیاں کھا کر اپنا سر پھاڑنا ہے کیا۔ پہلے ہی تمہارا بلڈ پریشر آسمان سے ہیلو ہیلو کر رہا ہے۔ آگ سے زیادہ تپش تو تمہارے جسم سے نکل رہی ہے۔ گولیاں الٹا اثر کریں گی۔ آرام سے چائے پیو۔ پسینہ خشک کرو پھر ہم تم کو اپنی گاڑی میں گھر چھوڑ کر آئے گا۔ تمہارا موٹر سائیکل چھوٹا گھر پہنچا دے گا۔'' خان لالہ نے بڑے بھائی کی طرح رعب دار لہجے میں کہا۔ وہ تھا بھی اس سے بارہ تیرہ سال بڑا۔ شادی شدہ بال بچے دار آدمی تھا۔ اسی کے مکان کے ایک حصے میں علی پے انگ گیسٹ کی حیثیت سے رہا کرتا تھا۔ ورکشاپ پر کام کرتا تھا۔ خان لالہ اس کے اچھے، برے دنوں کا ساتھی تھا۔

''لالہ! بھابی اور بچے کیسے ہیں؟'' علی نے چائے کا سپ لے کر پوچھا۔

''سب اچھے ہیں تم کو بہت یاد کرتے ہیں۔ یارا! کبھی گھر کا چکر لگاؤ نا۔''

''لگاؤں گا لالہ! ابھی تو میں خود ہی چکر میں ہوں۔'' علی نے گرم چائے کو بڑے آرام سے حلق سے نیچے اتارتے ہوئے کہا تو خان لالہ نے نرمی سے کہا۔

''زیادہ غصہ نہ کرو علی بابا! اپنی جان جلانے سے کیا فائدہ؟ یہ چاند جیسا چہرہ

سورج کے جیسا بنا لیا ہے تم نے۔ غصہ ٹھنڈا کر دیارا۔''

''خان لالہ! جب انسان سے اس کی سب سے قیمتی چیز یا انمول ہستی چھین لی جائے یا چھیننے کی کوشش کی جائے۔ بنا جرم کے سزا دی جائے تو غصہ تو آتا ہے نا۔'' اس نے خالی کپ میز پر رکھا اور سگریٹ کی ڈبی میں سے آخری سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔

''تمہارا کہنا درست ہے مگر اپنی صحت کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ زیادہ غصہ کبھی کبھی غلط اور نقصان دہ ہوتا ہے۔ آدمی کو غصے میں جھوٹ سچ کا بھی پتا نہیں چلتا ہے۔ وہ جھوٹ کو سچ اور غلط کو درست سمجھنے لگتا ہے اور اپنا اور دوسروں کا نقصان کر بیٹھتا ہے۔ کبھی کبھی آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا بھی غلط اور جھوٹ نکلتا ہے۔''

''بات تو تمہاری بھی درست ہے۔ لالہ!'' علی نے سگریٹ کا کش لے کر کہا تو وہ ہنس پڑا۔

''اچھا لالہ! میں اب چلتا ہوں۔ بھابی کو میرا سلام کہنا اور بچوں کو میرا پیار دینا۔ انشاء اللہ میں اس مسئلے کو حل کرنے کے بعد تمہارے گھر آؤں گا۔ تم دعا کرنا لالہ!''

'دعا تو ہم دل و جان سے کرے گا۔ آؤ ہم تم کو گاڑی میں گھر ڈراپ کر آئے۔'' خان لالہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آفس سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

''نہیں لالہ! میں چلا جاؤں گا۔ میرا غصہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا ہے۔''

''او اس لیے ہی تو بولتا ہے کہ کہیں غصے میں تم ایکسیڈنٹ نہ کرا بیٹھو۔''

''کچھ نہیں ہوتا لالہ! بہت شکریہ اور یہ سگریٹ کی ڈبیا مجھے دے دو۔'' علی نے اس کے ہاتھ میں پکڑی سگریٹ کی نئی ڈبیا لے لی۔

''یارا مت پیو، بہت پی چکے ہو اور کتنا جلاؤ گے خود کو؟'' خان لالہ نے نرمی سے کہا۔

''بس ایک ڈبیا اور......'' علی نے کہا اور ڈبیا پینٹ کی جیب میں رکھ کر موٹر

بائیک سنبھالی۔

''گھر پہنچ کر ہم کو اپنی خیریت کا فون کر دینا ورنہ ہم کو فکر رہے گا۔''

''اچھا لالہ! کر دوں گا۔ اللہ حافظ!'' علی نے مسکراتے ہوئے کہا اور بائیک کا رخ گھر کی طرف موڑ دیا۔

وہ دھوپ کی تپش، غصے کی آگ، ناقدری کے شعلوں اور توہین کے احساس، میں جلتا ہوا گھر پہنچا تو عینی اس کی صورت دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ وہ تو اپنی زندگی کے فیصلے کی خبر سننے کے لیے اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ دوبارہ بجے ہی گھر پہنچ گیا تھا۔ بیڈ روم میں آ کر اس نے جوتے اتار کر ایک طرف رکھے اور بیڈ پر لیٹ کر سگریٹ سلگا لی، لمبے لمبے کش لینے لگا، دھواں ہی دھواں اس کے ارد گرد پھیل گیا۔ عینی پریشانی سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے سگریٹ تو کبھی نہیں پیئے تھے یہ آج اسے کیا ہو گیا تھا۔ وہ سہمی ہوئی بھی تھی، کہ نجانے پپا نے اس کی زندگی کے بارے میں اس رشتے کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہوگا۔ علی مسلسل خاموش تھا اور سگریٹ کے کش پہ کش لیے جا رہا تھا۔ اس کا سرخ چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ شدید غصے کی حالت میں ہے۔ اس کے غصے سے وہ بہت ڈرتی تھی۔ کچھ پوچھ کر اپنی شامت کو آواز دینے والی بات تھی۔ مگر اس سے مزید ضبط نہ ہو سکا تو ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

''آپ نے سگریٹ کب سے پینا شروع کر دی؟''

''ایک گھنٹے پہلے شروع کی ہے۔'' وہ منہ سے دھواں نکالتے ہوئے بولا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ میں تم پر اپنا غصہ نہیں اتارنا چاہتا۔''

''پپا سے آپ کی...... کیا بات ہوئی...... کیا کہا انہوں نے؟''

''تمہارے پپا نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے تمہیں طلاق نہ دی تو وہ مجھے کروڑوں روپے خورد برد کرنے کے جرم میں جیل بھجوا دیں گے۔''

''نہیں پپا ایسا نہیں کر سکتے''۔

''میں انہیں ایسا کرنے بھی نہیں دوں گا۔'' اس نے منہ سے سگریٹ کا دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے کہا۔

''تو کیا آپ مجھے......'' وہ بولتے ہوئے کانپ گئی، ایک ہاتھ بے اختیار منہ پر رکھا تھا اور دوسرا ہاتھ دل پر ٹھہر گیا تھا۔ علی نے اسے بڑے غور سے دیکھا وہ اس کی دلی کیفیت کو سمجھ بھی رہا تھا اور محسوس بھی کر رہا تھا۔ اندر ہی اندر ہی خوش ہو رہا تھا۔ وہ اس سے الگ نہیں ہونا چاہتی یہ احساس اس کے لیے جلتی دھوپ میں ٹھنڈک بخش چھاؤں جیسا تھا۔

''اس کا فیصلہ میں کر چکا ہوں کہ میں تمہیں طلاق......''

''علی!'' وہ بے اختیار و بے قرار ہو کر چیخ اٹھی وہ کچھ اور ہی سمجھی تھی وہ اپنی مسکراہٹ دبا گیا۔

''آپ کو تو بہت یقین تھا اپنی محبت پر۔ آپ تو اپنی عزت کسی کے حوالے نہیں کرنا چاہتے تھے آپ کو تو اپنی غیرت بہت عزیز تھی۔''

''میں اب بھی اپنے اس دعوے پر قائم ہوں۔''

''تو؟'' اس کی تو جیسے جان اٹکی ہوئی تھی اس کے جواب میں اس کے چہرے کو بے چین نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''تو یہ کہ میں تمہیں طلاق کبھی نہیں دوں گا۔'' علی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور دوسرا سگریٹ سلگا لیا۔

''تھینکس گاڈ!'' عینی کے لبوں سے بے اختیار کلمہ شکر ادا ہوا اور اس کی جان میں جان آئی۔ علی نے سگریٹ لبوں میں دبا کر اپنی مسکراہٹ کو چھپایا۔

''آپ یہ سگریٹ پینا تو بند کریں یہ بری چیز ہے۔'' عینی نے دھواں ہاتھ سے اڑاتے ہوئے کہا۔

''میں خود بھی تو برا ہوں۔''

''کوئی نہیں ہیں آپ برے۔ چھوڑیں اسے۔'' عینی نے کمال جرات کا

مظاہرہ کرتے ہوئے سگریٹ اس کے ہاتھ سے نکال لیا اور سگریٹ کی ڈبیا سے مل کر ڈبیا سمیت ڈسٹ بن میں پھینک دیا اور اس کے لیے ٹھنڈا پانی لینے چلی گئی۔ علی کو اپنے ہاتھ پر اس کے لمس کا احساس ایسے ہو رہا تھا جیسے جولائی کی جلتی، تپتی گرمی میں اس نے اسے ٹھنڈے، میٹھے پانی کا گلاس پیش کر دیا ہو۔ اس نے پہلی بار علی کو اپنائیت سے چھوا تھا۔ وہ روح تک اس کی محبت میں سرشار ہوتا چلا گیا۔

''یہ لیجیے ٹھنڈا پانی پی لیں، آپ کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' وہ پانی کا گلاس لیے موجود تھی۔

''اس میں تھوڑا سا زہر بھی ملا دو تا کہ میں بھی ٹھنڈا ہو جاؤں''۔ علی نے اسے ستانے کے لیے بہت ہی سخت اور سپاٹ لہجے میں کہا اور اس کا یہ لہجہ کام دکھا گیا۔ مارے حیرت، خوف اور گھبراہٹ کے پانی کا لبالب بھرا گلاس علی کے اوپر ہی الٹ گیا۔ اس کا چہرہ، گردن اور سینہ پانی سے تربہ تر ہو گیا۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھا۔

''اوہ علی!'' وہ بری طرح سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، ٹانگیں لرز رہی تھیں۔

''یہ کیا کیا ہے؟ تمہیں پانی بھی پیش کرنا نہیں آتا'' علی نے اس کی خوفزدہ حالت سے لطف اٹھاتے ہوئے لہجے کو غصیلا بنا کر کہا تو وہ تو رونے کو ہو گئی اور وہاں باہر جانے کو تیزی سے مڑی تو علی نے اس کا دوپٹے کا پلو پکڑ لیا اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''اب بھاگ کہاں رہی ہو؟ یہ صاف کرو فوراً'' علی نے غصیلے لہجے میں کہا تو وہ ڈرتی ڈرتی اس کے سامنے بیٹھ گئی اور اپنے دوپٹے سے ہی اس کا چہرہ اور گردن صاف کرنے لگی، ہاتھ مسلسل کانپ رہے تھے، چہرہ خوف سے پیلا پڑ رہا تھا۔

''خیال کرنا کہیں موقع غنیمت جان کر میرا گلا ہی نہ دبا دینا''۔ علی نے بہت سنجیدہ اور کاٹ دار لہجے میں کہا وہ اسے ستا کر خوش ہو رہا تھا۔

''میں نے کیا کیا ہے جو آپ مجھے اس طرح اذیت پہنچاتے ہیں؟'' وہ تقریباً

رو پڑی۔

''ہاں! تم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ تم تو معصوم ہو، بے قصور ہو۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''نہیں میری وجہ سے ہی یہ سب کچھ ہوا ہے۔'' وہ بھرائی آواز میں بولی۔'' کاش! میں نہ ہوتی یا آپ کے ساتھ اس طرح منسوب نہ کی جاتی۔ آپ کو میرے ساتھ یہی سلوک کرنا تھا تو پپا کو پہلے ہی انکار کر دیا ہوتا، نہ کی ہوتی مجھے اپنانے کی غلطی۔''

''غلطی کی ہے تو اب سزا بھی تو بھگت رہا ہوں نا۔'' اس نے گیلی شرٹ اتار کر کرسی پر پھینک دی اور طنز کا ایک اور تیر چلا کر دوبارہ لیٹ گیا۔ وہ حیرت، غم و غصے سے سلگ کر رہ گئی۔ اس نے ایک نگاہ اس پر ڈالی وہ اپنے ہاتھوں سے اپنا سر دبا رہا تھا، ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی، وہ اٹھ کر لاؤنج میں آ گئی۔ خان لالہ کا فون تھا۔ وہ علی کی خیریت دریافت کر رہا تھا۔ اس نے بتا دیا کہ وہ خیریت سے پہنچ گیا ہے تو وہ مطمئن ہو کر بولا۔

''اللہ کا شکر ہے بھابی! ہم تو پریشان ہو رہا تھا۔ وہ بہت غصے میں گیا تھا۔ اور غصے میں آیا تھا ہمارے پاس۔ اس کا خیال رکھو۔ علی ہیرا بچہ ہے ہیرا۔ آپ اس کے اکیلے ہونے کو نہ دیکھو۔ یہ دیکھو کہ وہ کتنا مخلص اور کتنا پیار کرنے والا بندہ ہے۔ وہ اپنی محبت کی خاطر سب کچھ کر سکتا ہے۔ آپ کو وہ بہت چاہتا ہے۔ آپ اپنے پاپا جان کو سمجھاؤ کہ غلط باتیں نہ کریں۔ علی آپ کے لیے مر مٹنے کو تیار ہے۔ وہ آپ کو کبھی نہیں چھوڑے گا۔''

''خان لالہ! آپ دعا کریں کہ ہمارا گھر بسا رہے۔'' عینی نے علی کی محبت سے سرشار لہجے میں کہا۔

''انشاء اللہ! ضرور بسا رہے گا۔ اچھا! اللہ نگہبان۔'' خان لالہ نے فون بند کر دیا۔ وہ ریسیور کریڈل پر رکھ کر دوبارہ بیڈروم میں آئی تو علی کو اسی طرح بغیر

شرٹ کے لیٹے ہوئے اور اپنا سر دباتے ہوئے دیکھا۔ وہ اس کا سر دبانا چاہتی تھی مگر اسے اس کے قریب جانے میں جھجک محسوس ہو رہی تھی حیا آڑے آ رہی تھی۔

''عینی! یہ شخص تو تیرا اپنا ہے تیرا شوہر ہے اور اس وقت تکلیف میں ہے اور تکلیف بھی تیری وجہ سے ملی ہے۔ اتنی محبت تو تجھے بیس برس میں بھی کسی نے نہیں دی ہوگی جتنی کے بیالس دن میں علی نے تجھے دی ہے۔ اس کی محبت کا کچھ تو حق ادا کردے۔'' ......اس کے اندر کی عینی نے کہا تو اسے اپنے مما پپا کی محبتیں بے اختیار یاد آنے لگیں۔ بے تحاشا محبتیں...... مگر علی کی محبت کا اپنا ایک رنگ تھا۔ اپنا انداز تھا، ایک اپنا سرور تھا، اپنا نشہ تھا اور وہ اسی نشے اور سرود میں بے خود ہو کر بے اختیار اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی اور وہ جو اپنے ہاتھوں سے اپنا سر دبا رہا تھا اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر ہٹایا تو اس نے آنکھیں کھول کر بہت حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ اس کو یوں دیکھنے پر پہلی بار پورے استحقاق اور پیار سے مسکرائی اور پھر اپنے نرم ملائم ہاتھوں سے اس کا سر دبانے لگی۔

''عینی!'' تھوڑی دیر بعد علی نے اس کے ہاتھ تھام کر اپنے سینے پر رکھ لیے۔

''درد کچھ کم ہوا؟'' عینی نے اپنائیت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''درد ختم ہو گیا ہے عینی'' وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے ذومعنی انداز میں بولا۔

''میں آپ کے لیے جوس لے کر آتی ہوں۔'' وہ اٹھنے لگی تو اس نے مضبوطی سے اس کے ہاتھ پکڑے اور وہ اٹھ نہ سکی۔

' پہلے مجھے یقین تو کر لینے دو کہ میری چند گھنٹوں کی تکلیف کو تم نے چند منٹوں میں اپنے محبت بھرے لمس کا احساس دے کر ختم کر دی ہے''۔ علی نے اس کے چہرے کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یقین دلانے کے لیے ساری زندگی پڑی ہے''۔ اس نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''جو لمحے بے یقینی میں گزر گئے ہیں ان کا یقین تو دلا دو۔ خواب تو نہ لگے مجھے تمہارا یوں اچانک خود ہی قریب آنا۔'' علی نے اس کے دلکش روشن چہرے کو دیکھا۔

''غصہ ختم ہو گیا آپ کا؟''

''وہ تو تمہیں دیکھتے ہی ختم ہو گیا تھا۔''

''شروع بھی تو مجھے دیکھتے ہی ہو جاتا ہے۔'' اس نے شکوے بھرے لہجے میں کہا تو وہ ہنس پڑا۔

''میری محبت میرے قریب ہوتے ہوئے بھی دور بھاگنے کی، بچنے اور کترانے کی کوشش کرے گی تو میرے اس محبت بھرے دل کو غصہ تو آئے گا نا۔ یہ تو پیار کا غصہ ہے جو اپنے اور تمہارے بیچ خوشبو کو بھی برداشت نہیں کر سکتا چہ جائیکہ کوئی عاصم بیچ میں آن ٹپکے''۔

''پلیز علی یہ ٹاپک اب مت چھیڑیں''۔ عینی نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

''تو کیا آپ کو چھیڑیں؟'' اس نے شریر لہجے میں کہا تو وہ شرما گئی۔

☆☆☆

اگلی صبح ناشتے کی میز پر وہ اس کے ہاتھ کا بنا آملیٹ کھاتے ہوئے بولا ''تمہاری اپنی خوشبو کیا کم دلفریب اور دلنشیں ہے جو اب آملیٹ میں بھی اپنی مہارت جگا رہی ہے۔ کیا اشتہا انگیز خوشبو ہے۔ آملیٹ کا یہ حال ہے تو باقی چیزوں کا کیا حال ہوگا۔ مرغی اور مرغی کا انڈا تو تمہارے ہاتھوں شکست کھا گئے ہیں۔''

''اور آپ؟'' عینی نے قدرے شوخ لہجے میں پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''پہلی شکست میری ہی ہوئی تھی عینی ڈیئر! جانتی تو ہو تم اور اب تمہاری خوشبو۔ آملیٹ کی خوشبو اف شکست در شکست کے درد اکرتی جا رہی ہو تم۔''

''میری خوشبو آپ کو آملیٹ کی خوشبو جیسی محسوس ہوتی ہے کیا؟''

''ارے معصوم اور نادان لڑکی! میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح

آملیٹ کی خوشبو مجھے آملیٹ کھانے پر مجبور کر رہی ہے بالکل اسی طرح تمہاری خوشبو مجھے تمہیں پیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔'' علی نے ہنس کر بہت نرم لہجے میں اپنی بات کی وضاحت کی تو وہ خوشی سے پھولے نہ سمائی اور موقع غنیمت جان کر آہستہ سے کہا:

''علی! میں گھر ہو آؤں؟''

''کیوں اس وقت تم کیا کسی مچھلی بازار میں ہو؟''

علی کو اس کا جانے کا کہنا اچھا نہ لگا۔ سنجیدہ لہجے میں بولا تو اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

''نہیں! وہ میں پپا کے گھر۔''

''تو کیا میرے خلاف محاذ بنانے کا ارادہ ہے؟''

''نہیں علی!'' اس نے جلدی سے کہا'' میں مما پپا سے ملنا چاہتی ہوں، فوراً اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''انہوں نے میری تذلیل کی ہے، اس کے باوجود تم ان سے ملنا چاہتی ہو۔'' علی نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا اس نے شرمندگی سے نظریں جھکالیں۔

''صرف چند گھنٹوں کے لیے جانے دیں۔ آفس سے واپسی پر مجھے اپنے ساتھ لیتے آئیے گا۔'' اس نے آہستہ سے کہا تو وہ بے حد سنجیدہ لہجے میں گویا ہوا۔

''وہ لوگ تو پہلے ہی تمہیں اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ اب جاؤ گی تو کیا واپس آنے دیں گے تمہیں؟ انہوں نے مجھے صرف حکم کا غلام سمجھا ہے، داماد نہیں سمجھا۔ ان کے نزدیک میری اپنی کوئی شناخت کوئی پہچان نہیں ہے۔ میں ایک یتیم اور لاوارث شخص ہوں۔ میرا باپ ایک غریب محنت کش تھا اور میں نے ورکشاپ میں کام کیا ہے، اخبار بیچے ہیں، ٹیوشنز پڑھائی ہیں...... تمہارے مما پپا کے نزدیک یہ سب عیب ہیں۔ وہ مجھے اپنے سٹیٹس سے باہر کا گندی نالی کا کیڑا سمجھتے ہیں۔''

''پلیز علی!'' وہ علی کی تذلیل خود اس کی اپنی زبان سے بھی برداشت نہیں

کر سکتی تھی، بے قرار ہو کر بولی۔ ''انہیں کوئی حق نہیں ہے آپ کی تذلیل کرنے کا۔ میں خود ان سے بات کروں گی۔ پپا ایسی ناسمجھی کی باتیں نہیں کر سکتے۔ وہ برے نہیں ہیں علی!''

''تو کیا میں برا ہوں؟'' علی کا لہجہ سخت اور سپاٹ ہو گیا غصے سے۔

''میں نے یہ تو نہیں کہا مگر میرے پپا میرا برا نہیں سوچ سکتے''۔ اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تو تمہارے خیال میں وہ تمہیں مجھ سے طلاق دلوانے کا جو سوچ رہے ہیں وہ تمہارے لیے اچھا سوچ رہے ہیں۔ انتہائی نامعقول حرکت کر رہے ہیں تمہارے پپا۔ ایک طلاق یافتہ عورت اس معاشرے میں کیا حیثیت رکھتی ہے اس بات کا انہیں احساس ہی نہیں ہے۔ بہت ہی بچگانہ ضد کر رہے ہیں وہ۔ اور تم بیوی ہو میری کوئی کھلونا یا ڈیکوریشن پیس نہیں ہو کہ ان کی پسند اور مرضی، ضد اور ہٹ دھرمی کے آگے مجبور ہو کر میں تمہیں ان کے حوالے کر دوں۔ محض اونچے اسٹیٹس کی خاطر وہ تمہارے دامن پر طلاق کا بدنما دھبہ لگا دینا چاہتے ہیں۔ لیکن میں تمہارا دامن ہر داغ، دھبے سے پاک صاف اور اجلا نکھرا دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''پپا بھی تو ایسا ہی چاہتے تھے۔'' عینی نے ڈرے، سہمے، سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''اسی لیے تو انہوں نے زاہد قریشی سے میری شادی نہیں کی۔ وہ ایک بوڑھے، برے اور لالچی شخص سے مجھے بچانا چاہتے تھے۔ اسی لیے تو انہوں نے میری خوشیوں اور بہتر مستقبل کی خاطر مجبور ہو کر آپ سے میری شادی کر دی۔ یہ فیصلہ چند منٹوں میں کیا تھا انہوں نے اور علیحدگی کا بھی انہوں نے جب ہی طے کر لیا تھا۔''

''لیکن اب جو فیصلہ وہ کروانا چاہتے ہیں وہ نہیں ہوگا۔ وہ تمہاری ہی نہیں میری بھی توہین کر رہے ہیں اور میں اب تک صرف تمہاری وجہ سے خاموشی اختیار کیے ہوئے ہوں۔ ورنہ انہوں نے میرا غصہ نہیں دیکھا اور نہ ہی تم میرے غصے کی شدت سے ابھی پوری طرح واقف ہوئی ہو۔ وہ کچھ بھی کر لیں میں تمہیں ان کے گھر نہیں

رہنے دوں گا۔ ہرگز نہیں۔'' علی نے سخت اور اٹل لہجے میں کہا تو وہ سہم کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''علی پلیز مجھے جانے دیں، تھوڑی دیر کے لیے ہی جانے دیں۔ آفس سے واپسی پر مجھے لیتے آیئے گا۔''

''کیا بہت ضروری ہے تمہارا جانا؟'' علی نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے خوف سے نظریں جھکالیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دے۔ مارے خوف کے پریشانی کے وہ اپنے ہاتھوں کو مسلنے لگی۔ اور علی اس کی حالت دیکھ کر اس کی بات ٹالنے، رد کرنے یا نامنظور کرنے کا حوصلہ نہیں پا رہا تھا۔ پہلی بار تو اس نے اس سے کوئی بات منوانا چاہی تھی۔ اجازت مانگی تھی، بہت منت سماجت کی تھی۔ اسے اس کی نیت پر مکمل بھروسا اور اعتماد تھا۔ اس نے ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھا اور نرمی سے بولا۔

''ٹھیک ہے تم تیار ہو جاؤ میں تمہیں تمہارے پپا کے گھر ڈراپ کر دوں گا اور آفس سے واپسی پر لیتا آؤں گا۔''

''تھینک یو علی! یو آر سو سویٹ میں ابھی تیار ہو کر آتی ہوں۔'' عینی نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا اور بیڈروم کی طرف بھاگی علی مسکرانے لگا۔

''یہ ایک چھوٹی سی بات پر اتنا زیادہ خوش ہو سکتی ہے تو مجھے اس کی خوشی کا خیال رکھنا چاہیے۔ میری اجازت ملتے ہی کتنی خوش ہوئی ہے وہ جیسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ کیا ہر لڑکی اپنے میکے جانے کے خیال سے اتنی ہی خوش ہوتی ہے جتنی کہ اس وقت عینی خوش ہو رہی ہے؟'' علی نے چائے پیتے ہوئے سوچا۔

''چلیں علی!'' وہ ہلکے فالسئی رنگ کا کاٹن کا ہلکے کام والا لباس زیب تن کیے، ہلکا میک اپ کیے، بالوں کو خوبصورت سٹائل میں سنوارے، پرفیوم سے مہکتی، جوتوں کی ہیل بجاتی لاؤنج میں اس کے سامنے آ کر بولی تو علی اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ اس کے سامنے کھڑا ہوا۔

''چلیں؟'' اس نے اس کی نظروں کے حصار سے گھبرا کر پلکیں جھکا کر کہا۔

''تمہارا یہ رنگ روپ دیکھ کر تو میرا دل بھی نہیں چاہ رہا آفس جانے کو۔'' وہ اسے والہانہ پن سے دیکھتے ہوئے شیریں لہجے میں بولا...... ''میکے جا رہی ہو تو اہتمام سے تیار ہوئی ہو، بہت ہی ظالم ہو تم میرے لیے تو تم نے شادی کے بعد ایک دن بھی سنگھار نہیں کیا۔''

''آج کے بعد میرا سنگھار آپ ہی کے لیے ہوگا۔'' عینی نے شرگیں لہجے میں کہا۔

''آج کے بعد......'' علی نے اس کے چہرے کو گہری نظروں سے دیکھا ''تو آج یہ سنگھار کس کے لیے ہے؟''

''آپ شک کر رہے ہیں مجھ پر؟'' اس کی آنکھوں میں بجلیاں سی تڑپیں، لہجے میں خفگی در آئی۔

''اوں ہوں، شک کیوں کروں گا بھئی! میں تو جیلس ہو رہا ہوں کہ تم میری ہو اور میں ہی تمہارے اس رنگ و روپ کو دیکھنے سے محروم رہوں گا اور باقی لوگ تمہیں نظر بھر کر دیکھیں گے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آج ہم دونوں کہیں نہ جائیں اور صرف ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھیں؟'' علی نے اس کا ہاتھ تھام کر محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو اس کا چہرہ اور زیادہ کھل گیا۔

''اس کے لیے تو ساری زندگی پڑی ہے۔'' اس نے حجاب آمیز لہجے میں کہا۔

''یعنی تم ہمیشہ کی طرح آج بھی میری آتش شوق کو بھڑکاؤ گی تو ضرور لیکن میرے دلی جذبات کی پذیرائی نہیں کرو گی۔ ہے نا؟''

''کہا نا! اب تو ساری زندگی آپ ہی کی پذیرائی میں گزرے گی، صرف آج کا دن چند گھنٹے کا یہ گریز اور برداشت کر لیجیے۔'' اس نے شرمیلے پن سے کہا تو وہ خوشدلی سے راضی ہوتے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اگر ایسی ہی خوش بختی میرا مقدر بننے کے لیے بے چین ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے چلو تم بھی کیا یاد کرو گی۔ آج

تمہیں تمام تر خطرات کے باوجود تمہارے پپا کے گھر ڈراپ کر ہی دیتے ہیں لیکن ......"

"لیکن کیا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"لیکن اپنے پپا کے گھر قدم رکھتے وقت یہ بات اپنے ذہن میں رکھنا کہ تم اب میری امانت اور عزت ہو اور میں تمہیں بہت ٹوٹ کر چاہتا ہوں۔ کوئی ایسا کام، کوئی ایسا فیصلہ مت کرنا عینی! کہ جس سے میں ٹوٹ کر بکھر جاؤں۔" وہ موٹر بائیک پر بیٹھے ہوئے بولا۔

"آپ پھر شک کر رہے ہیں۔ اعتبار نہیں ہے نا آپ کو مجھ پر۔" وہ خفا لہجے میں بولی۔

"میں مرد ہوں عینی! شک اور بے اعتباری یقیناً میری فطرت میں شامل ہوگی۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ مجھے تم سے بے حد و بے حساب پیار ہے اور پیار، اعتبار کے بعد ہی ہوتا ہے۔" علی نے یہ کہہ کر موٹر بائیک سٹارٹ کر دی وہ خاموشی سے اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ وہ اسے یاسین ولا ڈراپ کر کے آفس روانہ ہو گیا۔

"ہیلو مما، ہیلو پپا!" وہ مسکراتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور انہیں دیکھتے ہی جوش سے بولی وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ یاسین بیگ نے سوچا۔

"علی نے اسے آنے کیسے دیا کل تو وہ بڑے دعوے کر رہا تھا شاید عقل ٹھکانے آ گئی ہے۔"

"عینی! میری پیاری بیٹی، میری جان کیسی ہو؟" مسز یاسین بیگ نے اسے گلے لگا کر پیار کیا اس کا ماتھا چوما۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں مما! آپ اور پپا کیسے ہیں؟"

"بیٹا! ہم تو تمہارے لیے ہی فکر مند ہیں۔ تم بتاؤ علی سے جھگڑا تو نہیں ہوا تمہارا؟" یاسین بیگ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں پپا! علی جھگڑنے والوں میں سے نہیں ہیں۔" وہ علی کی محبت اور حمایت میں بولی۔

"کل وہ بہت غصے میں آفس سے گیا تھا۔ یہ جھاگ کی طرح کیسے بیٹھ گیا اس کا غصہ۔ میری دھمکی کام دکھا گئی ہے آخر اس نے تمہیں یہاں اکیلے بھیج کیسے دیا؟"

"پپا وہ خود مجھے یہاں ڈراپ کر کے آفس گئے ہیں۔" عینی نے بتایا۔

"ہوں! تو اس کا مطلب ہے کہ میری دھمکی کارگر ثابت ہوئی ہے۔ بڑے دعوے کر رہا تھا وہ کہ محبت کرتا ہے تم سے اور تمہیں طلاق نہیں دے گا۔ اپنا مستقبل سب کو پیارا ہوتا ہے۔ اب دیکھنا وہ خود ہی دو چار دن میں تمہیں طلاق بھیج دے گا۔"

"نہیں پپا! مجھے طلاق نہیں چاہیے"۔

"فضول باتیں مت کرو۔ ہم ایک معمولی خاندان کے یتیم، مسکین، لاوارث لڑکے کو اپنا داماد نہیں بنا سکتے۔" یاسین بیگ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"پپا! داماد تو آپ علی کو بنا چکے ہیں اور اب علی بہت کامیاب آدمی ہیں۔ ان کا خاندان معمولی نہیں تھا، غریب ضرور تھا، لیکن علی نے اپنی محبت سے خود کو بڑا آدمی منوالیا ہے۔ پپا! آپ تو خود علی کی بہت تعریف کیا کرتے ہیں۔"

"تعریف کرنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ہم اسے سر آنکھوں پر بٹھالیں۔ اپنے برابر جگہ دینے لگیں۔" یاسین بیگ نے سنجیدہ اور مغرور لہجے میں کہا۔

"لیکن پپا! میں اپنے دل و نظر میں انہیں بہت بلند مقام پر جگہ دے چکی ہوں۔" عینی نے دل میں کہا۔

"یہ شادی مجبوری تھی ہماری اور علی کو اعتماد میں لے کر یہ شادی کی گئی تھی اسے ہم اپنے ماتحت اور ملازم کی حیثیت سے تو اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں۔ لیکن داماد کی حیثیت سے نہیں۔ لوگ ہم سے پوچھیں گے کہ ہمارا داماد کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے، اس کا بیک گراؤنڈ کیا ہے، حسب نسب، جائیداد کیا ہے، کہاں ہے، رشتے دار کیسے ہیں، کیا کرتے ہیں، کہاں رہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ تو ہم کیا جواب دیں گے انہیں؟"

"پپا! یہ بات تو آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھی۔ اب تو پانی سر سے گزر چکا

ہے۔'' عینی نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو وہ سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں بولے۔

''ابھی پانی سر سے نہیں گزرا، تم دیکھنا وہ زیادہ سے زیادہ ہمیں بلیک میل کر کے تمہاری قیمت وصول کرے گا ہم سے اور پھر طلاق دے دے گا۔ اسے تم سے کوئی دلچسپی اور محبت نہیں ہے۔ اس کی نظر تو تمہاری دولت اور جائیداد پر ہے۔''

''آپ کیا جانیں پاپا کہ علی کو مجھ سے کتنی شدید محبت ہے۔ ان کے نزدیک آپ کی دولت کی نہیں، میری محبت کی دولت کی اہمیت ہے پپا اور میں علی کو اپنی محبت سے اب مزید محروم نہیں رکھ سکتی۔ آج جب وہ مجھے گھر لے جائیں گے تو میں ان سے سب کچھ کہہ دوں گی وہ سب کچھ جو میں ان سے کہنے کے لیے بے تاب ہوں اور جسے علی سننے کے لیے ترس رہے ہیں۔ عینی نے دل میں کہا وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھی کہ ایک نامانوس اور اجنبی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے آواز کی سمت دیکھا تو فوراً ہی پہچان گئی۔ وہ عاصم تھا اس نے اس کی تصویریں جو دیکھ رکھی تھیں۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

''عینی بیٹا! یہ عاصم ہے۔ تمہاری انجم خالہ کا بیٹا اور تمہارا کزن۔ یہ رات ہی یہاں پہنچا ہے۔'' مسز یاسین بیگ نے اس کا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔

''السلام علیکم عاصم بھائی! عینی نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔

''وعلیکم السلام!'' عاصم نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''خیریت سے ہو نا عینی؟''

''جی عاصم بھائی! اور آپ کیسے ہیں؟'' وہ اس کے اس انداز پر مطمئن ہو کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''ایک دم فٹ ہوں اور ہاں ماما نے تمہیں بہت پیار اور دعائیں بھیجی ہیں۔ انہوں نے تمہارے لیے کچھ گفٹس بھی بھجوائے ہیں۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں۔'' عاصم نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ شش و پنج میں پڑ گئی اور عاصم شاید اس کی الجھن بھانپ گیا تھا مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم ادھر ہی بیٹھو میں تمہارے گفٹس ادھر ہی لے آتا

ہوں۔''

''جی بہتر۔'' وہ پرسکون ہو کر بولی وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''میں آفس جا رہا ہوں۔'' یاسین بیگ نے اپنا بریف کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔

''پپا! پلیز علی سے کچھ مت کہیے گا۔'' عینی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''میں نے اسے جو کہنا تھا کہہ دیا ہے اور اس کہے کا اثر بھی شروع ہو گیا ہے۔ میں مزید اس سلسلے میں اسے زحمت نہیں دوں گا۔ تم بے فکر ہو کر عاصم کو کمپنی دو۔ او کے بائے۔'' یاسین بیگ یہ کہہ کر چلے گئے تو اس نے پریشانی اور بے بسی سے مسز یاسین بیگ کی طرف دیکھا۔

عینی بیٹا! تم عاصم کو کمپنی دو، میں ذرا مارکیٹ سے ہو آؤں۔ صبح صبح شاپنگ کرنا صحیح رہتا ہے ورنہ گرمیوں میں تو گیارہ بجے کے بعد باہر نکلنا عذاب ہو جاتا ہے۔'' مسز یاسین بیگ نے اپنا پرس اٹھا کر کہا وہ پہلے سے ہی پروگرام بنائے ہوئے تھیں۔

''مما! مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔ آپ عاصم بھائی کو اکیلا چھوڑ کر جا رہی ہیں۔ میں پہلی بار ان سے مل رہی ہوں اور یوں علیحدگی میں ملنا مجھے قطعاً پسند نہیں ہے۔''

''لگتا ہے علی کے ساتھ رہ کر تمہاری سوچ بھی دقیانوسی ہو گئی ہے۔'' مسز یاسین بیگ نے کہا۔

''مما! علی کی سوچ دقیانوسی نہیں ہے۔'' عینی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن آپ اور پپا اب بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ آپ کا خیال غلط ہے مما کہ طلاق کے بعد عاصم بھائی مجھے قبول کر لیں گے۔ یہ کون سا طریقہ ہے مما کہ ایک طرف تو زاہد قریشی سے پپا نے مجھے بچایا اور دوسری طرف آپ مجھے گناہ گار کر رہے ہیں کہ میں علی کی بیوی ہوتے ہوئے عاصم بھائی کے متعلق سوچوں اور ان سے یوں اکیلے میں گپ لگاؤں۔ آپ رک جائیے مما ورنہ میں واپس چلی جاؤں گی۔''

''تم اب کہیں نہیں جاؤ گی، بیٹھو ادھر آرام سے۔'' مسز یاسین بیگ نے آہستہ سے کہا اور گاڑی کی چابیاں اٹھا کر باہر کا رخ کیا۔ وہ بے بسی سے صوفے پر ڈھے گئی۔

''تھینک یو عاصم بھائی! آنٹی نے بلاوجہ اتنی زحمت کی۔'' وہ انکساری سے ممنونیت سے بولی تو عاصم نے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آنٹی نے نہیں، عاصم نے زحمت کی ہے بھئی یہ گفٹس لے کر تو میں آیا ہوں۔''

''شکریہ عاصم بھائی! آپ کا بھی بہت بہت شکریہ۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہارا مجھے عاصم کے ساتھ بھائی کہنا اچھا لگ رہا ہے۔ پہلی بار کسی لڑکی نے مجھے اتنے خلوص سے بھائی کہا ہے لیکن عینی! میں یہاں جس مقصد کے لیے آیا ہوں وہ تو تم جانتی ہی ہو گی۔ ماما اور آنٹی ہماری شادی کرانا چاہتی ہیں مگر میں تمہاری مرضی اور رائے کو اہمیت دوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے ہاں مشرقی لڑکیوں کو شادی کے لیے زبردستی آمادہ کیا جاتا ہے۔ ان کی پسند، ناپسند کا خیال نہیں رکھا جاتا اور آگے چل کر ان کی ازدواجی زندگی میں طرح طرح کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے میرے خیال میں لڑکی کی رائے کو ضرور اہمیت دینی چاہیے۔ ہماری مائیں جو چاہتی ہیں وہ ان کی فطری خواہش ہے کیونکہ وہ آپس میں بہنیں بھی ہیں۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو، خوبصورت ہو، تعلیم یافتہ ہو اور باشعور ہو۔ تمہیں پورا حق ہے اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا۔'' عاصم نے سنجیدگی سے کہا۔

''عاصم بھائی! کیا آپ میری مدد کریں گے؟'' عینی کو اس کے خیالات نے متاثر بھی کیا اور کچھ کہنے کا حوصلہ بھی بخشا تو سنجیدگی سے آہستگی سے بولی۔

''ہاں! ہاں! کیوں نہیں؟ بولو کس قسم کی مدد چاہیے تمہیں مجھ سے۔ اخلاقی، سماجی، معاشی، سیاسی یا...... اسے کہیں کوئی پیار و یار کا چکر تو نہیں ہے۔ کسی کو دل تو

نہیں دے بیٹھیں؟'' عاصم نے مسکراتے ہوئے شوخ لہجے میں پوچھا۔

اس کے لبوں پر حیا آلود مسکراہٹ سج گئی۔ پلکیں آپ ہی آپ جھک گئیں۔

''ہوں، میں سمجھ گیا۔'' عاصم ہنستے ہوئے بولا۔ ''گیا بہت خوبصورت ہے وہ؟''

''بہت زیادہ''۔ وہ بڑے جذب سے بولی۔

''تم سے محبت کرتا ہے وہ؟''

''بہت زیادہ۔'' عینی نے علی کی محبت میں بھیگتے لہجے میں کہا۔

''اور کیا تم بھی اس سے محبت کرتی ہو؟''

''بہت زیادہ۔'' عینی نے شرماتے ہوئے اقرار کیا۔ تو وہ ہنس پڑا۔

''بھئی معاملہ تو سنگین لگ رہا ہے اور وہ بھی بہت زیادہ۔ اس ذات شریف کا، اس خوش نصیب کا نام پوچھ سکتا ہوں؟'' پھر اس نے جواب دینے سے پہلے ہی جلدی سے بولا'' اب اس کے جواب میں بھی ''بہت زیادہ'' نہ کہہ دینا خدا کے واسطے''۔

''محمد علی نام ہے ان کا۔'' عینی نے ہنستے ہوئے شرمیلے پن سے بتایا۔

''ان کا؟'' عاصم نے چھیڑنے والے انداز میں کہا تو وہ شرما کر ہنس پڑی۔

''کیا فلموں میں کام کرتے ہیں وہ؟''

''نہیں پپا کی کمپنی میں کام کرتے ہیں۔ مارکیٹنگ سپروائزر ہیں۔''

''اچھا! میں سمجھا فلمی ہیرو ہیں، موصوف۔ تو پپا کے آفس میں ہی ملاقات ہوئی ہو گی ان سے اور پھر سلسلہ چل نکلا ہو گا۔ ہے نا؟'' وہ شوخی سے بولا۔

''نہیں عاصم بھائی! میں نے تو علی کو شادی کی رات ہی دیکھا تھا۔''

''کیا! شادی کی رات؟'' عاصم پر تو جیسے حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ اچھل کر بولا۔

''جی عاصم بھائی! علی سے میری پہلی ملاقات شادی کی پہلی رات ہی کو ہوئی تھی

اور یہ سلسلہ بھی شادی کے بعد ان کی محبت کی وجہ سے ہی چل نکلا ہے۔''

''تو تمہاری شادی ہوگئی ہے؟''

''جی عاصم بھائی! ڈیڑھ ماہ قبل میری شادی علی سے ہوگئی تھی۔

عینی نے علی سے شادی کی وجہ اور حالات پوری تفصیل سے اسے کہہ سنائے۔

''عاصم بھائی! میں علی سے علیحدگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ آپ ہی پپا کو سمجھایئے نا''۔

''تم فکر نہ کرو میں بات کروں گا ان سے۔'' عاصم نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اور جب علی تمہیں چھوڑنا نہیں چاہتے تو یہ مسئلہ خود بخود تمہارے حق میں حل ہو جائے گا۔''

''آپ کو برا تو نہیں لگا عاصم بھائی!''

''ارے نہیں عینی!'' وہ خوشدلی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''بلکہ مجھے تو اس بات کی خوشی ہو رہی ہے کہ تم اپنا گھر آباد رکھنا چاہتی ہو اور مجھے ایک عدد پیاری سی بہن مل گئی ہے۔ مجھے ناراض ہونے یا برا ماننے کی کیا ضرورت ہے۔ میں بڑے کھلے دل کا مالک ہوں۔ زبردستی رشتے جوڑنے کا قائل نہیں ہوں۔ اسی لیے تم سے بات کرنے چلا آیا۔ اب چونکہ بات کلیئر ہوگئی ہے تو میں مطمئن ہوگیا ہوں۔ میں ماما اور آنٹی کو بھی سمجھاؤں گا اور انکل کے لیے تو میرا خیال ہے کہ علی ہی کافی ہوں گے۔ شاید مجھے کسی کو بھی کچھ سمجھانے کی ضرورت نہ پڑے۔ بہرحال تم پریشان مت ہو۔ میں ہر طرح سے تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں مگر تمہیں بھی میری مدد کرنا ہوگی۔''

''کیسی مدد عاصم بھائی؟''

''شادی کرانے میں مدد کرانا ہوگی۔'' عاصم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آخر مجھے بھی تو گھر بسانا ہے۔ ماما میری شادی کرائے بغیر چین سے نہیں بیٹھنے دیں گی مجھے۔''

''تو کوئی لڑکی پسند کی آپ نے؟'' عینی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ تو بچپن سے ہی لندن میں مقیم رہے ہیں۔ وہاں کوئی لڑکی پسند نہیں آئی آپ کو؟''

''ایک لڑکی پسند تو آئی تھی لیکن بات کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ بھی شادی شدہ ہے تمہاری طرح۔ بس پھر میں نے اپنا معاملہ قسمت پر چھوڑ دیا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ہنس پڑی اور پھر بولی۔

''آپ تو بہت سمارٹ ہیں، اتنے اچھے دل کے مالک ہیں۔ آپ کے لیے لڑکیوں کی کیا کمی؟ آپ تو جسے بھی پرپوز کریں گے وہ جھٹ سے مان جائے گی۔''

''تم مجھے بہن کی نظر سے دیکھ اور سوچ رہی ہو نا اسی لیے تمہیں مجھ میں خوبیاں ہی خوبیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ ارے سسٹر! دیکھنے والے تو بلا کی نظر رکھتے ہیں۔'' عاصم نے ہنس کر کہا۔

''یقیناً رکھتے ہوں گے بلا کی نظر لیکن آپ بھی بلا کے اچھے انسان ہیں۔ یقین کیجیے عاصم بھائی مجھے آپ سے مل کر آپ سے باتیں کرتے ہوئے قطعی یہ احساس نہیں ہو رہا کہ میں آپ سے آج پہلی بار مل رہی ہوں۔ بلکہ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے آپ سے میری بہت پرانی دوستی ہے۔ آپ سے بات کر کے میرے دل کا بوجھ ہلکا سا ہوگیا ہے۔'' عینی نے سنجیدگی سے صاف گوئی سے کہا۔

''تم سے بات کر کے مجھے بھی دلی مسرت ہوئی ہے۔ اور بہنا جی! ہم تو ایسے زندہ دل انسان ہیں۔ تم ہمیں اپنا بھائی ہی نہیں دوست بھی سمجھو۔'' عاصم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو چلیے اسی خوشی میں آئس کریم کھاتے ہیں۔ فریزر میں موجود ہوگی۔ میں آئس کریم بہت شوق سے کھاتی ہوں اس لیے مما آئس کریم ضرور منگوا کر رکھتی ہیں۔'' عینی نے مسکراتے ہوئے کہا اور کھڑی ہوگئی۔

''آئس کریم کھانے سے انکار ناممکن ہے، چلو پھر ہو جائے آئس کریم سے انصاف۔''

وہ بھی مسکراتا ہوا اٹھ گیا اور کچن میں جا کر دونوں نے خوب آئس کریم کھائی۔ عاصم سے باتیں کر کے وہ بہت ہلکی پھلکی ہوگئی تھی۔ لمبا گورا چٹا، براؤن

آنکھوں اور براؤن بالوں والا عاصم بہت ہینڈسم تھا۔ وہ اسے اپنے بھائی کی حیثیت سے اور بہن کی نظر سے دیکھ رہی تھی تو وہ اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ورنہ علی کے علاوہ وہ کسی دوسرے مرد کو اتنے غور سے دیکھنے کی روادار بھی نہ تھی اور اسے علی سے زیادہ وجیہہ مرد کوئی دوسرا دکھائی بھی نہیں دیتا تھا۔

شام کو جب علی کے آنے کا وقت ہو گیا تو وہ باہر لان میں آ گئی۔ مسز یاسین بیگ اپنے بیڈ روم میں سو رہی تھیں یاسین بیگ آفس سے نہیں آئے تھے۔ عاصم اپنی نیند پوری کر کے نہا دھو کے اس کے پاس لان میں ہی آ گیا۔ شام کے چار بجے بھی اچھی خاصی دھوپ اور تپش پھیلی ہوئی تھی۔ چند منٹ تو وہ اس سے آرام سے باتیں کرتا رہا آخر گرمی سے تنگ آ کر بولا۔

''سسٹر! میں تو اس گرمی میں پگھل جاؤں گا۔ آخر کیا مزہ آ رہا ہے تمہیں اس گرمی میں واک کرنے کا؟''

''انتظار کا اپنا مزہ ہوتا ہے۔ عاصم بھائی!'' وہ ہنس کر بولی۔

''دھوپ میں کیا سائے کا انتظار ہو رہا ہے؟''

''جی ہاں! سائے کا، ٹھنڈے اور مہربان سائے کا انتظار ہو رہا ہے۔'' اس نے شرمیلی مسکان لبوں پر سجا کر کہا اس کی نظریں گیٹ کی طرف مرکوز تھیں۔ ''میں تو اندر جا رہا ہوں۔ تمہارا ٹھنڈا اور مہربان سایہ آ جائے تو مجھے بھی اس سے ملوا دینا۔'' عاصم نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور ایک دم ہی اس کی ہنسی کو بریک لگ گئی۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی علی نے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا تھا اور اس کے دیکھنے پر واپس باہر چلا گیا۔

''کیا ہوا سسٹر! کا کوئی خوفناک بھوت دیکھ لیا ہے جو تمہارا رنگ اور ہنسی دونوں فق ہو گئے ہیں؟'' عاصم نے اس کی زرد ہوتی رنگت کو دیکھتے ہوئے تشویش آمیز لہجے میں پوچھا اس کی نظر چونکہ گیٹ کی جانب نہیں تھی اس لیے وہ علی کو دیکھ بھی نہیں سکا تھا۔

''جی! نن، نہیں عاصم بھائی! بس اچانک میری طبیعت خراب ہونے لگی ہے۔ بہت عجیب سا محسوس ہو رہا ہے۔'' اس نے ڈوبتے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''اوہو! تو اندر چلو نا یہاں کیوں گرمی میں جل رہی ہو۔ تمہارے مجازی خدا تشریف لائیں گے تو چوکیدار بتا دے گا۔''

''آپ جائیے میں ابھی آتی ہوں۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''اوکے اب آ جانا۔ توبہ کس بلا کی گرمی ہے میں تو اپنے بیڈ روم میں جا رہا ہوں، ابھی نہا کر آیا تھا، یہاں دوبارہ پسینے میں نہا گیا ہوں۔'' وہ مسکراتا ہوا بولا اور اندر چلا گیا۔ عینی نے گیٹ کی جانب نگاہ دوڑائی چوکیدار غائب تھا۔

''یا اللہ! خیر کرنا، علی نجانے کیا سمجھ رہے ہوں گے؟'' اس نے ڈرتے دل سے دعا کی۔

''چوکیدار کیا گھر میں کوئی مہمان آیا ہے؟'' علی چوکیدار سے پوچھ رہا تھا۔

''جی صاحب! لندن سے عاصم صاحب آئے ہیں۔ رات ہی آئے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا! جاؤ عینی بی بی کو بھیجو، ان سے کہو میں لینے آیا ہوں۔'' علی نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا تو وہ ''بہتر صاحب'' کہہ کر اندر آ گیا۔

''چھوٹی بی بی! علی صاحب نے آپ کو لینے آئے ہیں، باہر کھڑے ہیں۔ آپ کو بلا رہے ہیں۔'' چوکیدار نے اسے لان میں آ کر بتایا۔

''اچھا چوکیدار! تم مما کو بتا دینا کہ میں علی کے ساتھ چلی گئی ہوں۔'' عینی نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بتا دوں گا چھوٹی بی بی!'' چوکیدار نے کہا۔ وہ باہر آئی تو علی موٹر بائیک سٹارٹ کیے کھڑا تھا، وہ سہمی ہوئی اس کے پیچھے خاموشی سے بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی علی نے بائیک تیزی سے آگے بڑھا دی۔ بائیک کی سپیڈ اتنی زیادہ تیز تھی کہ عینی کو اپنے گرنے کا خطرہ محسوس ہو رہا تھا اس نے علی کا شانہ مضبوطی سے پکڑ لیا، پہلی بار پکڑا

تھا اس طرح۔

''علی پلیز! آہستہ چلائیے میں گر جاؤں گی۔'' اس نے خوف بھری آواز میں کہا۔

''گر تو تم چکی ہو عینی بیگم! میری نظروں سے۔'' علی نے سخت لہجے میں کہتے ہوئے بائیک کی رفتار مزید بڑھا دی۔ وہ اس کے غصے سے کانپ اٹھی۔ آخر وہی ہوا جس کا اسے خدشہ تھا۔ وہ آنے والے وقت سے خوفزدہ تھی۔ نجانے وہ گھر لے جا کر اس کے ساتھ کیسا سلوک کرے گا؟

''علی آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟'' وہ پریشانی سے بولی۔

''صبر کرو، گھر پہنچ کر بتاؤں گا کہ میں کیسی باتیں کر رہا ہوں اور کیوں کر رہا ہوں۔ مکار عورت!'' علی نے بہت سخت غصیلے اور نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ وہ خوف سے کانپ گئی۔ گھر کے قریب پہنچ کر اس نے جھٹکے سے بائیک روکی۔ وہ گرتے گرتے بچی اور فوراً نیچے اتر گئی۔ علی کا چہرہ اور آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ کانپتی ٹانگوں سے چلتی اندر آئی۔ لاؤنج میں پہنچ کر وہ علی کا انتظار کرنے لگی۔ وہ گیلری میں بائیک کھڑی کر کے دروازہ لاک کر کے آندھی اور طوفان کی طرح لاؤنج میں داخل ہوا۔ بائیک کی چابی میز پر پھینک دی۔ اس کے خوف سے زرد چہرے کو دیکھا اور اس کے جبڑوں کو اپنے مضبوط ہاتھ میں جکڑ کر غصے سے بولا۔

''تو اس مقصد کے لیے تم میکے جانے کی ضد کر رہی تھیں۔ بولو؟''

''آپ...... کس مقصد کی...... بات کر رہے ہیں؟'' وہ روہانی ہو کر بولی۔

''میں عاصم سے ملاقات کی بات کر رہا ہوں، اتنی بھولی مت بنو۔ عینی بیگم!''

''یہ تو محض...... اتفاق تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ عاصم بھائی آئے ہوئے ہیں۔'' عینی نے کانپتی ٹوٹتی آواز میں کہا۔

''بکواس کرتی ہو، بیوقوف سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے؟ بولو۔'' علی نے اس کے چہرے پر تھپڑوں کی بوچھاڑ کر دی، وہ چیختی، تڑپتی، سسکتی صوفے پر جا گری۔

''تمہارے باپ کی دھمکی اور ذلت آمیز سلوک کے باوجود میں نے تم پر اعتبار کیا اور تمہیں تمہارے میکے تک خود چھوڑنے گیا اور تم......، اس گھٹیا منصوبے کا آغاز کرنے گئیں تھیں!، کس کس کو اپنے حسن و جمال کے جال میں پھنسا چکی ہو اب تک اور کس کس پر ابھی جال پھینکنا باقی ہے۔ بولو، جواب دو۔'' علی نے اس کا بازو سختی سے پکڑ کر اسے اٹھایا اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔

''میں نے...... کچھ...... نہیں کیا۔'' وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

''کچھ نہیں کیا تم نے ہاں؟'' علی نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر بری طرح جھنجھوڑا۔ ''میں سمجھ رہا تھا کہ میری محبت نے تمہارے باپ کی بے جا پابندی کا طوق تمہارے گلے سے اتار پھینکا ہے۔ جبھی تم مجھے اپنے محبت بھرے لمس سے، پر امید جملوں سے نواز رہی ہو لیکن وہ میری خوش فہمی تھی۔ تم نے تو میکے جانے اور عاصم سے ملنے کی راہ ہموار کی تھی۔ بہت اچھی اداکاری کر لیتی ہو تم۔ محبت کا ڈراما بنانا خوب آتا ہے تمہیں۔ تمہارا باپ مجھے طعنے دے رہا تھا کہ میری بیٹی تمہارے ڈربے نما فلیٹ میں نہیں رہ سکتی۔ تم اس کے اخراجات پورے نہیں کر سکتے۔ تیس ہزار پاکٹ منی تم ان عیاشیوں پر خرچ کرتی ہو، یہ تو اب معلوم ہوا ہے۔ تم انتہائی گھٹیا عورت ہو۔ تمہیں تو مذہب کا بھی پاس نہیں ہے۔ اپنے اور میرے رشتے کا کچھ تو پاس لحاظ رکھا ہوتا، گناہ کرنے کے لیے مجھ سے رشتہ جوڑنا ضروری تھا کیا؟'' وہ انتہائی سخت، کرخت اور تضحیک آمیز لہجے میں بول رہا تھا۔

''ہر گناہ گار گناہ کرنے کے بعد یہی کہتا۔ تم نے میرا اعتبار، میرا پیار پارہ پارہ کر دیا ہے اور اب میں تمہیں پارہ پارہ کر دوں گا۔'' علی نے اس کے دائیں رخسار پر اتنے زور سے ہاتھ مارا کہ وہ صوفے کے ہتھے کے کونے سے بڑے زور سے ٹکرائی اس کے لبوں سے درد بھری چیخ نکل گئی۔ اس کا ہاتھ بے اختیار گردے اور ناف کی جگہ پر گیا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے اندر سے کسی نے اس کا وجود تیز دھار چھری سے کاٹ دیا ہے۔ وہ درد اور تکلیف سے بری طرح تڑپ رہی تھی۔ بے دم

سی ہو کر وہ صوفے کی سائیڈ سے تکلیف سے بری تڑپ رہی تھی۔ بے دم سی ہو کر وہ صوفے کی سائیڈ سے لگ گئی۔ اسے اپنا دم نکلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور محبوب شوہر جو اس وقت دشمن جاں بنا ہوا تھا اس پر مسلسل طنز کے نشتر چلا رہا تھا اور اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

''علی ...... م ...... میں نے ...... آپ سے کوئی ...... بے وفائی ...... نہیں کی ...... دھوکا ...... نہیں دیا۔ جھوٹ نہیں بولا۔'' اس نے ہمت کر کے اٹک اٹک کر کہا۔

''بکواس کرتی ہو۔'' علی نے اس کا بازو پکڑ کر زور سے کھینچا تو اس کی درد بھری چیخ فضا میں بکھر گئی۔ اس کا ہاتھ ابھی تک ناف پر تھا۔ کھڑے ہونے کی اس میں ہمت نہیں تھی وہ تکلیف سے نڈھال و نیم جان لڑکھڑا رہی تھی۔ علی نے اسے اس بے دردی سے مارا تھا اور اب اس کا بازو جکڑ رکھا تھا۔ اس کا روم روم درد اور تکلیف سے بلک رہا تھا، چہرہ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔

''کل دوپہر کیا تمہاری مما کا فون نہیں آیا تھا۔ انہوں نے تمہیں یہ ساری اداکاری کرنے کی ہدایت نہیں دی تھی؟ تم فون سننے کے بعد ہی کمرے میں آ کر میرا سر دبانے کی مہربانی کر رہی تھیں۔ جھوٹ، فریب، دھوکا نہیں تھا وہ تو اور کیا تھا؟''

''فون ...... آ ...... آپ کے ...... دوست کا تھا۔'' اس نے سسکتے ہوئے بمشکل کہا۔

''میرے دوست کا تھا یا تمہارے دوست کا تھا؟'' علی نے ایک اور طمانچہ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ وہ ہچکیاں لے لے کر تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔

''آپ ...... زیا ...... دتی ...... کر رہے ہیں۔ غلط ...... سمجھ ...... رہے ہیں۔'' اس نے اس تکلیف کے باوجود اس الزام پر اس تہمت پر احتجاج کیا۔

''تم غلط ہو اس لیے غلط ہی سمجھ رہا ہوں۔ تم تو میری سمجھ میں آئی ہی اب ہو۔ عینی بیگم! سارے اتفاقات تمہارے ساتھ ہی رونما ہوئے ہیں۔ زاہد قریشی ایک منٹ میں تم پر فریفتہ ہو گیا۔ واہ! کیا کہانی گھڑی ہے۔ بیوقوف سمجھتی ہو تم مجھے۔ احمق

سمجھا ہے تمہارے باپ نے مجھے۔ نجانے کب سے اس بڈھے سے تعلقات ہوں گے۔ اس کی دولت اور اپروچ سے تمہارے باپ نے اپنا بزنس جما لیا تو تمہیں اس بڈھے سے کوئی دلچسپی نہ رہی اور تم نے اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے مجھے پھنسا لیا۔ اس طرح اس بڈھے سے نجات حاصل کر لی اور اب تم مجھ سے طلاق لے کر عاصم سے شادی کرنا چاہتی ہو۔'' وہ غصیلے اور سخت لہجے میں زہر اگل رہا تھا۔ اس کی ذات کی اس کی عزت کی، اس کی محبت و کردار کی دھجیاں بکھیر رہا تھا اور وہ اندر ہی اندر زخمی ہو رہی تھی، مر رہی تھی۔

''نہیں ...... میں تو آج پہلی ...... بار ...... عا ...... صم ...... سے ملی تھی۔'' عینی نے مری مری آواز میں کہا۔

''اور پہلی ملاقات میں ہی اسے اپنی زلفوں کا اسیر بنا لیا ہے نا ...... اس نے اس کے بالوں کو مٹھی میں پکڑ کر کھینچتے ہوئے طنزیہ اور غصیلے لہجے میں کہا۔'' میں ڈیڑھ ماہ سے تمہاری محبت، مسکراہٹ اور قربت کو ترس رہا ہوں۔ میرے لیے تمہارے پاس ایک مسکراہٹ، ایک ہنسی، ایک پیار بھری نگاہ، ایک محبت بھری بات تک نہیں تھی۔ حالانکہ میں شوہر ہوں تمہارا۔ تم مجھ سے گریز کرتی، بچتی رہیں اور وہ عاصم ...... ایک دن میں تمہاری ہنسی، مسکراہٹ اور شرمیلی اداؤں کا مستحق بن بیٹھا۔ اس سے تو تم بہت ہنس ہنس کر، شرما شرما کر باتیں کر رہی تھیں اور مجھ سے بات تک کرنا گوارہ نہیں تھا تمہیں ...... میرے لیے، اپنے شوہر کے لیے تو تم ایک دن بھی نہیں سجی سنوریں اور عاصم کے لیے ...... یہ بناؤ سنگھار کر کے گھر سے نکلی تھیں۔ تمہارا سجنا سنورنا ایک نامحرم شخص کے لیے تھا۔ تمہارا حسن غیروں کے لیے تسکین کا سامان ہے اور میں ...... میں جو تمہارا شوہر ہوں، مجازی خدا ہوں، تم پر پورا حق رکھتا ہوں۔ مجھے تم ترساتی رہی ہو اب تک۔ اپنے حسن کے جلوؤں سے اور کس کس کو فیض یاب کیا تم نے۔ زاہد قریشی اور عاصم کے علاوہ؟ مجھے تو تم مجبوراً برداشت کر رہی تھیں ناں۔ دل سے کس کس کو اپنے وجود کی سپردگی پیش کرتی رہی اب تک، آج بتا ہی دو۔''

"علی ...... آپ ...... غلط ...... سوچ رہے ہیں۔ میں نے ...... کوئی ...... غیر اخلاقی، حرکت نہیں کی ...... کسی نے مجھے ...... نہیں چھوا سوا ...... ئے ...... آپ کے ...... آپ ...... توہین کر رہے ...... ہیں ...... میری ...... میں نے ...... آپ کو ...... چاہا ...... ہے صرف ...... آ ......" وہ روتے ہوئے اپنی صفائی پیش کر رہی تھی۔

"کس کس کو چاہنے کے بعد مجھے اس قابل سمجھا ہے تم نے؟" وہ اسی لہجے میں بولا۔

"بس کریں" وہ پوری قوت سے چیخی مگر آواز تب بھی مدھم تھی۔ "میں نے ...... کچھ نہیں کیا ...... کچھ نہیں کیا ...... بے قصور ہوں میں ...... آپ ...... شکی ہیں۔ آپ کو تو ...... اپنی ...... اپنی محبت پر بھی ...... اعتبار ...... نہیں ہے۔ آ ...... آپ مجھ پر ...... کیا اعتبار کریں گے ...... میں غلط ...... نہیں ہوں ...... آپ غلط ...... ہیں۔"

"شٹ اپ!" علی نے پوری قوت سے تھپڑ اس کے رخسار پر جڑ دیا وہ بری طرح درد سے بلبلا اٹھی اور نیچے کارپٹ پر گرتے ہی اس کی دل دوز چیخیں نکل گئیں، وہ درد سے تڑپنے لگی۔

"بکواس کرتی ہو تم، اپنا گناہ، اپنی غلطی، اپنا قصور میرے کھاتے میں ڈال رہی ہو۔ دفعہ ہو جاؤ، اپنے کمرے میں۔ اور خبردار جو باہر نکلیں میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔" علی نے غصے سے چلا کر کہا مگر اس میں تو ہلنے جلنے کی بھی سکت نہیں تھی، غصے کی ہمت کہاں سے لاتی۔ وہ اوندھے منہ پڑی درد اور تکلیف سے تڑپ رہی تھی رو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی سسکیوں اور ہچکیوں کی آواز ختم ہو گئی۔ تو علی نے شعلہ بار نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سنا نہیں تم نے؟ اٹھو اور بیڈ روم میں جاؤ۔" وہ اپنے ہوش و حواس میں ہوتی تو اس کے حکم پر کوئی حرکت کرتی نا۔ وہ ویسے ہی بے حس و حرکت پڑی رہی اور غصے سے دیکھتا کچن میں آ گیا۔ فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور منہ سے لگا کر ایک ہی سانس میں آدھی بوتل خالی کر دی۔ اور باقی کی آدھی اپنے چہرے پر انڈیل لی

اور اپنی آستینوں سے چہرہ صاف کرتا ہوا لاؤنج میں آیا تو عینی کو اسی حالت میں اوندھے منہ بے سدھ لیٹے دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا اور تیزی سے اس کے قریب آیا اس کا شانہ پکڑ کر اسے سیدھا کا تو اس کی اپنی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ عینی کے منہ سے خون بہہ رہا تھا، چہرہ آنسوؤں، تھپڑوں اور خون کے نشانات سے بھرا ہوا تھا۔ علی کا دل اب کے بڑی بری طرح تڑپا، اس نے اس کے سر کو اوپر اٹھا کر رومال سے اس کا چہرہ صاف کیا اور بے قراری سے اسے پکارنے لگا۔

"عینی، عینی آنکھیں کھولو۔ عینی! عینی پلیز آنکھیں کھولو۔ عینی! اور خدایا! یہ مجھ سے کیا ہو گیا خدایا! رحم کر۔"

وہ اسے وہیں چھوڑ کر ٹیلی فون کی طرف لپکا اور خان لالہ کا نمبر ڈائل کیا۔ فون خان لالہ نے ہی ریسیو کیا۔ وہ فوراً گھبراتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "خان لالہ! میں علی بول رہا ہوں، تم اپنی گاڑی لے کر فوراً میرے گھر پہنچو، عینی بے ہوش ہو گئی ہے، اسے فوراً ہسپتال پہنچانا ہے۔"

"تم پریشان مت ہو، ہم آتا ہے ابھی انتظار کرو۔" خان لالہ نے اسے تسلی دی اور فون بند کر دیا۔ علی بھاگ کر عینی کے پاس آیا اسے ایسا لگا کہ جیسے وہ ہمیشہ کے لیے سو گئی ہے۔

"عینی!" اس نے گھبرا کر اس کے دل پر ہاتھ رکھا، دل کی دھڑکن بہت مدھم تھی وہ مزید پریشان ہو گیا۔ پانچ منٹ بعد وہ اسے خان لالہ کی گاڑی میں لٹا کر ہسپتال روانہ ہو گیا۔

ہسپتال کے کوریڈور میں وہ بے تابانہ ٹہل رہا تھا۔ خان لالہ! اس کی حالت دیکھ کر الگ پریشان ہو رہا تھا اور عینی کی حالت کا سوچ سوچ کر علی کا سارا غصہ ہرن ہو گیا تھا۔ دل سے غصے اور شک کے بادل بھی چھٹ گئے تھے۔ عینی کی پاکیزہ، معصوم، حسین صورت پوری آب و تاب کے ساتھ اس کے دل کے آئینے میں جگمگانے لگی تھی۔ اس کی باتوں پر اسے اعتبار آ رہا تھا مگر اب کیا فائدہ تھا؟ غصہ تو وہ

اس پر نکال چکا تھا۔ تشدد کر چکا تھا۔ اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا تھا اس نے۔

''مسٹر علی! آپ ہی ہیں؟'' ڈاکٹر ہما ایمرجنسی روم سے باہر نکل کر سیدھی اس کی طرف آئیں۔

''جی ڈاکٹر صاحبہ! میں ہی علی ہوں۔ عینی کیسی ہے کیا ہوا ہے اسے۔ ہوش آ گیا عینی کو کہ نہیں؟'' علی نے بے تابی و بے قراری سے پوچھا۔

''مسٹر علی! اس کاغذ پر فوراً دستخط کر دیجیے۔ آپ کی مسز کا فوری طور پر آپریشن ہوگا، ان کا اپینڈکس پھٹ گیا ہے۔'' ڈاکٹر ہما نے ایک کاغذ اور قلم کلپ بورڈ سمیت اس کی طرف بڑھا کر کہا۔

''کیا؟ او نو۔'' علی کے تو پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی، ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

''پلیز مسٹر علی! دیر نہ کیجیے۔ آپ کی مسز کی حالت خطرے میں ہے۔ آپ انہیں یہاں لانے میں پہلے ہی خاصی دیر کر دی ہے۔ یہاں دستخط کر دیجیے۔'' ڈاکٹر ہما نے معاملے کی سنگینی سے اسے آگاہ کیا تو اس نے کانپتے ہاتھوں سے دستخط کر دیئے۔ ڈاکٹر ہما واپس چلی گئیں۔ چند لمحوں بعد عینی کو آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا گیا۔ علی اور خان لالہ آپریشن تھیٹر کے باہر پریشانی کے عالم میں ٹہل رہے تھے اور علی کو اب یاد آ رہا تھا کہ اس نے کس بے رحمی سے عینی کو مارا تھا۔ وہ صوفے کے کنارے سے ٹکرائی تھی اور چیخ اٹھی تھی اس کا ہاتھ اپینڈکس کے مقام پر سے ہٹ نہیں رہا تھا۔ وہ شدید تکلیف سے بلبلا رہی تھی اور اسے اس کی حالت پر ذرا بھی رحم نہیں آیا تھا۔ اس نے اس کی تکلیف کو بھی اداکاری سمجھا تھا اور اسے مزید تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ وہ بے بسی، دکھ، ملال اور ندامت سے آپریشن تھیٹر کے بند دروازے کو تک رہا تھا کہ اچانک ہی غصے میں آ کر اس نے اپنے ہاتھوں کو دیوار میں دے مارا۔

''اوئے ہوئے علی بابا! کیا کرتے ہو اپنے ہاتھ توڑو گے کیا؟'' خان لالہ نے

اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر سہلاتے ہوئے کہا۔

''کاش! یہ ہاتھ اس پر اٹھنے سے پہلے ٹوٹ گئے ہوتے۔'' وہ بھابی سے بولا۔

''لگتا ہے تم نے بیگ صاحب کا غصہ ہماری بھابی پر نکالا ہے۔ یارا یہ تو بہت غلط بات ہے۔ تم اپنے غصے کو قابو نہیں کر سکتا تھا؟ کل ہم نے تم کو گھر فون کیا تھا تم تو مزے سے اپنے کمرے میں آرام کر رہا تھا اور ہم ادھر پریشان ہو رہا تھا کہ تم فون کیوں نہیں کیا۔ ہم نے خود فون کیا تو بھابی نے ہم کو بتایا کہ تم خیریت سے پہنچ گیا ہے۔ بہت بے پروا اور خطرناک ہو جاتا ہے تم غصے میں۔ اپنا بھی نقصان کرتا ہے اور اپنے پیاروں کا بھی۔'' خان لالہ نے تاسف سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو کل دوپہر! تم نے فون کیا تھا لالہ؟'' وہ حیرت، ندامت اور تاسف سے بولا۔

''ہاں! ہم نے فون لیا تھا تمہارے گھر۔'' خان لالہ کے اقرار نے اسے زمین میں گاڑ دیا۔

''او میرے خدایا!'' اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر گرا لیا۔ ''عینی بھی تو یہی بتا رہی تھی لیکن میں نے یقین نہیں کیا۔

''مگر اس بات کا تم یقین کرو کہ وہ تم سے بہت پیار کرتی ہے۔ تمہارے ساتھ بسنا، آباد رہنا چاہتی ہے۔ ہم کو اس سے بات کر کے اندازہ ہو گیا تھا ہم تو خوش ہوا تھا کہ جب میاں بیوی ''عینی علی'' راضی تو کیا کرے گا ''یاسین بیگ'' مگر تم نے تو ادھر...... معاملہ ہی زندگی اور موت کا کھڑا کر دیا ہے۔'' خان لالہ نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

''خان لالہ! اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گا۔'' وہ پرنم لہجے میں بولا تو وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''فی الحال! تو تم اس کی زندگی کی دعا مانگو۔ انشاء اللہ، اللہ اچھا کرے گا''۔

''اللہ تو اچھا کرے گا لالہ! مگر میں نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔'' وہ دیوار

سے ٹیک لگا کر آزردگی سے بولا۔

''تم نے تو اپنے ساتھ بھی اچھا نہیں کیا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو لالہ! یہ سب میں نے اپنے ساتھ ہی تو کیا ہے اور اچھا نہیں کیا ہے۔ بہت برا کیا ہے۔ اللہ کرے عینی کا آپریشن کامیاب ہو جائے وہ بچ جائے تو میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔ وہ مجھے معاف تو کر دے گی نا لالہ!''

''یار! عورت کا دل بہت نرم اور نازک ہوتا ہے وہ اپنے مرد کا، محبوب کا ہر ظلم ہر زیادتی بڑی بہادری سے برداشت کر لیتی ہے اور اس کی ذراسی معافی کی بات پہ اس کے لیے محبت کی معافی کی دیوی بن جاتی ہے اور عینی بھابی تو تم سے بہت پیار کرتی ہے وہ تم کو ضرور معاف کر دے گی بس تم اس کی زندگی کی دعا مانگو۔'' خان لالہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی آمیز لہجے میں کہا تو وہ خضوع کے ساتھ دل میں اپنے رب سے عینی کی زندگی اور صحت یابی کی دعا مانگنے لگا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا، لیڈی ڈاکٹر ہما باہر آئیں، ساتھ ہی ایک نرس بھی تھی۔ ڈاکٹر ہما نے علی کی جانب ایک پرچی بڑھا دی اور بولیں۔

''مسٹر علی! آپ فوری طور پر ان دواؤں اور انجیکشنز کا بندوبست کریں۔''

''بہتر ڈاکٹر صاحبہ! عینی ٹھیک تو ہو جائے گی ناں۔'' علی نے پرچی پکڑے بے چینی سے پوچھا۔

''کچھ کہا نہیں جا سکتا مسٹر علی!'' ڈاکٹر ہما نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''ہم نے آپریشن تو کامیابی سے مکمل کر دیا ہے لیکن ان کی زندگی ابھی تک خطرے میں ہے۔ آپ دعا کیجیے اگلے دو گھنٹے ان کے لیے بہت اہم ہیں، اگر وہ دو گھنٹے تک سروائیو کر جاتی ہیں تو ان کے زندہ بچ جانے، ہوش میں آ جانے کے چانسز ہیں ورنہ ......''

''یا اللہ! کرم کر پروردگار!'' علی نے تڑپتے دل سے بے اختیار دعا مانگی۔

''لاؤ علی بابا یہ پرچی ہم کو دو، دوائیں وغیرہ ہم لے کر آتا ہے۔ خان لالہ

نے اس کی پریشانی دیکھتے ہوئے پرچی اس کے ہاتھ سے لے لی۔

''یہ پیسے لیتے جاؤ لالہ!'' علی نے اپنے والٹ میں سے ہزار ہزار کے تین نوٹ نکال کر اسے تھما دیئے، وہ پیسے اور نسخے والی پرچی لے کر چلا گیا۔

''مسٹر علی! آپ میرے ساتھ میرے آفس میں آیئے۔'' ڈاکٹر ہما نے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور اپنے آفس کی جانب بڑھ گئیں۔ وہ حیران پریشان ان کے پیچھے پیچھے چلتا ان کے آفس میں آ گیا۔ ڈاکٹر ہما نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اسے بھی سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''تشریف رکھیے مسٹر علی!''

''جی شکریہ!'' علی ان کے سامنے میز کے پیچھے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا اس کا دل خوف سے دھڑک رہا تھا کہ نجانے وہ عینی کے متعلق اسے کیا بتانے والی ہیں، اس سے کیا پوچھنے والی ہیں؟''

''مسٹر علی! کیا آپ کا آپ کی مسز سے کوئی جھگڑا ہوا تھا؟'' ڈاکٹر ہما نے بلا تمہید سوال کیا تو وہ بہت افسردگی سے بولا۔

''جھگڑا، نہیں ڈاکٹر صاحبہ! اس معصوم کو تو جھگڑنا بھی نہیں آتا۔ ہم میاں بیوی میں بہت محبت ہے، بہت زیادہ محبت ہے ڈاکٹر۔''

''تو ان کی یہ حالت کس طرح ہوئی ہے؟ مسٹر علی! میں ڈاکٹر ہوں اور آپ کی مسز کے مکمل چیک اپ کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ان پر شدید قسم کا تشدد کیا گیا ہے اور کوئی ڈنڈے ٹائپ چیز ان کے اس قدر زور سے لگی ہے کہ ان کا اپنڈکس پھٹ گیا ہے۔ ان کے ہونٹ پھٹ کر سوج چکے ہیں۔ ان کے مسوڑوں اور جبڑوں پر بھی سوجن بڑھ رہی ہے اور انکا چہرہ کسی کی انگلیوں کی تشدد آمیز نشانات سے بھرا پڑا ہے۔ ان کے بازوؤں پر نیل پڑ گئے ہیں۔ مائی گاڈ! اتنا شدید ایسا بے رحمانہ سلوک اگر آپ نے ان کے ساتھ نہیں کیا تو اور کس نے کیا ہے؟ یہ تو سیدھا سادہ پولیس کیس ہے اور ہمارے ہوسپٹل میں ایسے کیس اکثر آتے رہتے ہیں۔ جن میں بیوی شوہر کے

ظلم وتشدد کا شکار ہو کر آتی ہے۔ یا شوہر کے ہاتھوں جل کر موت کی وادی میں اترتی مظلوم عورت یہاں لائی جاتی ہے۔ زخمی، جلی ہوئی اور دل کی تکلیف کے ساتھ ایسی کئی خواتین میری پیشنٹ رہ چکی ہیں۔ بہت افسوس ہوا ہے مجھے آج آپ کی مسز کو دیکھ کر یہ تو اکثر اس ہوسپٹل میں آتی رہتی ہیں۔ ابھی ڈھائی ماہ پہلے انہوں نے تین ہزار روپے دے کر ایک غریب عورت کا آپریشن کروایا تھا۔ میں نے بھی کئی بار دیکھا ہے اور نرس بھی مجھے بتا رہی تھی کہ وہ ہوسپٹل میں تقریباً ہر ماہ مریضوں سے ملنے بھی آتی تھیں ان کے لیے پھول، پھل، دوائیں وغیرہ لایا کرتی تھیں۔ تین ماہ بعد نرس اور خود میں نے انہیں دیکھا تو اس حالت میں کہ ہمارا اپنا دل ڈوبا جا رہا ہے۔ وہ نرس بے چاری تو رو رہی تھی آپ کی مسز کی حالت دیکھ کر...... یہ ہے تو آپ کا ذاتی معاملہ لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتی ہوں کے آپ کی مسز پر اس بے دردی سے، اس سفاکی اور بے رحمی سے کس نے تشدد کیا ہے اور کیوں کیا ہے؟''

ڈاکٹر ہما نے نہایت سنجیدہ لہجے میں اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اس سے پوچھا تو وہ جو شرم اور دکھ سے اندر ہی اندر ٹوٹ رہا تھا، بہ مشکل اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے بولا:

''ڈاکٹر صاحبہ! بعض لوگوں کو سچ بولنے اور محبت کرنے کی سزا اسی طرح سے دی جاتی ہے جس طرح عینی کو دی گئی ہے۔ عینی کی اس نیکی کا علم تو مجھے آپ کی زبانی ہوا ہے لیکن غصہ، غلط فہمی، بدگمانی، شک، نفرت اور انتقام یہ سب خوبیاں، خوبصورتیاں اور اچھائیاں کہاں دیکھ پاتے ہیں۔ یہ عینی کی زندگی کا ہی نہیں، میری زندگی کا بھی سب سے زیادہ سنگین، اذیت ناک اور تکلیف دہ واقعہ ہے۔ وہ ٹھیک تو ہو جائے گی نا ڈاکٹر صاحبہ''۔

''کیا آپ چاہتے ہیں کہ عینی صحت یاب ہو جائیں؟'' ڈاکٹر ہما نے حیرت اور بے یقینی سے پوچھا۔

''جی ہاں ڈاکٹر صاحبہ! اگر میری زندگی کے بدلے میں اسے زندگی اور صحت

مل سکتی ہو تو میں اپنی زندگی بھی عینی پر قربان کرنے کو تیار ہوں، میں اسے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ میری زندگی میں خوشی اور آسودگی کا احساس تو اسی کی وجہ سے ہے، اسی کے ہونے سے ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ نہ رہی تو میں کیسے جیوں گا؟ پلیز ڈاکٹر پلیز اسے بچا لیجیے۔ ورنہ میں مر جاؤں گا۔'' علی نے پرنم اور التجائیہ لہجے میں کہا تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

''آپ دعا کیجیے، دعا میں بہت اثر ہوتا ہے۔ میں ذرا آپ کی مسز کو چیک کر آؤں۔'' ڈاکٹر ہما نے سنجیدگی سے کہا اور وہاں سے اٹھ گئیں۔

وہ ان کے جاتے ہی بے اختیار ہو کر رو پڑا۔ بڑی مشکل سے آنسو ضبط کیے، صاف کیے اور خود بھی باہر آ گیا۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا، کوس رہا تھا۔

''یا اللہ! میں نے غصے میں آ کر بڑی غلطی کی ہے، عینی کو میرے غصے سے پہنچنے والی تکلیف سے نجات دلا دے مولا! اسے اچھا کر دے، صحت یاب کر دے۔ میں مانتا ہوں کہ غلطی میری تھی۔ غصہ حرام ہے اور میں نے غصہ کر کے اس کا اظہار کر کے اپنے لیے ہی دکھ کاٹا ہے۔ مجھے اپنا جرم قبول ہے مالک! میں اپنی خطا تسلیم کرتا ہوں۔ میں اپنا قصور مانتا ہوں۔ اے اللہ! اے ودود، اے غفور الرحیم تو تو معاف کرنے والا ہے، معافی کو پسند فرمانے والا ہے۔ مجھے بھی معاف فرما دے۔ اسے پہلے کی طرح صحت مند، زندگی سے بھرپور، زندہ دل عینی بنا دے۔ اے اللہ! یا سمیع، یا بصیر، یا علیم اگر میں نے اپنی زندگی میں کوئی ذرا سی بھی نیکی ہے تو مجھے اس کا اجر تو عینی کی زندگی، اس کی سلامتی اور صحت یابی کی شکل میں عنایت فرما دے۔ اے حی و قیوم، اے ظاہر اور باطن کے ماننے والے، میں تجھ سے اور کچھ نہیں مانگتا، صرف عینی کو پہلے کی طرح صحت مند، سلامت اور خوش باش رہنے کا فرمان جاری کر دے مالک! مجھے میرے اندھے انتقام اور غصے کی اتنی بڑی سزا نہ دینا کہ میں عینی سے، اس کی محبت سے محروم ہو جاؤں۔ اپنے حبیبؐ کے صدقے میں مجھے میری عینی لوٹا دے اور مجھے آئندہ نیک اور صحیح قدم اٹھانے کی توفیق عطا فرمانا۔ آمین، ثم

آمین!''

علی نے عشاء کی نماز میں رو رو کر گڑگڑا کر رب کے حضور دعا مانگی۔

عینی آئی۔سی۔یو میں تھی اور بدستور بے ہوش تھی۔علی آئی۔سی۔یو کے باہر بے کلی اور بے قراری سے اس کے ہوش میں آنے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔خان لالہ! ابھی تک اس کے پاس موجود تھا۔اس نے علی کو چائے پلانے، کھانا کھلانے کی کوشش کی مگر علی نے انکار کر دیا تھا۔ اس کی بھوک پیاس مر گئی تھی۔اس کا دھیان اور دل عینی میں اٹکا ہوا تھا۔اب اسے اس کے نرم ملائم محبت سے بھرپور لمس کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے سر میں عینی کے ہاتھ آہستہ آہستہ اپنی محبت بھری مسیحائی کا جادو جگا رہے تھے۔کل وہ کتنا خوش تھا اس کی محبت بھری مسیحائی پر اور آج وہ اتنا ہی دل گیر اور آزردہ تھا اس کی محبت اور مسیحائی پر شک اور غصہ کر کے۔

''ڈاکٹر صاحبہ! عینی کو اب تک ہوش کیوں نہیں آیا؟'' علی نے رات کے دس بجے بے حد پریشانی کے عالم میں ڈاکٹر ہما سے پوچھا تو وہ سنجیدہ اور قدرے ناامید لہجے میں بولیں۔

''مسٹر علی! آپ کی مسز کی حالت خطرے سے قدرے باہر تو آچکی ہے لیکن کچھ کہا نہیں جا سکتا، کیونکہ بظاہر جو زخم ہمیں ان کے جسم پر دکھائی دے رہے ہیں، وہ ان کے دل پر بھی لگے ہیں۔وہ شدید دلی اور ذہنی صدمے سے دوچار ہوئی ہیں اور اگر یہ شاک کی حالت بدستور برقرار رہی تو آئی۔ایم۔سوری ٹو سے ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔آپ خدا سے ان کی صحت یابی اور زندگی کی دعا کیجیے''۔

''او گاڈ!'' علی نے دکھ سے اپنا سر پکڑ لیا۔''ڈاکٹر صاحبہ! کیا میں عینی کو دیکھ سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے آپ انہیں دیکھ لیجیے، مگر خاموشی سے۔آیئے میرے ساتھ۔''

ڈاکٹر ہما نے اس کی بے چینی اور پریشانی کو دیکھتے ہوئے اجازت دیتے ہوئے کہا اور اسے اپنے ساتھ آئی۔سی۔یو کی طرف لے آئیں۔جیسے ہی علی نے آہستہ

سے آئی۔سی۔یو میں قدم رکھا تو اسے ایسے محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے اس کے دل کو پاؤں تلے رکھ کر کچل دیا ہو۔عینی سفید بیڈ پر بے ہوش لیٹی ہوئی تھی۔اس کے بازو اور ہاتھ پر ڈرپ کی سوئی اور مختلف آلات لگے ہوئے تھے۔منہ پر آکسیجن ماسک لگا تھا۔اس کی ہارٹ بیٹ نارمل ہو چکی تھی۔ڈاکٹر ہما نے آکسیجن ماسک عینی کے منہ سے اتار دیا۔علی اس کے سرہانے کے قریب چلا آیا اور اپنا ہاتھ بہت آہستہ سے نرمی سے اس کے چہرے پر پھیرا۔اس کے ہونٹوں کی سوجن اس کی آنکھوں اور چہرے کا ورم اس کا دل کاٹ گیا اور اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔آنسو عینی کے چہرے پر جا گرے، جیسے اس سے اپنے ظلم کی معافی مانگ رہے ہوں۔

''عینی! پلیز ہوش میں آجاؤ، مجھے معاف کر دو عینی! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔میں جیتے جی مر جاؤں گا عینی! پلیز آنکھیں کھول دو عینی! بے شک تم مجھ سے بات نہ کرنا، میرے ساتھ نہ رہنا، لیکن زندہ تو رہنا عینی! تمہارا زندہ رہنا میرے زندہ رہنے کے لیے بہت ضروری ہے عینی! پلیز اب تو آنکھیں کھول دو۔''

علی نے اس کے چہرے سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اسے اپنے دل میں مخاطب کر کے کہا۔وہ بے خبر، بے سدھ، بے جان سی سفید بیڈ پر سفید روح کی طرح زخموں سے چور لیٹی تھی۔

''چلیے مسٹر علی، حوصلہ کیجیے، اللہ بہتر کرے گا۔'' ڈاکٹر ہما نے اس کی بے قراری دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا تو اس نے بازو کی آستین سے اپنے آنسو پونچھے اور عینی کے سر پر نرمی سے ہاتھ پھیر کر تڑپتا ہوا بے قراری میں اضافہ کیے آئی۔سی۔یو سے باہر آ گیا۔

''ارے بھئی تم نے جانے کیوں دیا عینی کو؟'' یاسین بیگ رات گئے گھر لوٹے تو گھر پر عینی کو موجود نہ پا کر مسز یاسین بیگ سے کہا۔

''میں نے کب جانے دیا، میں تو سو رہی تھی۔وہ چوکیدار سے کہہ کر چلی گئی۔میں نے علی کے فلیٹ پر کئی بار فون کیا ہے، مگر کوئی فون ریسیو ہی نہیں کر رہا۔ڈرائیور کو

بھیجا ہے عینی کا پتا کر کے آئے تو اس نے آ کر بتایا کہ علی کے فلیٹ کو تالا لگا ہوا ہے۔ خدا خیر کرے۔ نجانے علی ہماری عینی کو لے کر کہاں چلا گیا ہے۔ کہیں وہ سچ مچ تو ملک نہیں چھوڑ گیا۔ آپ بتا رہے تھے کہ اسے فارن کمپنی کی طرف سے جاب کی آفر ہے؟'' مسز یاسین بیگ نے رنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''ہو بھی سکتا ہے، مگر اتنی جلدی کیسے ممکن ہے۔ آخر انتظامات وغیرہ میں بھی تو کچھ وقت لگتا ہے۔'' یاسین بیگ نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔

''تو آخر وہ گئے کہاں؟''

''کیا کہا جا سکتا ہے، اب تو صبح ہی کچھ پتا چل سکے گا۔ علی صبح آفس آئے گا یا نہیں، آفس جا کر ہی معلوم ہو سکے گا، مگر یہ طے ہے کہ وہ ہماری بیٹی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، کیونکہ وہ عینی سے سچ مچ بہت محبت کرتا ہے۔''

''پھر تو ہمیں عینی کو طلاق نہیں دلوانی چاہیے، وہ خود بھی علی کو چاہتی ہے۔'' مسز یاسین بیگ نے کہا۔

''اور عاصم کا کیا کریں گے؟ وہ جو اتنی دور سے عینی کے لیے آیا ہے۔''

''مجھے عاصم کی باتوں اور عینی کے ساتھ اس کے پہلے رویے سے ہی ایسا محسوس ہوا ہے جیسے وہ عینی کو اپنی ہونے والی بیوی کی حیثیت سے نہیں بلکہ بہن کی حیثیت سے دیکھ رہا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں تھا کہ جب عینی نے عاصم کو سلام کیا تھا تو عاصم نے اس کے سر پر کیسے شفقت سے ہاتھ پھیرا تھا۔ جیسے بڑا بھائی اپنی بہن کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ مجھے تو گڑبڑ لگتی ہے۔ خواہ مخواہ عاصم اور علی دونوں کے سامنے ہمیں شرمندہ نہ ہونا پڑ جائے۔ کتنی غلط بات ہے یاسین کہ ہم اپنی اکلوتی، لاڈلی بیٹی کو طلاق دلوانا چاہ رہے ہیں۔ اس کا بسا بسایا گھر اجاڑنا چاہ رہے ہیں۔ مجھے تو عینی کی باتوں نے اندر ہی اندر خاصا ڈسٹرب کر کے رکھ دیا تھا۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ عینی اور علی کو ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ انہیں اپنا گھر آباد کرنے دیا جائے۔'' مسز یاسین بیگ نے خاصی سنجیدگی سے کہا تو وہ سنجیدگی سے بولے:

''خاندان والے کیا کہیں گے کہ ایک لاوارث یتیم بغیر کسی رشتے دار، برادری، عزیز کے اکیلے لڑکے سے لڑکی بیاہ دی۔ حسب نسب، ذات، برادری، لوگ تو سب کچھ پوچھتے ہیں۔ ہر بات جاننا چاہتے ہیں۔

عینی کہہ رہی تھی کہ ہم سب مسلمان ہیں، حضرت آدمؑ اور حوا کی اولاد ہیں، یہی ہمارا حسب نسب اور یہی ہماری برادری ہے۔ اور کیا خاندان والے میری طلاق اور پہلی شادی کے بارے میں سوالات نہیں کریں گے، علی سے میرا رشتہ نہیں جاننے کی کوشش کریں گے، تب کیسی کیسی کہانیاں بنائیں گے وہ لوگ، کتنی ذلت ہوگی؟ یاسین، میں تو عینی کی یہ باتیں سوچ سوچ کر عینی کے حق میں فیصلہ دینے کی آرزومند ہوں ورنہ ہماری بیٹی خوش نہیں رہ سکے گی اور ذات اسے بھی ملے گی اور ہمیں بھی۔''

''عینی تو بہت سمجھداری کی باتیں کرنے لگی ہے۔'' یاسین بیگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ شروع سے ہی سمجھدار ہے۔ ناسمجھی تو ہم کر رہے ہیں، جو اسے پریشان کر رکھا ہے۔ علی سے علیحدگی کی تلوار اس کے سر پر لٹکا رکھی ہے۔ وہ ہماری نازوں پلی بیٹی ہے اور ہم نے آج تک اس کی کوئی بات، کوئی فرمائش کوئی خواہش رد نہیں کی تو اب عمر بھر کا معاملہ کیسے اس کی مرضی کے بغیر طے کر سکتے ہیں۔ یاسین رہنے دیجیے، عینی کو علی کے ساتھ خوش رہنے دیجیے۔ میں تو کہتی ہوں کہ ہم صبح ہی علی سے اپنے رویے کی معذرت کر لیتے ہیں اور عاصم کو بھی سب کچھ بتا دیتے ہیں۔'' مسز یاسین بیگ نے سنجیدگی سے کہا۔

''عاصم اس وقت کہاں ہے؟'' انہوں نے پانی پیتے ہوئے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں سو رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے، صبح بات کریں گے۔ سوچتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔ ایک بار عینی سے ضرور پوچھنا ہوگا، جو اس کا فیصلہ ہوگا، اب وہی ہمارا فیصلہ ہوگا۔ فی الحال تو مجھے نیند آ رہی ہے، بہت تھک گیا ہوں، سوؤں گا جا کر۔'' یاسین صاحب نے مسکرا کر کہا اور

کرسی سرکا کر اٹھ گئے۔

☆☆☆

ہر صبح ہی ہمیشہ کی طرح جلتے سورج کی روشنی کی کرنیں بکھیرتی نمودار ہوتی تھی لیکن علی کے لیے یہ صبح کسی تاریک شب کی طرح تھی کہ اس کی رگ جاں، اس کی محبوب ترین ہستی، اس کی محبت، اس کی عینی موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ وہ تمام رات اس کی زندگی کی دعائیں مانگتا رہا تھا۔ صبح اس نے عینی کو دیکھا تو اسے لگا جیسے وہ اس سے ہمیشہ کے لیے روٹھ گئی ہے۔ وہ بے قرار، مضطر اور تڑپتے دل کے ساتھ انتظار گاہ میں واپس آ گیا، جہاں خان لالہ اس کا منتظر تھا، وہ اس کے لیے گھر سے ناشتا پکوا کر لایا تھا اور اسے دیکھتے ہی پیار سے بولا:

''علی بابا، تم نے کل شام سے کچھ نہیں کھایا پیا، اب ناشتا تو کر لو نا۔''

''نہیں لالہ! میں ناشتا نہیں کروں گا۔'' اس نے اپنے الجھے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں کرو گے ناشتا؟''

''لالہ میں نے روزہ رکھ لیا تھا، سحری کے وقت نیت کر لی تھی روزے کی۔ تم کرو نا ناشتا لالہ۔'' اس نے اداس لہجے میں کہا۔

''ہیں۔ سحری کے وقت روزہ، یارا یہ کون سا مہینہ ہے روزہ رکھنے کا اور میں نے تو تم کو سحری کرتے بھی نہیں دیکھا، پھر کیسے روزہ رکھ لیا تم نے؟'' خان لالہ نے حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے پانی پی کی روزہ رکھا ہے اور منت کا روزہ رکھا ہے جب تک عینی کو ہوش نہیں آ جاتا اور وہ صحت یاب ہو کر گھر نہیں چلی جاتی، تب تک میں روزے رکھتا رہوں گا۔'' علی نے مدھم آواز میں کہا۔

''آفرین ہے تم پر یارا، اتنی شدید گرمی میں، ایسی شدید محبت تو ہم نے پہلی بار تمہارے اندر پھوٹتے دیکھی ہے، بلکہ تم ہماری نظر میں پہلے مرد ہو جو اپنی گھر والی سے

اتنا زیادہ پیار کرتا ہے۔'' خان لالہ نے حیرت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں لالہ؟ کیا تم اپنی گھر والی سے پیار نہیں کرتے؟''

''کرتا ہے مگر ایسا بھی نہیں کہ اس کے پیچھے پیاس سے مر جائے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ اور یارا یہ تم اپنا حلیہ تو دیکھو ذرا، ایک دن میں کیسا غمزدہ اور چھوٹا سا منہ نکل آیا ہے تمہارا۔ بھابھی کے گھر والوں کو خبر کرو اور تم گھر جا کر شیو بناؤ، نہاؤ، دھوؤ، آرام کرو، ایسے تو تم خود بیمار پڑ جاؤ گے۔''

''لالہ! میں ہی تو بیمار پڑا ہوں۔ مجھے ہی تو درد اور تکلیف نے اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔'' علی نے اداس لہجے میں کہا۔ ''تمہارا بہت شکریہ لالہ! تم اب گھر جاؤ، آرام کرو، شام میں آ جانا۔ میں ادھر ہی ہوں۔''

''پھر میں بھی ادھر ہی ہوں۔'' خان لالہ نے اس کے انداز میں جواب دیا۔

''یارا ہم تم کو اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے؟ تم اپنے سسر کو فون کرو کہ اس کا بیٹی بیمار ہے، ہسپتال میں بے ہوش پڑی ہے۔ وہ آ جائے تو تم بھی گھر چلنا۔''

''نہیں لالہ! ان کی بیٹی میری بیوی بھی تو ہے، میں اسے چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟'' علی نے سنجیدگی سے کہا اور فون کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ تینوں ناشتا کر رہے تھے جب ملازم نے یاسین بیگ کو آ کر بتایا۔

''صاحب! علی صاحب کا فون ہے، آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں وہ۔''

''علی کا فون، کیا بات کرنا چاہتا ہے وہ، تم پیغام نوٹ کر کے فون بند کر دو۔ میں ناشتے کے بعد اس سے بات کر لوں گا۔'' یاسین بیگ نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ عاصم کے سامنے اس وقت علی سے بات نہیں کرنا چاہتے تھے۔

ملازم واپس پلٹ گیا۔

''انکل، آنٹی! ایک بات ہوں آپ سے؟'' عاصم نے سنجیدگی سے دونوں کو مخاطب کیا۔

''ہاں ہاں، کہو عاصم بیٹے کیا بات ہے؟'' یاسین بیگ نے چائے کا سپ لے کر

کہا۔

''انکل، آپ عینی کو علی کے ساتھ رہنے دیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں اور عینی کسی صورت علی سے علیحدگی نہیں چاہتی۔'' عاصم نے سنجیدگی سے کہا۔

''تو تمہیں یہ سب باتیں......'' یاسین بیگ اور مسز یاسین بیگ حیران ہو کر بولے۔

''عینی نے خود بتائیں تھیں کل اور انکل میں یہاں آیا ہی اس لیے تھا کہ عینی کی مرضی اور رائے معلوم کر سکوں۔ اب جب وہ شادی شدہ ہے اور اپنے شوہر کے ساتھ خوش بھی ہے تو اسے علی سے طلاق دلانے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ آپ کی مجبوری نے ایک بہت بڑے، مقدس اور مضبوط رشتے کو استوار کیا تھا۔ اب اس رشتے کو ناسمجھی میں ختم کرنا انتہائی تکلیف دہ عمل ہوگا عینی کے لیے اور یقیناً آپ کو عینی کی خوشی ہر چیز سے بڑھ کر عزیز ہے۔ ہے نا۔''

عاصم نے رسان سے کہا تو یاسین بیگ سنجیدہ لہجے میں بولے ''ہاں عاصم بیٹے! ہمیں اپنی بیٹی کی خوشی دنیا کی ہر آسائش، ہر خوشی سے زیادہ عزیز ہے۔ ہم عینی اور علی سے بات کریں گے۔ علی نے نجانے کیا پیغام دیا ہوگا۔ یہ خادم کہاں رہ گیا۔'' یاسین بیگ نے خادم کو آواز دی تو وہ پریشان صورت لیے حاضر ہو گیا۔

''کیا پیغام دیا ہے علی نے؟''

''صاحب! بہت بری خبر ہے وہ اپنی عینی بی بی......''

''کیا ہوا ہماری عینی کو؟'' مسز یاسین بیگ کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ پریشانی سے پوچھا۔

''علی صاحب بتا رہے تھے کہ عینی بی بی کل شام سے ہسپتال میں بے ہوش پڑی ہیں۔ ان کا اپنڈکس کا آپریشن ہوا تھا۔ اپنڈکس پھٹ گیا تھا۔ وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آئیں۔'' خادم نے علی کا پیغام حرف بہ حرف انہیں سنا دیا۔

''یا اللہ! میری بچی کو تو کبھی سوئی بھی نہیں چبھی، یہ اتنا بڑا حادثہ کیسے ہو گیا۔ کیسے پھٹ گیا اپنڈکس۔ کہیں ان دونوں کا یہاں سے جاتے ہوئے ایکسیڈنٹ تو نہیں ہو گیا۔'' مسز یاسین بیگ نے روہانسی ہو کر کہا۔

''اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ کون سا ہسپتال ہے، علی نے کیا نام بتایا ہے؟'' یاسین بیگ نے پریشانی سے اٹھتے ہوئے خادم سے پوچھا۔

''جنرل ہسپتال کے آئی۔ سی۔ یو میں ہیں وہ۔'' خادم نے بتایا۔

''یا اللہ! کرم کرنا، ہماری تو ایک ہی بیٹی ہے۔'' یاسین بیگ چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ مسز یاسین بیگ اور عاصم بھی ان کے پیچھے چلے آئے۔

''کل شام عینی بتا تو رہی تھی کہ اس کی طبیعت خراب ہو رہی ہے شاید وہ اپنڈکس کی تکلیف میں تھی۔'' عاصم نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

''تو اس نے ہمیں کیوں نہیں بتایا اپنی تکلیف کے متعلق؟'' مسز یاسین بیگ نے پرنم لہجے میں کہا۔

''آنٹی، میں تو اس سے پہلی بار ملا تھا۔ اس کا کزن تھا، وہ مجھے تو نہیں بتا سکتی تھی۔ اور آپ اس وقت سو رہی تھیں۔ انکل آفس میں تھے اور اسی وقت علی اسے لینے کے لیے آئے تھے یقیناً اس نے علی کو بتا دیا ہوگا اور وہ گھر جانے کی بجائے اسے ہسپتال لے گئے ہوں گے۔'' عاصم نے سنجیدگی سے کہا:

''جبھی تو گھر کو تالا لگا ہوا تھا اور فون بھی کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔'' مسز یاسین بیگ نے اس کی بات کو صحیح گردانتے ہوئے کہا۔

''یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا، بہرحال ہمیں فوراً ہسپتال پہنچنا چاہیے۔'' یاسین بیگ نے کہا۔

''چلیے انکل، میں بھی آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں، آخر عینی میری بہن ہے۔ اکلوتی بہن اور نئی نئی بہن بنی تھی۔ اللہ اسے صحت اور زندگی دے۔'' عاصم نے دل سے اس کے لیے دعا کی۔

''آمین۔'' ان دونوں نے ایک آواز ہو کر کہا۔

جب وہ تینوں ہسپتال پہنچے تو علی کو کوریڈور میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے دیکھا۔ پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ یاسین بیگ مارے ندامت کے اس سے نظریں نہیں ملا رہے تھے۔ مسز یاسین بیگ کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ مگر علی کو ان کی بدسلوکی ان کے گزشتہ رویے کی قطعاً پرواہ نہیں تھی۔ اسے تو اگر پرواہ تھی صرف عینی کی۔ وہ اس کے لیے دعائیں مانگ مانگ کر تھک گیا تھا۔

''یا اللہ! کیا میں اتنا گناہ گار ہوں کہ میری دعا میں اثر باقی نہیں رہا تو کب ختم کرے گا میرا یہ امتحان؟ پروردگار! میں نہیں ہوں اس آزمائش کے لائق، مجھے بہت سزا مل گئی ہے۔ عینی سے بدسلوکی کرنے کی، اب تو مجھے معاف کر دے۔ اب تو میری دعائیں قبول کر لے مالک!'' علی نے آنکھیں بند کر کے دل میں رب دو جہاں کے دربار میں گڑگڑا کر فریاد کی۔''

''ہیلو مسٹر علی!'' عاصم نے علی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے پکارا تو اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ عاصم کو پہچاننے میں اسے ایک سیکنڈ بھی نہیں لگا تھا۔ اسے عاصم پر غصہ آنے لگا۔ اسی کی وجہ سے تو اس نے عینی پر تشدد کیا تھا۔

''ہیلو مسٹر عاصم، ہاؤ آر یو؟'' علی نے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں تو ٹھیک ہوں، آپ عینی کے بارے میں کچھ بتائیے، کیسی ہے وہ اب؟''

''بے ہوش ہے اب تک، اور ڈاکٹرز نے دعا کرنے کو کہا ہے۔'' علی مدھم آواز میں بتایا۔

''علی، وہ کل سے ہوسپٹل میں ہے، تم نے ہمیں کل ہی خبر کیوں نہیں کی؟'' یاسین بیگ نے پوچھا۔

''یہاں اپنی خبر کسے تھی سر، جو میں آپ کو خبر کرتا۔'' علی نے دکھی لہجے میں کہا۔

وہ اس کی بات، لہجے اور حالت پر شرمندہ ہو گئے۔ انہیں سو فیصد یقین آ گیا کہ علی سچ مچ عینی سے بہت محبت کرتا ہے۔ اب انہیں اپنا فیصلہ اور مطالبہ انتہائی احمقانہ، بچگانہ

اور غیر دانشمندانہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سخت شرمندہ تھے، اس سے بھی اور عینی سے بھی۔

چوبیس گھنٹے گزر گئے۔ علی اندر سے پاش پاش ہو گیا تھا۔ عینی کی مسلسل بے ہوشی نے اسے اس چھوٹے سے معصوم بچے کی طرح بنا دیا تھا، جس سے اس کی پسند اور سب سے زیادہ قیمتی کھلونا چھین لیا جائے اور وہ اسے پانے کے روئے، تڑپے، چیخے، چلائے، فریاد کرے۔ وہ بظاہر پرسکون دکھائی دے رہا تھا، مگر یہ وہی جانتا تھا کہ اس کے اندر کس قدر ٹوٹ پھوٹ ہو چکی تھی۔ ان چوبیس گھنٹوں کے دوران اب ڈاکٹر ہما نے اسے آئی۔ سی۔ یو بلایا تھا۔ شاید عینی کو ہوش آ رہا تھا۔ وہ بے چینی سے عینی کے چہرہ پر نظریں گاڑے کھڑا تھا۔ عینی کے ہونٹوں میں آہستہ آہستہ جنبش ہو رہی تھی۔ علی نے پرامید نظروں سے اسے دیکھا اور اس کا دل، اس کی روح، اس کے لب اس کے ہوش میں آنے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ خدا کو شاید اس کا اعتراف جرم، اس کا قصور مان لینا، اپنی خطا تسلیم کر لینا اور اس کا رونا، تڑپنا اور گڑگڑانا پسند آ گیا تھا کہ اس نے اس کی دعاؤں کو قبولیت کا شرف بخش دیا تھا اور عینی نے علی کے دیکھتے ہی دیکھتے آنکھیں کھول دیں۔ سب سے پہلے اس دشمن جان و دل کو اپنے سامنے پا کر وہ جیسے سکتے میں چلی گئی۔ وہ خالی خالی، ویران اور وحشت زدہ آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو، اس کے چہرے، اس کی آنکھوں، اس کے دل میں اپنی کھوئی ہوئی عزت، محبت، احترام، بے ریا خلوص اور نجانے کیا کچھ؟ مگر اسے خود اپنی سوچ پر حیرت ہو رہی تھی۔ اپنا انداز وہم میں مبتلا کر رہا تھا۔ علی کی آنکھوں میں وہ سب کچھ تھا جس کی اسے تلاش تھی یا شاید یہ خواب ہے؟'' اس نے سوچا۔

''عینی!'' علی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پرنم لہجے میں اسے پکارا، مگر اس نے کوئی حرکت نہ کی۔ بس چپ چاپ لیٹی اس کے چہرے کو تکتی رہی۔ دیکھتے، سوچے، جبڑوں میں یوں بھی کوئی بولنے کی سکت کہاں تھی؟

"مسز علی، کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟" ڈاکٹر ہما نے اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے پوچھا مگر وہ تو جیسے سن ہی نہیں رہی تھی۔ وہ تو علی کے پریشان چہرے کو تکے جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کے لمس کو اپنے سر پر محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"مسز علی، یہ بول کیوں نہیں رہیں، کہیں گونگی تو ......" ڈاکٹر ذاکر بولے جو آج ہی ڈیوٹی پر آئے تھے اور ڈاکٹر ہما کے کہنے پر عینی کو چیک کرنے کی ڈیوٹی بخوشی قبول کی تھی۔

"نہیں ڈاکٹر یہ بول سکتی ہے۔" علی نے فوراً ان کی بات کاٹ کر کہا" اور بہت اچھا بول سکتی ہے، بہت دلکش اور دلنشین آواز ہے اس کی زندگی سے بھرپور آواز۔"

"تو آپ ان سے باتیں کیجیے، شاید یہ آپ سے بات کرلیں، ہم اتنی دیر میں راؤنڈ لے آئیں اور انہیں پرائیوٹ روم میں منتقل کرنے کا اہتمام بھی کردیں۔" ڈاکٹر ذاکر نے مسکرا کر کہا۔

"آپ کو مبارک ہو مسٹر علی، آپ کی مسز کا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔" ڈاکٹر ہما نے اسے مسکراتے ہوئے مبارکباد دی۔

"شکریہ ڈاکٹر صاحبہ!" علی نے مسکرا کر کہا۔

وہ دونوں چلے گئے تو علی نے نرمی سے عینی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

"عینی! میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے بہت ناراض ہو، اور ناراض تو اپنوں سے ہوا جاتا ہے نا۔ تمہاری ناراضگی اس بات کا ثبوت ہے کہ تم میرے مظالم سہنے کے وجود مجھے اپنا سمجھتی ہو۔" وہ آہستگی سے پرامید لہجے میں بولا۔

"ہونہہ، کیا خوش فہمی ہے جناب کو۔" عینی نے دل میں کہا۔ "آپ نے تو جیسے ہوں نے جیسا سلوک کیا تھا نا میرے ساتھ۔"

"عینی، کوئی بات کرو، برا بھلا کہو مجھے، غصے کا اظہار کرو، کچھ تو کہو، عینی! میں تو ک دن میں پارہ پارہ ہوگیا ہوں، تمہاری محبت اور معافی ہی اب مجھے سمیٹ سکتی

ہے، پلیز عینی کچھ تو کہو۔" علی نے نرم اور ملتجی لہجے میں کہا تو عینی نے ہمت کر کے اس کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ علی نے حیرت، تاسف اور دکھ سے اسے دیکھا۔

"تو تم مجھے اپنے دل سے ...... نکال ...... چکی ہو عینی؟" اس نے بھیگتی آواز میں پوچھا۔ مگر وہ خاموش رہی۔ اس کے چہرے کو تکتی رہی۔ اس کی پلکوں سے آنسو ٹوٹ کر گرے تو اس کے دل پہ گرے، وہ اندر ہی اندر تڑپ کر رہ گئی۔

"تو یہ ظالم شخص اپنے تمام غصے، ظلم و تشدد اور زیادتیوں کے باوجود میرے دل میں موجود ہے۔ کیسی ہے یہ محبت جو ظلم تو سہتی ہے، بغاوت نہیں کرتی، دل کے آنگن سے ہجرت نہیں کر جاتی، کیسی ہے یہ محبت؟" عینی نے بے قراری سے سوچا۔ تھوڑی دیر بعد اسے پرائیوٹ روم میں منتقل کردیا گیا۔ مسز یاسین بیگ، یاسین بیگ، عاصم اور علی اس کے بیڈ کے گرد جمع ہو گئے۔

"عینی میری جان! یہ کیا ہوگیا چندا! ہم نے تو تمہیں کبھی پیار سے بھی نہیں ڈانٹا تھا، مذاق یا پیار میں پھولوں کی چھڑی سے بھی نہیں مارا تھا۔ ہلکی سی خراش تک نہیں آنے دی تھی تمہیں، پھر یہ سب کیوں ہوگیا تمہارے ساتھ۔ اتنی تکلیف تمہارا مقدر کیسے بن گئی؟ تمہارے ہونٹ زخمی ہیں، سوجے ہوئے ہیں، تمہاری گردن پر زخم کا نشان ہے۔ یہ سب کیا ہے عینی بیٹا، کچھ تو بتاؤ ہمیں، کس نے تمہاری یہ حالت بنائی ہے؟" مسز یاسین بیگ نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں بھرتے ہوئے کہا۔

وہ بس خاموش تھی۔ ایک لمبی چپ اس پر طاری تھی۔ اور علی اس کے ساتھ کیے گئے اپنے نازیبا اور ناروا سلوک پر شرمسار ہو رہا تھا۔

یہ کیا کر دیا میں نے؟ پھولوں سے نازک لڑکی کو اپنے ہی ہاتھوں سے مسل دیا۔

عینی بتا دو ان سب کو کہ میں نے تمہیں مارا پیٹا تھا۔ میں نے تم پر تشدد کیا تھا۔ تم پر تہمت لگائی تھی۔ کیوں نہیں بتا رہی تم انہیں کیوں چھپا رہی ہو اپنے مما پپا سے یہ تلخ اور اذیت ناک حقیقت؟ علی نے دل میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

چار دن گزر گئے۔ عینی کی خاموشی تھی کہ ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

سب اسے بولنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر کر کے تھک گئے۔ مسز یاسین بیگ نے دوائیں بھی اسے بہت مشکل سے رو رو کر اس کی منت کر کے کھانے پر اسے آمادہ کرلیا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کی ہر وقت تک سک سے تیار رہنے والی گریس فل مما کو اس کی یہ بیماری اور خاموشی نے اپنی طرف سے کس طرح غافل بنا رکھا تھا۔ میک اپ، جیولری، زبردست لباس انہیں کسی بھی چیز کا خیال نہیں تھا۔ اگر خیال تھا تو اپنی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کا اور پپا وہ تو جیسے ان چار دنوں میں چالیس برسوں کی مسافت طے کر گئے تھے۔ بہت شکستہ اور بوڑھے دکھائی دے رہے تھے۔ انہیں اپنی چہیتی اور اکلوتی بیٹی کی یہ تکلیف دہ حالت مارے ڈال رہی تھی...... اور علی...... اسے وہ جتنا نظر انداز کرنا چاہ رہی تھی وہ اتنا ہی اس کے سامنے آ رہا تھا۔ اس نے تو چار دن سے شیو بھی نہیں بنائی تھی اور روزے رکھ کر اس کی خدمت کرنے میں لگا رہا تھا۔ اس سے باتیں کرتا تھا مگر وہ اس کی کسی بات کا جواب ہی کب دیتی تھی۔ بس اسے تکتی جاتی تھی۔ اس کے چیزوں میں جو سوجن اور تکلیف تھی وہ اسے بولنے سے روکے ہوئے تھی اور پھر وہ مما، پپا اور عاصم کے سامنے رونا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس سے پوچھ پوچھ کر تھک گئے کہ اس کی یہ حالت کس نے بنائی؟ کیا علی نے اسے مارا پیٹا، یا ایکسیڈنٹ ہوا تھا؟ مگر جواب نہیں دیا۔

وہ زیادہ وقت سوئی رہتی، اور جب بیدار ہتی تو علی کو سامنے دیکھ کر اس کے زخم پھر سے تازہ ہونے لگتے۔ اس کا سلوک، اس کے الفاظ اسے پھر سے کانٹوں پر گھسیٹنے لگتے۔ اس کی روح کو تڑپانے لگتے۔ کتنی تذلیل کی تھی اس نے۔ اس کی کتنی بے دردی اور بے رحمی سے اسے مارا تھا۔ کتنے گھٹیا الزامات عائد کیے تھے، کیسی کیسی تہمتیں لگائیں تھیں اس معصوم سیرت پر اس طرح اس کے کردار کو تار تار اور داغدار کیا تھا۔ اس کے دل کے ٹکڑے کیے تھے۔ اس کی روح میں کیکٹس اگا دیئے تھے جو لمحہ لمحہ اسے زخمی کر رہے تھے۔

وہ دوپہر میں خاصی گہری نیند سو رہی تھی۔ تشدد کا وہی منظر خواب میں اسے

اذیت پہنچانے کے لیے نظر آیا اور وہ چیخ مار کر جاگ گئی۔ وہ تینوں وہیں موجود تھے، اس کی چیخ پر گھبرا کر اس کی طرف لپکے۔

''عینی بیٹا کیا ہوا؟'' مسز یاسین بیگ نے اس کے پاس بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر پیار سے پوچھا۔ وہ بری طرح خوفزدہ تھی۔ پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔ جسم کا سارا خون جیسے خوف نے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔

''بولو بیٹا، کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا تھا؟'' یاسین بیگ نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ تو اس کے ہونٹ بولنے کی کوشش میں کپکپانے لگے، آواز نکل نہیں رہی تھی اور علی بھی اس کے سرہانے کے پیچھے کھڑا دعا مانگ رہا تھا کہ وہ بول پڑے۔ وہ اس کی یہاں موجودگی سے بے خبر ہی تو تھی۔

''بولو بیٹا عینی! بات کرو اپنے پپا سے''۔ یاسین بیگ نے اس کا ہاتھ چوم کر کہا۔

''پ...... پپ...... پپا'' اس کے ہونٹ ہلے، حلق سے مدھم سی آواز نکلی تو جیسے ان تینوں کو بہار کی نوید مل گئی۔

''جی پپا کی جان! شاباش، بولو بیٹا'' یاسین بیگ نے خوشی اور محبت سے اس کا ماتھا چوم کر کہا۔ تو وہ مدھم، ٹوٹے، کانپے، ٹھہرے، ٹھہرے، اٹکے اٹکے لفظوں میں گویا ہوئی:

''پپا!...... اب...... کک...... کسی سے...... قر...... ض...... نہیں لینا پپا...... اب ......'' اس نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ اگر وہ عاصم میں انٹرسٹڈ ہوتی تو اس کے ساتھ واپس گھر کبھی نہ آتی۔ اپنے مما پپا کے گھر سے باہر قدم ہی نہ نکالتی، مگر چونکہ اس کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھا اس لیے وہ اس کے بلانے پر فوراً باہر آ گئی تھی گھر جانے کے لیے۔ اب وہ یہ سوچ سوچ کر پچھتا رہا تھا...... غصے اور شک نے اسے اندھا کر دیا تھا۔ اس کے سوچنے، سمجھنے کی صلاحیتیں سل کر لی تھیں، اور اس نے کس قدر ہتک آمیز سلوک کیا تھا اس کے ساتھ وہ سوچ سوچ کر شرمسار ہو رہا تھا اور اس کے

دل میں عینی کی قدر و منزلت اس کی محبت کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔

"کیا ایکسیڈنٹ ہوا تھا تمہارا؟ عینی بیٹا، بتاؤ گاڑی کیسی تھی، کس رنگ کی تھی، نمبر کچھ تو یاد ہوگا تمہیں۔ میں اس کے ڈرائیور کو گرفتار کرا کے جیل میں بند کرادوں گا۔ ظالم نے میری بچی کو لہولہو کر دیا۔" یاسین بیگ شفقت پدری میں ڈوبے لہجے میں جوش سے بولے۔

"پپا!...... رہنے دیں۔ آپ کی ...... بیٹی ...... کو جو زخم لگنے تھے وہ تو لگ گئے ...... اب کیا ...... فائدہ؟ درد، تکلیف، ختم تو نہیں ہو جائے گی پپا۔" عینی نے بہت مدھم اور درد بھری آواز میں کہا تو علی کا دل ڈوب ڈوب گیا۔

"میں صدقہ اتاروں گی اپنی بیٹی کا یاسین، آپ فوراً دو کالے بکرے منگوائیں۔ اللہ نے ہماری بیٹی کو نئی زندگی دی ہے، ہمیں بھی تو اللہ کی راہ میں کچھ دینا چاہیے نا۔" مسز یاسین بیگ نے عینی کے ہاتھ چوم کر کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں، میں ابھی کسی ملازم کے ذمے یہ کام لگاتا ہوں۔"

یاسین بیگ عینی کا سر تھپک کر باہر نکل گئے، علی وہیں گم صم کھڑا رہا۔

"مما...... پا...... نی!" عینی نے سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"اچھا بیٹا، میں ابھی پانی پلاتی ہوں اپنی بیٹی کو۔" مسز یاسین نے اسے پانی پلایا، اس کے رخسار کو چوما اور پھر اس کے کپڑے دیکھتے ہوئے بولیں:

"عینی بیٹا، طبیعت ٹھیک ہے تو ہمت کرو، میں تمہارے کپڑے تبدیل کرادیتی ہوں، بلکہ تمہیں نہلا کر نئے اور صاف کپڑے پہنا دیتی ہوں۔ دیکھو نا گرمی اور پسینے سے میلے ہوگئے، کتنے دن سے تو پہن رکھے ہیں تم نے یہ کپڑے۔"

"مما...... میں خود...... نہا لوں گی...... کپڑے...... بھی بدل لوں گی۔" اس نے آنکھیں موند کر کہا۔

"کیسے خود سے بدل لو گی چندا، اپنی حالت تو دیکھو۔" مسز یاسین بیگ نے پیار سے کہا تو وہ آنکھیں بند کیے کیے ذومعنی انداز میں بولی:

"اپنی حالت...... دیکھ کر...... ہی...... تو کہہ رہی ہوں...... کہ خود نہا لوں گی...... خود ہی...... کپڑے...... بدل لوں گی...... آپ...... دیکھیں گی تو...... اور زیادہ دکھ ہوگا آپ کو۔"

"اف! کہاں کہاں زخم لگے ہیں اس گلاب بدن پر میرے ہاتھوں سے، نجانے کہاں کہاں نشانات باقی ہیں میرے وحشیانہ تشدد کے؟ میں تو اپنی ہی نظروں میں گر گیا ہوں عینی! میں تو تم سے معافی مانگنے کے لائق بھی نہیں رہا۔" علی نے اس کی بات سن کر اپنے دل میں کہا اور اپنے آنسو پلکیں جھپک جھپک کر دھکیلتا دبے پاؤں کمرے سے باہر آ گیا۔ دکھ، رنج، ملال، ندامت اور تاسف نے اسے گھیر رکھا تھا۔

"علی تم گھر جا کر آرام کرو، چار دن سے تم نہیں سوئے۔" یاسین بیگ نے اس کے قریب آ کر کہا تو وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا:

"میں یہیں ٹھیک ہوں سر، مجھے نیند نہیں آئے گی جب تک سب کچھ صحیح نہیں ہو جاتا، مجھے سکون سے نیند نہیں آئے گی سر۔"

"علی بیٹا، تم مجھے سر نہ کہا کرو بلکہ اب انکل کہا کرو۔" یاسین بیگ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"انکل!" علی نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"ہاں انکل، مگر نہیں انکل بھی نہیں، تم مجھے پپا کہا کرو۔ تم میری بیٹی کے شوہر ہو، داماد ہو، اس رشتے سے تو میں تمہارے باپ کی جگہ ہوں اور عینی کی مما تمہاری بھی ماں ہیں۔ ہم اپنے اس احمقانہ مطالبے پر شرمندہ ہیں علی...... ہمیں معاف کر دو۔ عینی اب صرف تمہاری ہے، اسے کبھی طلاق مت دینا بیٹا۔ اور نہ ہی اب کسی دکھ، تکلیف اور پریشانی کو اس کے قریب آنے دینا، وہ بہت حساس دل کی مالک ہے۔ ہم نے تو پھولوں کی طرح اسے بڑی احتیاط، بڑے پیار سے پروان چڑھایا ہے، لیکن شاید یہ تکلیف اسے اس طرح ہی ملنی تھی۔ عینی نے تمہارے اور اپنے رشتے کے متعلق عاصم کو اس سے ملتے ہی بتا دیا تھا۔ عاصم تو اسے اپنی بہن کا درجہ دیتا ہے۔ تم نے دیکھا ہی

ہوگا جس طرح اس نے عینی کی تیمارداری کی ہے۔ وہ بہت روشن خیال اور زندہ دل نوجوان ہے۔ عینی کی باتوں سے اور عاصم کی توجہ دلانے پر ہمیں احساس ہوگیا ہے علی کہ ہم بہت بڑی غلطی کر رہے تھے۔ تم عینی سے محبت کرتے ہو تو یقیناً وہ بھی تم سے محبت کرتی ہوگی۔ اور عاصم نے تو یہی بتایا ہے ہمیں۔ میری بیٹی نے نفرت کرنا تو سیکھا ہی نہیں ہے علی۔ ہاں کبھی کبھار کسی ناانصافی اور بے ایمانی پر غصے میں ضرور آجاتی ہے ورنہ وہ تو بہت نرم خو بچی ہے۔''

یاسین بیگ کے یہ انکشافات علی کو حیرت کے سمندر میں غوطے لگوا رہے تھے۔ وہ گم صم کھڑا سن رہا تھا۔

''علی کیا سوچنے لگے بیٹا؟''

''کچھ نہیں سر، کاش، سر آپ یہ باتیں مجھے ایک ہفتہ پہلے کہہ دیتے یا یہ عارضی رشتہ جوڑنے کا خیال ہی نہ آیا ہوتا آپ کو۔ عینی تو اسی وجہ سے مجھ سے گریزاں رہی کہ یہ رشتہ صرف دو ماہ تک قائم رہے گا۔ اس سارے کھیل میں سزا تو عینی کو ملی ہے سر اور اس کے بعد مجھے...... کاش! سر آپ نے یہ سب کچھ کہہ دیا ہوتا۔''

علی نے حسرت آمیز پرنم اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ یاسین بیگ نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور دونوں ہی آبدیدہ ہوگئے۔

''کبھی کبھی بہت چھوٹی سی غلطی، معمولی سی کوتاہی اور ذرا سی لغزش انسان کو بہت بڑے دکھ، صدمے اور تکلیف سے دوچار کر دیتی ہے۔ کاش! ہم یہ چھوٹی چھوٹی غلطیاں نہ کریں، بلکہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں تلاش کرنے کی کوشش کریں۔'' یاسین بیگ نے بھیگتے لہجے میں کہا۔

''کاش! سر۔''

''سر نہیں پپا کہو۔'' یاسین بیگ نے اس چہرہ ہاتھوں میں لے کر کہا۔

''جی پپا!'' علی روتے روتے مسکرا دیا۔ یاسین بیگ بھی خوش دلی سے مسکرا دیئے۔

عینی کی طبیعت بہت بہتر ہوگئی تھی مگر جہاں جہاں اس کے محبوب شوہر نے اسے زخم لگائے تھے، وہاں وہاں درد اور دکھن ابھی باقی تھی۔ وہ رات کو سو رہی تھی۔ علی اس کے سرہانے کے قریب کرسی پر بیٹھا تھا، پرائیویٹ روم میں اے۔ سی کی وجہ سے بہت ٹھنڈک تھی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ عینی کو پیاس لگی تو اس نے کسمسا کے آنکھ کھولی۔ علی کو بیٹھا دیکھ کر حلق مزید خشک ہوگیا۔ کتنا غمزدہ اور افسردہ دکھائی دے رہا تھا وہ۔

''عینی!'' علی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو اس نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟ میرے...... مرنے کا انتظار کر رہے ہیں۔''

عینی نے تلخی سے کہا تو اس کا دل کانپ کر رہ گیا۔ روح چیخ اٹھی۔

''نہیں عینی پلیز!......'' وہ بھرائی آواز میں بولا۔ ''ایک بار یہ سب کچھ بھلا دو عینی، پھر میں تمہیں اتنا پیار دوں گا کہ تمہیں تکلیف دہ وقت، وہ لمحے کبھی یاد نہیں آئیں گے۔''

''ایسا...... کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی'' کیسے بھول سکتی ہوں میں؟ میں نے تو کبھی درد کا نام بھی غور سے نہیں سنا تھا۔ غم کی تحریر بھی نہیں پڑھی تھی۔ دکھ اور تکلیف کیا ہے، مجھے نہیں معلوم تھا، لیکن آپ نے...... آپ نے مجھے ان احساسات سے...... بہت...... اچھی طرح...... واقف کرا دیا ہے...... درد کیسے ہوتا ہے؟ تکلیف کسے کہتے ہیں؟ زخم کیسے دکھ پہنچاتے ہیں۔ غم کیسے دل اور روح کو چھلنی کر کے دکھ دیتا ہے؟ مجھے...... اب معلوم ہوگیا ہے...... میں جان گئی ہوں...... ان نظروں کا مفہوم، ان کی...... اذیت...... سب محسوس کر چکی ہوں اور کر رہی ہوں۔ مما پپا کے...... جلد بازی کے فیصلے نے مجھے ریزہ ریزہ کر دیا۔ مسٹر علی! آپ نے تو اتنا کچھ دیا ہے مجھے کہ اب کچھ بھی اور پانے یا مانگنے کی حلاوت نہیں رہی۔''

''عینی!'' علی نے تڑپ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''مار دیا ہے...... آپ نے عینی کو......'' وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر رو پڑی۔ ''کس کس

زخم کا...... حساب دیں...... گے...... آپ......؟''

''عینی پلیز، میری بات تو سنو......'' وہ بھیگتے منت بھرے لہجے میں بولا:

''کیا اب بھی کچھ سنانا...... باقی ہے مسٹر علی......'' وہ تلخی سے بولی، آنسو بہے چلے جا رہے تھے۔'' جائیے یہاں سے چلے جائیے...... آپ کو تو...... خود پر بھی...... اعتبار نہیں ہے...... میرا اعتبار آپ کیسے...... کر سکتے ہیں؟ میں نے اپنی بیس برس کی زندگی میں ایک لمحہ بھی درد اور تکلیف میں نہیں گزارا تھا اور آپ نے...... جو صرف...... ڈیڑھ ماہ پہلے میری زندگی کے...... مالک و مختار...... بنے تھے، آپ نے مجھے ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔ میں نے تو...... آپ کی...... اجازت کے بغیر کبھی...... مما پپا کو فون بھی نہیں کیا تھا...... گھر سے...... باہر کبھی قدم بھی نہیں...... نکالا تھا۔ آپ کی...... ہر بات کو حکم کا...... درجہ دیا...... وہ کام تک کیے...... جنہیں میں نے...... عمر بھر ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ سوچا تک نہیں تھا کہ کبھی مجھے یہ سب کام کرنے ہوں گے...... اور آپ کے پاس...... جب آپ کے پاس...... اس بے جا اور فضول پابندی کو توڑ کر مکمل طور پر چلی آئی تو...... تو آپ نے...... مجھے یہ انعام دیا...... میرے ساتھ...... ایسا ہی کرنا...... تھا تو کیوں لے کر گئے تھے مجھے اپنے ساتھ؟ میں اگر آپ کو...... بے وقوف بنا رہی ہوتی تو...... کبھی نہ آتی آپ کے بلانے پر...... کبھی آپ کے گھر میں قدم رکھنے کی حماقت نہ کرتی۔ میرے مما پپا کا گھر ہی میرے لیے محفوظ پناہ گاہ تھی۔ میں تو ان کے منع کرنے کے باوجود خاموشی سے...... آپ...... کے ساتھ چلی گئی...... اس لیے مسٹر علی...... اس لیے...... کہ آپ مجھے...... اس حال میں پہنچا دیں اس لیے......'' وہ دکھ اور کرب سے روتے ہوئے بولتی چلی گئی۔

''عینی ایک بار تم مجھے دل سے معاف کر دو، میں تمہیں بہت محبت دوں گا۔ بہت کچھ ہے میرے پاس تمہیں دینے کے لیے۔'' وہ بھرائی آواز میں بولا۔

''کیا ابھی بھی کچھ دینا باقی ہے؟'' وہ روتے، سسکتے ہوئے بولی۔ اتنا کچھ تو دیا ہے آپ نے مجھے...... محبت، نفرت، ذلت، شک، بے اعتباری، غصہ، زخم، اذیت،

تکلیف، درد، دکھن، اتنا بہت کچھ تو دیا ہے آپ نے مجھے...... اب...... اور کیا کچھ...... دیں گے...... مسٹر علی آپ؟ اور کتنا کچھ دیں گے؟ میرا...... پورا وجود...... آپ ہی کی دی ہوئی...... عنایتوں سے سجا ہوا ہے۔ اب تو کہیں...... جگہ بھی...... نہیں بچی...... اب اور کیا کچھ...... دیں گے آپ مجھے؟''

''عینی! تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی، لو پانی پی لو۔'' علی نے اس کی حالت غیر ہوتی دیکھ کر پانی سے بھرا گلاس اس کے منہ کے قریب کیا۔

''اس میں...... تھوڑا...... سا...... زہر بھی ملا دیں۔'' یہ کہہ کر عینی نے ہاتھ مار کر گلاس زور سے فرش پر گرا دیا۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور ساتھ ہی علی کا دل بھی...... عینی نے اس کے الفاظ اسے واپس لوٹا دیئے تھے۔

''عینی!'' علی کی آنکھیں بھی برسنے لگیں تو عینی کی سسکیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ دونوں نجانے کتنی دیر تک روتے رہے۔ علی نے بہ مشکل خود کو سنبھالا اور پھر اسے بہت مشکل سے قابو کر کے، آنسو صاف کر کے پانی پلا کر لٹا دیا۔

''عینی میری زندگی! تم بے شک مجھ سے ساری عمر لے لو، مگر ایک بار مجھے...... معاف کر دو۔ عینی یہ تم زخم زخم نہیں ہوئیں بلکہ...... میں زخم زخم ہو گیا ہوں۔ میں نے تم پر نہیں اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ تم چاہو تو سب کو سب کچھ بتا دو کہ میں نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے، کیوں کیا ہے؟ آخر تم نے ان سب سے جھوٹ کیوں بولا عینی؟ انہیں سچ کیوں نہیں بتایا؟'' علی نے اس کے بالوں میں نرمی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''آپ کی...... اس مارا ماری سے...... چند گھنٹے پہلے...... میں سب کو...... یہ یقین دلا کر وہاں سے...... آئی تھی کہ...... آپ مجھے بہت...... چاہتے ہیں...... مجھ سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ آپ کو مجھ سے...... بہت زیادہ محبت ہے تو پھر بھلا میں...... اپنی ہی...... بات سے، اپنے ہی دعوے سے، اپنے ہی لفظوں سے کیسے مکر جاتی؟ کیسے اپنے لفظوں کی لاج نہ رکھتی؟ کیسے اپنے کہے کا مان نہ رکھتی؟ کیسے بتاتی انہیں کہ آپ کا...... ایک رویہ یہ بھی ہے...... جو ان تمام دعوؤں کا جھوٹا قرار دینے کے لیے

بہت تھا...... جو مجھے ان کی نظروں میں شرمسار کر لے اور احمق ثابت کرنے کے لیے کافی تھا...... بتایئے، کیسے بتا دیتی ہیں؟ میرے مما پپا...... کے لیے یہ تو...... دونوں صورتوں میں صدمے سے کم نہیں تھا۔ میں اپنے پپا کا مان اور اعتبار کیسے ٹوٹتے ہوئے دیکھ سکتی تھی۔ وہ مان جو انہیں آپ پر تھا۔ وہ اعتبار جس کے طفیل انہوں نے مجھے آپ کی دسترس میں دیا تھا اور میں تو...... سارے عذاب اپنی جان پر جھیل چکی تھی، پھر کیوں بتا دیتی انہیں؟ اور کس لیے بتا دیتی، کون سی خوشی، راحت، فائدہ، تحفہ یا انعام مل جاتا انہیں یہ حقیقت جان کر...... اور مجھے بھی...... بولیے مسٹر علی! جواب دیجیے۔ سوائے اس کہ میں ان سے خود سے اور وہ مجھ سے اور اپنے انتخاب پر خود سے شرمندہ ہوتے...... اور تو کچھ نہیں ہوتا نا۔'' عینی نے آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر کہا تو وہ شرمندگی سے گنگ رہ گیا۔

☆☆☆

''مسز علی، انشاء اللہ! کل آپ ڈسچارج ہو جائیں گی۔'' ڈاکٹر ہما نے اس کا چیک اپ کرنے کے بعد کہا۔ علی بھی وہیں موجود تھا۔

''تھینک یو ڈاکٹر۔'' عینی نے پھر سے مسکرا کر کہا۔

''ہیلو۔ ہیلو۔'' عاصم گلدستہ لیے کمرے میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر ہما کو وہاں دیکھ کر خوشی سے کھل گیا۔ آج کل وہ ڈاکٹر ہما کے متعلق معلومات اکٹھی کر رہا تھا۔ وہ اسے پسند آ گئی تھیں۔ کھلتی گندمی رنگت، دلکش نین نقش کی مالک ڈاکٹر ہما اسے اپنے ساتھ بہت مناسب محسوس ہو رہی تھی۔ ان کے حسن اخلاق سے بھی وہ خاصا متاثر تھا اور اس نے لندن فون کر کے اپنی ممی کو بھی ڈاکٹر ہما کے متعلق بتا دیا تھا۔ ممی اب مستقل پاکستان آ رہی تھیں۔

''ہیلو ڈاکٹر ہما۔'' عاصم نے ڈاکٹر ہما کی طرف بطور خاص توجہ دے کر کہا۔

''ہیلو مسٹر عاصم! مبارک ہو آپ کی کزن کل گھر جا رہی ہیں۔'' انہوں نے مسکرا کر بتایا۔

''ویری گڈ، لو بھئی کزن، مسٹر اور مسز علی یہ تازہ گلابوں کا گلدستہ سنبھالو، اس خوشی میں۔'' عاصم نے مسکراتے گلدستہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''شکریہ عاصم بھائی! آپ کیوں روزانہ تازہ گلابوں کا گلدستہ لے آتے ہیں؟''

''کیونکہ پھول روزانہ مرجھا جاتے ہیں، گرمی بہت ہے نا، اور محبت کرنے والے انسان بھی اپنے پیاروں کی تکلیف میں مرجھا جاتے ہیں۔ اب تم اپنے ان شوہر نامدار کو ہی دیکھ لو۔'' عاصم نے مسکراتے ہوئے علی کی طرف دیکھ کر کہا تو اس نے حیرانگی سے علی کی طرف دیکھا۔ وہ ڈاکٹر ہما اور ڈاکٹر ذاکر سے اس کی رپورٹس کے متعلق بات کر رہا تھا۔

''ایک تو ویسے ہی یہ تمہارے لیے پریشان ہیں، اوپر سے تمہارے ہوسپٹل میں ایڈمٹ ہونے کے دن سے آج تک مسلسل منت کے روزے رکھ رہے ہیں موصوف تمہاری زندگی اور صحت یابی کے لیے، اب تم گھر جاؤ گی تو ان کے روزے ختم ہوں گے۔ اب بھلا بتاؤ دنیا اکیسویں صدی میں قدم رکھ چکی ہے اور اس میں ایسے دیوانے شوہر بھی کود پڑے ہیں۔ ارے ایسے سچے، دیوانے عاشقوں کو تو اکیسویں صدی میں شاباش کی بجائے جرمانہ کر دیا جائے گا۔'' عاصم اپنی عادت کے مطابق بولتا چلا گیا اور عینی حیرت اور بے یقینی کی سی کیفیت میں مبتلا ہو کر علی کو دیکھتی رہی جس کا دھیان ان کی باتوں کی طرف قطعاً نہیں تھا۔

''کتنی محبت ہے، کتنی نفرت ہے، کتنے روپ ہیں علی آپ کے؟ میں آپ سے نفرت کرنا بھی چاہوں تو نہیں کر سکتی۔ اوپر سے آپ کو یہ دیوانگی...... پہلے مجھے اس حال کو پہنچایا اور اس کے بعد میری زندگی اور صحت یابی کے لیے منت کے روزے رکھ رہے ہیں۔ او علی میں آپ کی محبت سے انکار نہیں کر سکتی۔ آئی لو یو علی۔'' عینی نے دل میں اسے مخاطب کر کے کہا۔ وہ کمرے سے چلا گیا۔ ڈاکٹر ہما جانے لگیں تو عاصم نے انہیں روک لیا۔

''ایکسکیوزمی ڈاکٹر ہما مس ہما فخر۔''

''جی فرمائیے۔'' ڈاکٹر ہما نے مسکراتے ہوئے اس کے روشن چہرے کو دیکھا۔

''میں آپ سے یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ کیا آپ صرف خواتین اور بچوں کا علاج کرتی ہیں، مردوں پر آپ کی مسیحائی بین ہے کیا؟''

''جی نہیں، لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' ڈاکٹر ہما نے ہنس کر کہا۔

''کیونکہ مجھے بھی مرض لاحق ہوگیا ہے۔'' وہ اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

''اچھا! ذرا نبض دکھائیے۔'' ڈاکٹر ہما نے کہا۔

''دیکھیے چیک کیجیے''۔ اس نے اپنی کلائی ان کے آگے کر دی۔

''نارمل ہے۔'' ڈاکٹر ہما نے اس کی نبض کی رفتار چیک کرتے اور مسکراتے ہوئے کہا۔

''قطعاً نارمل نہیں ہے جی۔'' عاصم نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''آپ کو تو چیک کرنا ہی نہیں آتا۔ ذرا میرا دل چیک کیجیے، اس کی دھڑکن میں اگر آپ کو اپنا نام نہ سنائی دے تو میں آپ کو ڈاکٹر ہی نہیں مانوں گا۔''

''یہ آپ کس قسم کی گفتگو کر رہے ہیں؟'' چھبیس سالہ ڈاکٹر ہما نے سٹپٹا کر کہا۔

''کیسی ناسمجھ ڈاکٹر ہیں آپ، اپنے مریض کی بات تک تو آپ کی سمجھ تشریف میں آتی نہیں ہے۔ ارے بھی سیدھی سی بات ہے مس ہما فخر میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اپنا جیون ساتھی بنانے کا فخر بخش دیں تو عنایت ہوگی آپ کی۔''

''جی!'' ڈاکٹر ہما حیران اور بوکھلائی ہوئی اس کے چہرے کو دیکھنے لگیں۔

''جی ہاں مس ہما! میں نے آپ کے متعلق تمام معلومات اکٹھی کرلی ہیں اور اپنی ممی کو بھی پاکستان بلوا رہا ہوں۔ میرے متعلق معلوم کرنا ہو تو یہ کاغذ حاضر ہے۔ اس میں تمام معلومات تحریر ہیں۔ آپ اور آپ کے والد، بھائی، دیگر اہل خانہ، چاہیں تو میرے متعلق ہر طرح سے اپنی تسلی اور اطمینان کر سکتے ہیں۔ بس آپ مجھے

اپنی طرف سے تسلی کرا دیجیے کہ آپ کو میرا نام اپنانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

عاصم نے اپنی شرٹ کی جیب سے کاغذ نکال کر اسے تھما کر کہا۔

''جی۔'' وہ ابھی تک حیرت زدہ اور کنفیوز تھی۔

''جی جی چھوڑیں۔ جی ہاں، یا جی نہیں میں جواب دے دیں۔'' عاصم نے شوخ لہجے میں کہا۔

''جی۔'' ڈاکٹر ہما نے اس کے سراپے کا بھرپور جائزہ لیا اور پھر شرمیلے پن سے بولیں ''جی ہاں''۔ یہ کہہ کر وہ وہاں رکی نہیں اور عاصم کا خوشی سے بھرپور نعرہ ان کے تعاقب میں باہر تک گیا۔ وہ خوشی سے عینی کی طرف مڑا جو یہ تمام کارروائی دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کے دیکھتے ہی بولی:

''واہ عاصم بھائی! آپ تو بڑے تیز نکلے، یا تو آپ کو لڑکی مل ہی نہیں رہی تھی یا میرے ڈاکٹر کو ہی میری بھابھی بنانے کا ارادہ کرلیا ہے۔''

''یہ سب تمہاری بدولت ہوا ہے، جہاں میرا تم سے ملنا منحوس اور تکلیف دہ ثابت ہوا ہے، وہاں یہ نیک کام بھی ہوگیا ہے۔ اگر میں پاکستان نہ آتا، تم سے نہ ملتا، نہ راستے میں تمہارا ایکسیڈنٹ ہوتا، نہ میں تمہیں دیکھنے یہاں آتا۔ ڈاکٹر ہما سے میں تمہارے توسط سے، تمہارے وسیلے سے ہی ملتا، سو قدرت یہاں کھینچ لائی۔''

''میرے ساتھ یہ ہوتا تھا، جبھی تو آپ اتنی دور سے آئے تھے، یہ سب کرانے کے لیے۔'' عینی نے کہا۔ ''چلیے مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ میرے ذریعے آپ کی شادی خانہ آبادی ہونے کے امکانات روشن ہوگئے ہیں۔ آنٹی کب آ رہی ہیں پاکستان؟''

''کل شام کی فلائٹ سے آ رہی ہیں۔'' عاصم نے بتایا۔ ''انشاء اللہ! کل تم بھی ہوسپٹل کو الوداع کہو گی اور گھر تمہیں ویلکم کہے گا اور ہاں مبارک ہو سسٹر، انکل آنٹی اب تمہیں علی سے طلاق نہیں دلوائیں گے''۔

''مجھے معلوم ہے۔'' اس نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔

"تم خوش نہیں کیا؟" عاصم نے بڑے غور سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" وہ اداسی سے بولی۔

"پتا ہونا چاہیے لڑکی! قدر کرو، اتنی محبتوں والا شوہر تو نصیبوں سے ملتا ہے۔ پہلے پورے چار دن اور چار راتیں علی نے تمہارے سرہانے جاگ کر گزاری ہیں۔ اس کے بعد آنٹی انہیں اصرار کر کے گھر بھیجتے رہے ہیں۔ وہ بھی صرف بمشکل تین چار گھنٹے کے لیے جاتے رہے ہیں، ورنہ وہ تو تقریباً چوبیس گھنٹے ہوسپٹل میں تمہارے ساتھ رہتے رہے ہیں اور تم کہہ رہی ہو 'پتا نہیں۔' علی سنیں گے تو کیا گزرے گی ان کے محبت بھرے دل پر؟" عاصم نے نہایت سنجیدگی سے کہا تو وہ اس انکشاف پر حیران بھی ہوئی، خوش بھی مگر پھر قدرے طنزیہ انداز میں بولی:

"یہ آپ مردوں کو اپنے دل کی بہت فکر ہوتی ہے۔ کبھی عورت کے دل کی بھی فکر کر لیا کریں کہ اس کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ آپ مردوں کی بے رخی، بدسلوکی اور بے حسی کے سبب۔"

"سسٹر، جو مرد ایسا کرتے ہیں ان سے پوچھو، ان سے کہو۔ میں تو اپنے علی کی بات کر رہا تھا۔ ہی از اے نائس اینڈ لونگ پرسن۔ تم نے جتنا ان کے بارے میں بتا دیا تھا، وہ اس سے کہیں زیادہ اچھے انسان ہیں۔ وہ تم سے بہت زیادہ نہیں بلکہ بہت بہت بہت ہی زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اب روزے رکھنے سے ہی اندازہ لگا لو ان کی محبت کا اور خدارا! جلدی سے مکمل طور پر صحت یاب ہو جاؤ تاکہ تمہارے شوہر صاحب کو بھی اس شدید گرمی میں روزے رکھنے سے فراغت نصیب ہو۔" عاصم نے کہا، عینی اپنے اندر علی کی محبت بڑھتی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔

"پانی پلا دیں بھائی!" اس کے خشک گلے نے بے چین ہو کر کہلوایا۔

"لو میری بہنا پانی پیو۔" عاصم نے ٹھنڈے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ اس نے ابھی ایک گھونٹ ہی بھرا تھا کہ علی کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر

اسے اچھو لگ گیا۔ عاصم نے فوراً گلاس پرے ہٹا لیا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر کھانسنے لگی۔ آنکھوں میں پانی تیرنے لگا اور دل میں یہ خدشہ بھی سر اٹھانے لگا کہ علی اب پھر سے شک میں مبتلا ہو جائیں گے۔ عاصم کی وجہ سے تو وہ پہلے شک میں پڑے تھے۔

"لیجیے علی بھائی آپ خود ہی اپنی مسز کو پانی پلائیں۔ آپ کے آتے ہی انہیں پھندا لگ گیا ہے۔" عاصم نے علی کو دیکھا پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اب میں اتنا ظالم بھی نہیں ہوں عاصم صاحب! میں تو پھندا اتارنا چاہتا ہوں۔" علی نے گلاس لے کر ذومعنی بات کہی تھی۔ عینی نے جتنی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"تو اتاریئے پھندا، میں ڈاکٹر ہما سے ضروری بات کرنے جا رہا ہوں۔ آپ انہیں پانی کے علاوہ بھی کچھ کھلائیے پلائیے۔" عاصم یہ کہہ کر مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

علی نے اس کے قریب آ کر اسے پانی پلانا چاہا تو اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ کھانس کھانس کر وہ نڈھال ہو گئی اور بیڈ کی پشت سے سر ٹکا کر اپنے آنسو اپنی ہتھیلیوں سے صاف کر لیے۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ علی بہت بے چینی سے اس کی حالت دیکھ رہا تھا۔

"عینی! پانی تو پی لو۔" علی نے بہت نرم لہجے میں کہا "تم مجھ سے ناراض ہو، مگر اپنے آپ سے کیوں دشمنی کر رہی ہو، اپنے آپ سے کس بات کا بدلہ لے رہی ہو؟"

"آپ کو اپنا سمجھنے کا...... آپ سے......" وہ کہتے ہوئے خاموش ہو گئی۔

"بولو نا عینی! خاموش کیوں ہو گئیں؟" وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کے دل کی بھڑاس نکل جائے۔

"آپ نے...... آپ نے مجھے بولنے کے قابل چھوڑا ہی کب ہے، کیوں آ جاتے ہیں آپ یہاں؟"

"تو اور کہاں جاؤں؟" وہ گلاس میز پر رکھ کر اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بے بسی سے بولا۔

"میری بلا سے جہاں آپ کا دل چاہے، جائیں۔" وہ اس کے سلوک کو یاد کر کے غصے سے بولی۔

"جہاں میرا جی چاہتا وہیں تو موجود ہوں میں۔" وہ اس کے رخسار کو چھوتے ہوئے بولا۔

"مت ہاتھ لگائیں مجھے۔" اس نے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔

"اوکے، تم نے کچھ کھایا کیوں نہیں صبح سے، کچھ تو کھا لو۔" وہ نرمی سے بولا۔

"کچھ!" وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے طنزیہ اور تلخ لہجے میں بولی۔ "میں نے تو بہت کچھ کھایا ہے، بھول گئے۔ آپ نے اپنے ہاتھوں سے کھلایا تھا۔ ابھی تو وہی ہضم نہیں ہو پا رہا۔ مزید کھانے کی ہمت ہے اور نہ ہی قوت۔ اب اور کیا کھلانا چاہتے ہیں آپ مجھے؟ تھوڑا سا زہر کھلا دیجیے۔ آپ ابھی بار بار کی زحمت سے بچ جائیں گے۔"

"عینی! فار گاڈ سیک! مجھے اس قدر شرمندہ تو نہ کرو۔" وہ ندامت سے بے کلی سے بولا تھا۔

"آپ نے جتنی میری "قدر" کی ہے۔ اس کا اندازہ ہے آپ کو۔" اس کی آواز بھیگ گئی۔

"ہاں عینی! مجھے اندازہ ہے، احساس ہے مجھے میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے، بہت ظلم کیا ہے تم پر...... مگر عینی! معافی کی بھی تو کوئی صورت ہوگی...... تم مجھے معاف نہیں کرو گی تو مجھے سکون کیسے ملے گا۔ بتاؤ نا عینی! میں کس طرح تم سے معافی مانگوں۔ تم کس طرح مجھے معاف کرو گی؟"

علی نے ندامت آمیز اور التجائیہ لہجے میں کہا مگر وہ خاموش رہی۔ اس کے چہرے کے تاثرات اور اس کے لہجے کی بے بسی اور نمی کو محسوس کر کے اندر ہی اندر بے چین و بے قرار ہوتی رہی۔"

"اوکے عینی! ٹیک کیئر۔" علی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر شکستگی اور آہستگی سے کہا اور کمرے سے چلا گیا۔ عینی کا دل بھی بے کل، بے قرار اور بے چین ہو کر اس کے تعاقب میں نکل گیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو عینی؟ علی کو معاف بھی کر چکی ہو اور انہیں بتا کر مطمئن بھی نہیں کر رہیں، کیا مزہ مل رہا ہے تمہیں علی کو شرمسار اور پریشان کر کے...... اپنی انا کو علی کے راستے میں لاؤ گی تو علی تم سے دور ہو جائیں گے...... علی! نہیں۔ علی مجھ سے دور نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے بھی تو میری ایک نہیں سنی تھی۔ مجھے ٹارچر کیا تھا۔ میں کیسے بھول جاؤں وہ سب؟ نہ وہ سب بھلا دینے کا ظرف ہے مجھ میں اور نہ ہی میں علی سے نفرت کرنے یا ان سے علیحدہ ہونے کا حوصلہ...... میں دہرے عذاب میں ہوں۔ میں کیا کروں؟ مما پپا تو میری اور علی کی شادی مستقل بنیادوں پر استوار دیکھنے کی رضامندی ظاہر کر چکے ہیں۔ جو طلاق دلوانے کا خیال اپنے ذہن سے نکال چکے ہیں، مگر اب میں اپنے ذہن سے علی کا غصہ، شک، تذلیل، ہتک آمیز سلوک کیسے دھو ڈالوں؟" عینی نے بے بسی سے روتے ہوئے سوچا۔

اگلے روز وہ مما پپا کے ساتھ گھر جا رہی تھی۔ علی نے بھی اسے اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے اس وقت آرام اور ذہنی سکون کی ضرورت ہے اور شاید وہ اس سے دور رہ کر پرسکون ہو کر اس کے متعلق صحیح سوچ سکے۔ وہ ہوسپٹل کا بل ادا کرنے گیا تو ڈاکٹر ہما نے اسے بتایا کہ عینی کے پاپا یاسین بیگ بل ادا کر گئے ہیں۔ وہ شرمندہ سا ہو گیا حالانکہ بات ایسی شرمندہ ہونے والی تھی نہیں۔ کمرے میں آیا تو وہ سب عینی کے پاس موجود تھے۔ ہلکے سبز رنگ کے لباس میں عینی بہت بہتر دکھائی دے رہی تھی۔

"ایکسکیوزمی سر!" علی نے سب کی موجودگی میں یاسین بیگ کو مخاطب کر کے کہا: "آپ نے ہوسپٹل کا بل کیوں ادا کر دیا، بل تو میں ادا کرنے آیا تھا اور مجھے ہی ادا کرنا چاہیے تھا۔ آپ نے زیادتی کی ہے سر مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔"

"اچھا تو مجھے بھی نہیں لگ رہا علی بیٹے، تم مجھے پھر سر کہہ رہے ہو۔ بھئی پپا کہو

مجھے اور رہی بات بل ادا کرنے کی تو عینی ہماری بیٹی ہے، ہم نے اگر اس کا ذرا سا بل ادا کر دیا ہے تو کیا برا کیا۔ ہمارا فرض اور حق دونوں بنتے تھے۔ مانا کہ یہ تمہاری بیوی ہے، مگر برخوردار! یہ ہماری بیٹی پہلے ہے اور بڑوں کے ہوتے ہوئے چھوٹے بل ادا کریں، یہ بھی اچھا نہیں لگتا۔ اس لیے تمہارا گلہ عینی سے تمہاری محبت اور احساس ذمے داری کی حد تک تو ہمیں بہت پسند آیا ہے لیکن بیٹا آئندہ، اپنے اور ہمارے پیسے میں امتیاز مت کرنا۔ ہمارا جو کچھ بھی ہے عینی کا ہے اور تمہارا ہے۔'' یاسین بیگ نے مسکراتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں تفصیل سے جواب دیا۔

''تھینک یو سر...... اور سوری پپا!'' علی نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ سب ہنس پڑے۔

''آپ کا سب کچھ آپ کی بیٹی کا ہی ہونا چاہیے، آپ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں، میں اپنی محنت کی کمائی پر فخر محسوس کرتا ہوں۔ مجھے تو آپ اس چکر سے دور ہی رکھیے۔'' علی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''علی تم نے پھر غیروں والی بات کہی ہے''۔ یاسین بیگ نے شکوہ کیا۔ عینی کو سسر اور داماد کی یہ گفتگو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ علی کی خودداری کے قصے پپا سے سنے تو بہت تھے، اب اپنے سامنے دیکھ کر اور سن کر یقین بھی آ گیا تھا ان پر۔

''نہیں سر، میں نے اپنے مزاج کے مطابق جو بہتر سمجھا ہے، وہی کیا ہے، ویسے آپ کو جب بھی میری ضرورت محسوس ہو، آپ مجھے یاد کیجیے گا، میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔''

''مجھے یقین ہے علی کہ تم جو کہہ رہے ہو، دل سے کہہ رہے ہو، جیتے رہو۔'' یاسین بیگ نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرا دیا۔

''چلیں اب باقی باتیں گھر پہنچ کر کر لیجیے گا۔'' مسز یاسین بیگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''چلو بیٹا عینی! شکر ہے ہوسپٹل سے تو جان چھوٹی، اب ہم اپنی بیٹی کا بہت بہت خیال رکھیں گے، انشاء اللہ بہت جلد پہلے کی طرح صحت مند ہو جائے گی ہماری بیٹی۔''

یاسین بیگ نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا تو وہ مسکراتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

''ایک منٹ عینی!'' علی نے اسے روکا۔ وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی کہ اس نے سب کے سامنے اسے کیوں روکا۔ علی فوراً باہر گیا اور خان لالہ سے سرخ گلابوں کا گلدستہ لے کر واپس کمرے میں آ گیا اور اس کی طرف بڑھا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''نئی زندگی اور صحت یابی مبارک ہو۔''

عینی نے گلدستہ لے کر اس کی آنکھوں میں چاہت اور حیرت سے دیکھا۔ کتنا خلوص اور پیار جھلک رہا تھا اس کی آنکھوں سے، اس کے ایک ایک انداز سے اس کے لہجے سے اور وہ نجانے کیوں نادم سی ہو کر نظریں جھکا گئی۔ وہ چاہت اور محبت سے اسے دیکھنے لگا۔

''عینی بیٹا! تھینک یو بولو علی کو۔'' مسز یاسین بیگ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔

''تھینک یو۔'' عینی نے ایک لمحے کو نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور جیسے اس ایک لمحے میں ہی ان دونوں نے ایک دوسرے کو بہت کچھ کہہ دیا، بہت کچھ سن لیا۔ اگلے لمحے دو نظریں جھکا گئی۔ علی نے اس کی آنکھوں میں اترتے پانیوں کو بڑے کرب سے دیکھا، دل میں ایک درد، ایک ملال، ایک اضطراب سا پیدا ہو گیا، اور وہ اس کے ''تھینک یو'' کہنے پر مسکرا بھی نہ سکا۔

''علی بیٹا تم بھی ہمارے ساتھ ہمارے گھر چلو، آخر کو تم ہمارے داماد ہو۔ بیٹے کی طرح ہو، تم تو ایک بار بھی ہمارے ہاں رہنے نہیں آئے۔'' یاسین بیگ نے کہا۔

''ہاں بیٹا علی! تم بھی ہمارے ساتھ چلو، پھر عینی کے ساتھ ہی واپس اپنے گھر چلے جانا۔'' مسز یاسین بیگ نے بھی ان کی حمایت میں کہا تو عینی کا دل بھی بے اختیار چاہا کہ علی ان کی بات مان لیں اور ان کے ساتھ ہی گھر چلیں۔ اس نے امید بھری نظروں سے علی کو دیکھا۔ علی اس کی نظروں میں لکھی تحریر سمجھ گیا تھا مگر وہ اسے اپنی خوش فہمی سمجھ رہا تھا۔ اس نے ابھی تک اسے معاف جو نہیں کیا تھا، پھر وہ کیسے جاتا اس کے

؟ وہ اسے تنہائی میں سوچنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ اس لیے معذرت خواہانہ لہجے میں بولا:

''شکریہ آنٹی! انشاءاللہ میں پھر کبھی آؤں گا۔ ابھی تو آپ صرف عینی کو لے جائیے۔''

''ٹھیک ہے بیٹا، جیسے تمہاری مرضی۔'' مسز یاسین بیگ نے اصرار نہیں کیا اور عینی کا دل اور چہرہ دونوں بجھ گئے۔ علی کو یہ بھی محسوس ہو رہا تھا، مگر وہ اسے بھی اپنی خوش فہمی سمجھ رہا تھا۔ دل چیخ چیخ کر یقین دلا رہا تھا، مگر وہ عینی کی زبان سے سننا چاہتا تھا اور جو کچھ وہ اس کے ساتھ کر چکا تھا، اس کے بعد اس کی اشد ضرورت بھی تھی۔

ان سب کو رخصت کر کے وہ خان لالہ کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اپنے فلیٹ میں آ گیا۔ لاؤنج میں ایک سوگوار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہر چیز گرد آلود ہوئی تھی۔ وہ بے جان قدموں سے چلتا لاؤنج میں داخل ہوا۔ اس کی حالت ایک ہارے ہوئے جواری کی سی ہو رہی تھی جو اپنا سب کچھ لٹا کر، ہار کر آ رہا ہو۔ اس کا جسم آگ اگل رہا تھا۔ دو دن سے اسے بخار تھا، مگر اس نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا اور آج اس کی منت کا آخری روزہ بھی تو تھا۔ عینی کو نئی زندگی ملی تھی، وہ صحت یاب ہو کر ہوسپٹل سے گھر چلی گئی تھی۔ اس پر کیے جانے والے اپنے اس وحشیانہ تشدد کا منظر وہ اپنی آنکھوں میں گھومتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ وہ صوفے کے قریب نیچے گھٹنوں کے بل نڈھال ہو کر بیٹھ گیا اور صوفے کے ہتھے کے کنارے کو دیکھتے ہی اس پر مکا دے مارا۔ یہی تو عینی کے اپنڈکس پھٹنے کا سبب بنا تھا۔ اس کا ہاتھ کارپٹ پر تھا۔ اسے اپنے ہاتھ کے نیچے کوئی چیز محسوس ہوئی تو اس نے ہاتھ ہٹا کر دیکھا۔ اس کا اے والا لاکٹ جو اس نے شادی کی رات عینی کو رونمائی کے طور پر پہنایا تھا، پڑا تھا۔ اس نے لاکٹ کو اٹھا کر دیکھا۔ اس میں عینی کے چند ریشمی بال الجھے ہوئے تھے۔ جب علی نے اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچا تھا تو تب لاکٹ بھی اس کے ہاتھ کی گرفت میں آ گیا تھا اور کھل کر وہیں گر گیا تھا۔ اب اسے عینی کی خالی گردن اور اس پر آنے والی خراشیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ لاکٹ سے عینی کے بال علیحدہ کرتے ہوئے اپنی تنگ دل پر رو

پڑا۔

''اتنا ظالمانہ تشدد کر دیا تم نے معافی کی توقع رکھتے ہو۔ لعنت ہے تم پر، تم نے شک اور غصے کی انتہا کر دی تھی مرتے مرتے بچی ہے عینی! اگر خدانخواستہ وہ مر جاتی تو تم کیا کرتے؟ لوگوں کو، اپنے ضمیر کو، اپنے رب کو کیا جواب دیتے؟ کس کس کے سامنے صفائیاں پیش کرتے، کس کس سے معافی طلب کرتے؟ عینی اب اگر تمہیں معاف نہیں کر رہی تو ٹھیک ہی تو کر رہی ہے۔ تم نے جو سلوک اس کے ساتھ کیا تھا، وہ اس کے جسم اور روح پر گہرے نقش چھوڑ گیا ہے۔ اور کیا خبر وہ اب خود ہی تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کر لے۔ اونو۔ یااللہ، ایک اور امتحان، ایک اور اذیت، نہیں مالک! اب کچھ بھی سہنے کی ہمت نہیں ہے۔ تو نے عینی کو نئی زندگی عطا کی ہے تو مجھے اس کی محبت، اس کا ساتھ بھی عطا فرما دے ورنہ میں مر جاؤں گا۔''

علی نے سوچتے ہوئے روتے ہوئے اپنے آپ سے کہا پھر اللہ سے دعا مانگی اور نجانے کتنی دیر وہ اپنی غلطی پر نادم ہوتا رہا، روتا رہا، تڑپتا رہا اور بخار میں جلتا رہا۔

اگلے کئی روز تک اسے بخار نے گھیرے رکھا۔ خان لالہ نے اس کی خوب تیمارداری کی۔ یاسین بیگ کو بھی اس نے اس کی بیماری کی اطلاع کر دی تھی۔ وہ عاصم کے ساتھ کئی بار اس کی عیادت کے لیے گئے تھے۔ انہوں نے عینی کو علی کی بیماری کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا اور عینی، علی کے گھر نہ آنے پر دل ہی دل میں اس سے ناراض بھی تھی اور پریشان بھی تھی۔ اس کی سرخ سرخ آنکھیں جو اس کے رت جگوں کی گواہ تھیں، اس کے دل میں کھب گئیں تھیں۔ اس نے دو ایک بار علی کو فون کرنا چاہا مگر خان لالہ کی آواز سن کر خوفزدہ ہو کر فون بند کر دیا۔ اس کے گھر آتے ہی مما پاپا نے دو کالے بکروں کا صدقہ دیا تھا، رقم بھی اس کے سر سے وار کر غریبوں میں تقسیم کی تھی۔ نیاز دلوائی تھی۔ اس کا خوب خیال رکھا جا رہا تھا۔ صبح شام جوس، پھل، دودھ، چکن اور یخنی اسے پلائی جا رہی تھی۔ وہ ان چند دنوں میں جسمانی کمزوری سے نجات حاصل کر چکی تھی۔

اب تو اسے یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہ کہیں علی اس کی مسلسل خاموشی سے تنگ آ کر

اسے طلاق ہی نہ دے دے۔ اس خیال سے وہ روح تک سے بے چین، بے قرار ہو جاتی۔

عاصم کے گھر والے بھی آ چکے تھے اور انہوں نے ڈاکٹر ہما کو پسند کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے والدین سے عاصم کے رشتے کی بات بھی کر لی تھی اور دو چار ملاقاتوں کے بعد ڈاکٹر ہما کے گھر والوں نے عاصم کا رشتہ منظور کر لیا تھا۔ عاصم تو بہت خوش تھا۔ وہ ڈیڈی کے ساتھ مل کر اپنا بزنس وائنڈ اپ کر کے پاکستان سیٹل ہو رہا تھا اور اپنے لیے بنگلہ بھی ڈھونڈ رہا تھا کیونکہ ابھی تو وہ لوگ یاسین بیگ کے ہاں ہی قیام پذیر تھے۔ اسی مصروفیت کے باعث وہ عینی سے بھی اس صبح و شام کو مل پاتا۔ وہ اکیلی سارا سارا دن بور ہوتی رہتی یا علی کے متعلق سوچتی اور پریشان ہوتی رہتی۔ وہ ان میں بیٹھی گھاس کے تنکے توڑ رہی تھی۔ سوچ کر دائرہ علی کے گرد ہی گھوم رہا تھا۔ عاصم گھر آیا تو اسے وہاں بیٹھا دیکھ کر وہیں چلا آیا۔

"کیا ہو رہا ہے سسٹر، مسز علی؟" اس نے اس کے سامنے گھاس پر بیٹھتے ہوئے پوچھا "میں مسز علی ہوں۔ ساتھ میں سسٹر کیوں کہا آپ نے؟" اس نے اس کے چہرے کو دیکھا۔

"سسٹر تم میری ہو اس لیے کہا اور مسز علی، علی کے حوالے سے کہا ہے"۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"بنگلہ مل گیا آپ کو؟"

"ہاں ہی سمجھو مگر تم کیوں اکیلی بیٹھی ہو، اداس اور افسردہ سی؟" اس نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے فکرمندی سے پوچھا تو اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"آپ کو کیا، آپ کو تو آج کل اپنے گھر اور شادی کی فکر ہے، بہن بنا تو لی تھی مگر بہن کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ سارا سارا دن میں آپ سے بات کرنے کے لیے انتظار میں بیٹھی رہتی ہوں اور آپ ہیں کہ اپنے بنگلے کے چکروں سے ہی باہر نہیں نکلتے۔ بے پروا بھائی!"

"ارے ارے ایسے تو نہ کہو سسٹر، تم تو میری سگی بہن ہو۔ اتنی پیاری بہن کہ

مجھے پروا نہ ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اچھا معاف کر دو۔ میں نے ناحق خود کو اتنا مصروف کر لیا تھا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب تمہیں پورا وقت دوں گا۔ شاباش، اب مسکرا دو۔"

عاصم نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر بہت نرمی اور محبت سے کہا تو وہ اتنا شفیق دوست اور بھائی اپنے قریب محسوس کر کے اپنے غم کو مزید چھپا نہ سکی اور بے اختیار ہو کر رونے لگی۔

"عینی! کیا ہوا ہے سسٹر، تم رونے کیوں لگیں؟" عاصم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"آپ کو...... اپنے گھر سے...... فرصت مل...... جائے تو میرے گھر کا چکر بھی لگا آئیے گا۔ اتنے دن ہو گئے...... آپ نے علی کی بات نہیں کی۔ وہ یہاں نہیں آئے۔ آپ نے پوچھا تک نہیں، کیوں نہیں آئے یہاں؟" روتے ہوئے اٹک اٹک کر بولی۔

"اوہ تو علی کی جدائی نے تمہیں سی سونگ (الیہ گیت) بنا رکھا ہے۔ اب سمجھا تو محترمہ مسز علی، آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ آپ کے محبت کرنے والے شوہر نامدار آپ کو ہسپتال سے گھر رخصت کر کے گزشتہ دو ہفتوں سے ہسپتال کے چکر لگا رہے ہیں۔ بیماری نے خوب لتے لیے ہیں ان کے۔"

"کیا علی بیمار ہیں؟" اس نے روتے روتے ایک دم سے پریشان ہو کر پوچھا۔

"اب تو بہتر ہیں مگر کافی بیمار رہ چکے ہیں اور تم کیسی بیوی ہو، اپنے شوہر کی تیمارداری کرنے کی بجائے یہاں بیٹھی پریشان ہو رہی ہو۔" علی نے منع کیا تھا کہ تمہیں نہ بتایا جائے اس لیے میں نے اور انکل آنٹی نے تمہیں نہیں بتایا۔ ہم تو تقریباً روزانہ ان کے در دولت پر حاضری دیئے جاتے رہے ہیں۔ ان کے دوست خان لالہ نے ان کی بہت خدمت کی ہے۔ تم بھی خیر سے اب صحت یاب ہو، تم خود کیوں نہیں چلی جاتیں علی کے پاس؟"

''میں خود نہیں جا سکتی۔'' انہوں نے روتے ہوئے کہا۔

''تو میں چھوڑ آتا ہوں۔''

''نہیں میں اس طرح نہیں جا سکتی۔'' عینی نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''کیا علی ناراض ہے تم سے؟''

''نہیں۔''

''تو کیا تم علی سے ناراض ہو''۔

''مجھے نہیں پتہ۔'' وہ بھیگی آواز میں بولی تو عاصم نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا:

''عینی! اسٹرانا کی بات مت ماننا، دل کی بات ماننا۔ اگر علی تم سے ناراض ہیں تو تم انہیں منالو۔ اگر تم ان سے ناراض ہو تو ناراضگی ختم کرلو۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔ تم بھی پریشان، وہ بھی بیمار۔ علی بہت اچھے انسان ہیں، میری تو ان سے خوب دوستی ہوگئی ہے''۔

''وہ بہت اچھے انسان ہیں تو خود کیوں نہیں منا لیتے مجھے۔ آئیں، آکر لے جائیں مجھے۔ کیوں نہیں آتے وہ یہاں؟'' وہ ناراض لہجے میں بولی۔

''بتایا تو ہے کہ وہ بیمار تھے اور اب وہ اسلام آباد چلے گئے ہیں۔ دو چار دن موسم کا مزا لیں گے اس کے بعد اپنا پاسپورٹ بنوائیں گے۔ ویزا بھی لگوانا ہے۔''

''پاسپورٹ، ویزا مگر کس لیے؟'' عینی کا دل خوف سے دھڑکا۔ تو کیا وہ اسے چھوڑ کر کہیں جا رہے ہیں؟'' اس نے سوچا۔

''انکل بتا رہے تھے کہ علی کو باہر کی کسی کمپنی نے جاب کی آفر کی ہے۔ شاید علی اسی سلسلے میں جانا چاہ رہے ہیں۔ کمپنی نے اپنے ویزے پر بلوایا تھا، بہرحال، تم اٹھو، میں تمہیں آئس کریم کھلا کر لاتا ہوں۔'' عاصم نے اپنی بات مکمل کی اور کھڑا ہو گیا۔

عینی کا دل بیٹھنے لگا۔

''علی! آپ اور کتنا ظلم کریں گے مجھ پر؟'' رات کو وہ بستر پر سونے کے لیے آئی تو اس کی آنکھیں پھر سے برس پڑیں۔ گلدستہ جو ہسپتال سے آتے وقت علی نے اسے دیا تھا، اس کے سرہانے رکھے رکھے مرجھا گیا تھا۔ اس نے پھولوں کی سوکھی

پتیوں سے اپنے تکیے پر بار بار علی کا نام لکھا، مٹایا، پھر لکھا، اور اب مٹانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔

☆☆☆

عاصم نے بہت شاندار بنگلہ خریدا تھا۔ اس کی شادی کی تاریخ پچیس دسمبر طے کی گئی تھی اور ابھی تو ستمبر شروع ہوا تھا۔ خاصا وقت تھا تیاری کا، سیٹنگ کا۔ بہت دن سے عینی کی طبیعت پھر سے خراب رہنے لگی تھی۔ کھانے پینے تک سے دل اچاٹ اور بیزار ہو گیا تھا۔ طبیعت ہر وقت بوجھل بوجھل رہنے لگی تھی۔ مسز یاسین بیگ نے پریشان ہو کر ڈاکٹر ہما سے اس کا چیک اپ کرایا۔ انہوں نے اس کو خوش رہنے کی ہدایت کی اور رپورٹس دو دن بعد آکر لے جانے کو کہا۔ اسے اب اپنی رپورٹس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ہر وقت بہت بے چینی اور بے قراری سی محسوس کرنے لگی تھی۔ ڈیڑھ ماہ وہ علی کے ساتھ رہی تھی۔ دس دن ہوسپٹل میں گزارے تھے جہاں علی ہمہ وقت اس کے پاس موجود تھا۔ اور اب ڈیڑھ ماہ سے علی نے اس کی کوئی خبر نہیں لی تھی۔ صبح پپا نے بتایا تھا کہ آج علی آفس آیا تھا تو اس کے دل کو کچھ سکون ملا۔ اس نے رات ہی علی کا نمبر ڈائل کرلیا۔ فون علی نے ہی ریسیو کیا۔ اس نے اس کی آواز سن کر فون بند کردیا۔

علی اخبار پڑھ رہا تھا، ٹیلی فون کی گھنٹی دوبارہ بجی تو اس نے ٹیلی فون کی طرف دیکھا۔

میرا یہ فون نمبر تو عاصم کو معلوم ہے۔ خان لالہ یا یاسین بیگ صاحب کی فیملی کو۔ پھر یہ بار بار کون فون کر رہا ہے، بات بھی نہیں کر رہا۔ کہیں یہ عینی تو نہیں۔

اس کے دل نے عینی کا نام لیا تو اس نے فوراً ریسیور اٹھا لیا۔

''ہیلو علی اسپیکنگ''۔

عینی کے لب سل گئے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ بول سکی۔ اس کی آواز سنتی رہی۔ بے آواز روتی رہی۔ علی کو بھی جیسے یقین تھا کہ دوسری جانب اس کی محبت اس کی عینی ہی ہے۔ اس لیے اس نے بھی فون بند نہیں کیا، بلکہ اس خاموشی میں اپنی عینی

کی سانسوں کی آواز کو محسوس کرتا رہا، سنتا رہا۔

''ہیلو عینی!'' علی سے مزید صبر نہ ہو سکا، بالآخر بول ہی پڑا اور عینی کی بے اختیار نکلنے والی سسکی کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

چند لمحے تک تو وہ ریسیور کو تکتا رہا۔ آخر تھک کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ اس کے دل میں عینی کی محبت نے ایک بار پھر پوری شدت سے سر اٹھایا اور اس کے اندر ہلچل مچا کے رکھ دی۔ وہ بے قراری سے اٹھ کر لاؤنج میں ٹہلنے لگا اور اسے اپنی آنکھوں اور اپنے دل و روح میں محسوس کرتے ہوئے بولا:

''یہ کیسی دوری ہمارے بیچ حائل ہو گئی ہے عینی! کہ تم مجھ سے پیار بھی کرتی ہو، مجھے سب کے سامنے شرمندہ ہونے سے، سب کی نظروں سے گرنے سے بھی بچاتی ہو اور معاف بھی نہیں کرتیں۔ مجھے فون بھی کرتی ہو اور مجھ سے بات بھی نہیں کرتیں۔''

''علی! تم نے تو اپنے ہاتھوں سے اس پھول کو مسل دیا تھا جس کی خوشبو نے تمہارے تن، من اور آنگن کو مہکا دیا تھا۔ عینی نے کیا نہیں کیا تمہارے کہنے پر؟ اس نے تو کبھی خود سے اٹھ کر پانی بھی نہیں پیا تھا اور تمہاری خاطر اس نے کوکنگ تک کرنا شروع کر دی تھی۔'' علی کے اندر کے آدمی نے اسے یاد دلایا۔ وہ ٹہلتا ہوا کمرے میں آیا اور میز پر کھانے کی تراکیب والی کتب دیکھ کر بولا:

''وہ بیچاری تو مجبور تھی کہ اسے دو ماہ تک مجھ سے گریز کرنے کا پابند بنایا گیا تھا۔ ورنہ اس نے ایسی تو کوئی خطا نہیں کی تھی کہ جس پر اسے یوں مارا پیٹا جاتا۔ بے ایمانی تو میرے دل میں آ گئی تھی، اسے دیکھتے ہی اس کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس نے میری ہر بات ماننے کی پوری کوشش کی تھی۔ غلط تو میں کر رہا تھا۔ میں نے اسے مذاق میں تنگ کرنے کی غرض سے اپنے رعب دار لہجے میں حکم صادر کرنا شروع کر دیئے۔ کس قدر ڈری ڈری، سہمی سہمی اور خوفزدہ سی رہتی تھی وہ مجھ سے۔ محبت کو ڈرایا تو نہیں جاتا محمد علی! لیکن میں تو اکثر مذاق میں اسے ستانے کی غرض سے اس کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ کرتا تھا اور وہ معصوم لڑکی سہم جاتی، سمٹ جاتی تھی اور کیا کر سکتی تھی میرے سامنے، ایک طاقتور اور مضبوط مرد کے سامنے تو وہ ایک نرم و

نازک سی شاخ تھی، کلی تھی، بہت سزا دی ہے میں نے اسے اس کی معصومیت اور محبت کی۔ میں نے اسے غلط سمجھا، غلط کیا، گناہ گار کہا حالانکہ میں خود اس کا گناہ گار تھا اور اب بھی ہوں۔ میں خود غلطی پر تھا۔ اس کے رونے، تڑپنے کا اثر اس وقت ہوا مجھ پر جب وہ میرا ظلم سہہ چکی تھی۔ زخموں سے چور چور ہو گئی تھی۔ او گاڈ! میں کیسے منا کر لاؤں اسے اپنی عینی کو اپنی زندگی کو؟''

وہ خود سے الجھتے الجھتے تھک کر چائے بنانے کے ارادے سے کچن میں آیا تو اسے عینی کے ہاتھ کی بنی چائے یاد آ گئی اور وہ چائے بنانے کا ارادہ ملتوی کر کے لاؤنج میں آ گیا۔ اسی وقت ڈور بیل بج اٹھی۔

رات کے گیارہ بجے کون آ گیا، آج تو موسم بھی قدرے ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ وہ سوچتا ہوا دروازے تک گیا۔ پوچھنے پر عاصم نے اپنا نام بتایا تو اس نے دروازہ کھول دیا اور سلام دعا کے بعد اسے اندر لے آیا۔

''خیریت تو ہے عاصم، تم اتنی رات گئے یہاں کیسے؟'' علی نے پوچھا۔

''پہلے تم مجھے بتاؤ کہ تم ابھی تک جاگ کیوں رہے ہو؟'' عاصم نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے مسکراتے ہوئے سادہ سا جواب دیا ''نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے جاگ رہا ہوں۔''

''کوئی خاص وجہ نیند نہ آنے کی؟'' عاصم نے شرارت سے کہا۔

''کوئی خاص وجہ کیا ہو سکتی ہے؟'' وہ سمجھ کر بھی انجان بن رہا تھا۔

''عینی!'' عاصم نے کہا تو علی نے مضمحل سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا:

''ہاں عینی! کیسی ہے وہ؟''

''ٹھیک نہیں ہے، آج کل اس کی طبیعت کافی خراب رہنے لگی ہے، چند دن پہلے ہی تو پہلی تکلیف سے صحت یاب ہوئی تھی، اب نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ آنٹی اسے کھانا بھی بہت منتیں کر کر کے کھلا پاتی ہیں۔ چیک اپ تو کرایا ہے آنٹی نے اس کا اب دیکھو رپورٹس آئیں گی تو معلوم ہو گا کہ کیا مسئلہ ہے؟''

''او مائی گاڈ! اب کیا ہو گیا اسے؟'' علی نے پریشانی سے کہا۔

''اسے جو کچھ بھی ہوا ہے نا، تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔''

''میری وجہ سے''۔ علی نے انجانے خدشے سے لرزتے ہوئے کہا۔

''علی سچ بتاؤ، تم ناراض ہو عینی سے؟''

''نہیں میں بھلا اس معصوم لڑکی سے ناراض کیوں ہوؤں گا؟''

''تو کیا عینی تم سے ناراض ہے؟''

''ہوں......شاید''۔

''تو علی یار، جو بھی اور جس بھی قسم کی ناراضگی تم دونوں کے درمیان ہے، اسے دور کرو بلکہ ختم کرو اور جا کر عینی کو منا کر گھر لے آؤ، ورنہ پچھتاؤ گے۔''

''یعنی''۔ علی نے فکر مند ہو کر اسے دیکھا۔

''یعنی یہ کہ ایک تو پہلے ہی اس کی صحت ٹھیک نہیں رہتی اور اوپر سے وہ بے چاری تمہارے انتظار میں تمہاری یاد میں رو رو کر ہلکان ہو گئی ہے۔ تم عجیب آدمی ہو ایک طرف تو جان نثار کرنے کی حد تک اسے چاہتے ہو اور دوسری جانب یہ بے نیازی کہ ڈیڑھ ماہ سے تم نے اس کی کوئی خبر تک نہیں لی۔ مجھ سے تو اس کی بے چینی اور پریشانی نہیں دیکھی جاتی، اگر مزید کچھ دن تمہاری طرف سے یہی بے نیازی اور بے رخی جاری رہی تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں میری معصوم اور اکلوتی بہن اپنی جان سے ہی نہ چلی جائے۔'' عاصم نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''فار گاڈ سیک یار، اب ایسی خطرناک باتیں تو نہ کرو۔'' علی کی روح کانپ اٹھی بے چینی سے بولا۔

''تو چلو اسے منا کر لے آؤ''۔ عاصم نے کھڑے ہو کر کہا۔

''لے آؤں گا۔'' علی نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''کب لے آؤ گے، جب وہ جان سے گزر جائے گی؟'' عاصم بھی عینی کی حالت سے پریشان تھا، تلخی سے بولا۔ علی کو ایسا لگا جیسے اس کے دل میں اس نے خنجر اتار دیا ہو۔

''میں دو ایک روز میں اسے لے آؤں گا، مجھے تم سے زیادہ فکر ہے اس کی۔'' علی نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''فکر ہونی بھی چاہیے، وہ بیوی ہے تمہاری اور ایک ہی ہے، کوئی دو چار تو ہیں نہیں کہ ایک نہ سہی دوسری سہی، دوسری نہ سہی، تیسری سہی اس سے کام چلا لو گے۔'' عاصم نے سنجیدگی سے کہا مگر علی کو ہنسی آ گئی۔

''تو تم اس وقت اس مقصد کے لیے یہاں آئے تھے۔'' علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ظاہر ہے، اور کیا کرنا تھا مجھے اتنی رات گئے۔ اب میں چلتا ہوں۔'' وہ گاڑی کی چابی لہراتا ہوا دروازے کی جانب بڑھا۔

''چائے تو پیتے جاؤ''۔

''پی لوں گا! مگر تمہارے ولیمے کی زبردست دعوت کھانے کے بعد۔'' وہ مسکراتا ہوا باہر نکل گیا علی نے اسے خدا حافظ کہہ کر دروازہ بند کر دیا جبکہ اس کے دل کا دروازہ عینی کو خوش آمدید کہنے کے لیے نئے اہتمام کے ساتھ کھل گیا تھا۔ وہ اپنے لیے اسے اب بھی بے قرار جان کر بہت خوش ہو رہا تھا اور اسے جلد از جلد گھر لانے کا سوچ رہا تھا۔

عاصم اپنے ممی ڈیڈی کے ساتھ اپنے بنگلے میں شفٹ ہو گیا اور اگلے دن ان لوگوں نے یاسین بیگ، مسز یاسین بیگ اور عینی کو لنچ پر اپنے گھر مدعو کیا۔ عینی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ صبح سے اس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ آرام کرنے کی غرض سے اپنے کمرے میں لیٹی رہی۔ یاسین بیگ اور مسز یاسین بیگ نسرین کو اس کی دیکھ بھال، اس کا خیال رکھنے کا حکم دے کر عاصم کے ہاں چلے گئے۔

موسم خاصا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ صبح سے ہلکی ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی۔ عینی نے نہا کر نیلے رنگ کا سوتی شلوار قمیض زیب تن کیا تھا۔ قمیض پر سفید رنگ کا بہت دیدہ زیب کام کیا ہوا تھا۔ سفید دوپٹے کے کناروں پر نیلے دھاگے سے کڑھائی ہوئی تھی۔ وہ تیار تو بہت خوشی سے ہوئی تھی۔ عاصم کے ہاں جانے کے لیے لیکن عین وقت پر طبیعت

زیادہ خراب ہوگئی، دل بجھ گیا۔ کوئی یاد آ رہا تھا۔ شاید وہ بیڈ پر بیٹھی علی کی تصویر دیکھ رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے تصویر سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر آہستہ سے کہا۔ ''آجایئے''۔

دروازہ کھلا تو عاصم مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

''ارے عاصم بھائی! آپ یہاں کیوں آگئے۔ آپ کے گھر میں تو دعوت ہے۔'' ممی نے حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھائی کے گھر میں دعوت ہو اور بہن موجود نہ ہو تو خاک مزہ آئے گا دعوت کا۔ کیوں نہیں آئیں تم ہمارے گھر؟'' وہ اس کے بیڈ کے قریب کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''مما پپا نے آپ کو نہیں بتایا؟''

''بتایا ہے، مگر یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے تم یہاں بھی تو بیٹھی ہو، وہاں بیٹھ جاتیں میں نے کون سا تم سے کھانا پکوانا تھا۔''

''مجھ سے کھانا تو صرف وہی پکوا سکتے ہیں۔'' عینی نے علی کے تصور میں کھو کر کہا۔ اب میں سمجھا وہاں نہ جانے کی وجہ مسٹر علی ہیں۔ ارے وہ کون سا لندن گئے ہوئے ہیں۔ علی جاؤ ان کے پاس۔'' عاصم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ کیوں نہیں آتے میرے پاس؟'' اس نے ناراض لہجے میں کہا تو وہ اس کی معصومیت پر ہنس دیا اور پھر پیار سے اسے دیکھتے ہوئے بولا:

''بہت اچھی لگ رہی ہو خفا خفا، الجھی الجھی، پریشان سی۔''

''اچھے بھائیوں کو تو اپنی بہنیں ہر حال میں اچھی ہی لگتی ہیں۔'' عینی نے مسکرا کر کہا۔

''تو اچھے بھائی کی اچھی بہنا، جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ، میری شادی کی ساری رونق تمہارے دم سے ہوگی۔'' عاصم نے مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

''ہاں اگر دم میں دم باقی رہا تو آپ کی شادی میں پوری تیاری سے شرکت کروں گی۔ آپ بھی دودھ پلائی اور جوتا چھپائی کی رقم سنبھال کر رکھیے گا۔'' عینی

نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ہنس کر بولا۔

''تم صحت یاب تو ہو جاؤ بہنا، سب رسمیں اور رقمیں ادا ہوں گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔''

''آپ کی اور ہما باجی کی جوڑی بہت جچے گی۔''

''تمہاری اور علی کی جوڑی بھی خوب جچتی ہے۔ تم اور علی اے سے شروع ہوتے ہو الف سے یعنی انتہا سے۔'' عاصم نے شوخی سے کہا۔

''انتہا ہی تو کر دی تھی علی نے محبت کی بھی اور نفرت کی بھی۔'' عینی نے دل میں کہا۔

''آپ کا بھی تو اے سے عاصم بھائی''۔ اس نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہم تینوں کی مثلث ہے، عینی، علی اور عاصم، خوب دوستی کی ہماری اور ابھی ہمارے بھیا جان بھی کل تشریف لا رہے ہیں اپنی مسز کے ساتھ۔ تم بھی اپنے مسٹر کے ساتھ ہمارے گھر آتا۔ اس دعوت میں تو رف تم لوگوں خو ہی انوائیٹ کیا تھا۔ اصل دعوت تو میری شادی کی دعوت ہوگی۔'' عاصم نے مسکراتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا تو وہ دھیرے سے ہنس دی۔

''کھٹ کھٹ......'' دروازے پر دستک ہوئی تو عینی کی بجائے عاصم نے کہا:

''کم ان''۔

دروازہ کھلا تو اور داخل ہوتے علی کو دیکھ کر عینی کے دل کی دھڑکنیں اور سانسیں بےترتیب ہونے لگیں، ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ چہرہ خوف سے سفید ہونے لگا۔ عاصم اس کے بیڈروم میں موجود تھا۔ وہ لاکھ علی سے اپنی دوستی کا ذکر کرتا تھا، مگر اس کا اس کے بیڈروم میں موجود ہونا علی کو ایک بار پھر کسی غصے اور شک میں مبتلا کر سکتا ہے، یہ وہ جانتی تھی۔ اس کا پورا وجود خوف سے لرزنے لگا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔

''ہیلو علی کیا حال ہے؟'' عاصم نے کرسی سے اٹھتے ہوئے علی سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''میں تو ٹھیک ہوں تم سناؤ، یہاں کیسے؟'' علی نے اس سے ہاتھ ملاتے

ہوئے؟ نظروں سے عینی کے خوف سے پیلے پڑتے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں عینی سے ملنے آیا تھا۔ اچھا ہوا تم آ گئے۔ دیر لگی آنے میں تم کو شکر ہے پھر بھی آئے تو۔''

''مجھے تو آنا ہی تھا۔''

''چلیے مسز علی انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں، تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آ گیا ہے۔ میں چلتا ہوں اور علی تم۔'' وہ بولتے بولتے علی کی طرف مڑا ''اب اسے لے جانا مجبت ہے۔''

''تم فکر نہ کرو، میں جانتا ہوں مجھے عینی کو کس طرح لے جانا ہے؟'' علی نے بے تاثر اور ذو معنی لہجے میں کہا تو عینی کی جان نکلنے کو ہو گئی۔ اس کے ظلم و تشدد، تہمت و ذلت کا پچھلا سبق ہی ابھی وہ بھلا نہیں سکی تھی۔ اب ویسا ہی اگلا سبق لینے کے لیے خود کو تیار کرنا کسی امتحان اور عذاب سے کم نہیں تھا اس کے لیے وہ آنے والے لمحات سے بری طرح ڈری ہوئی تھی۔ علی کی محبت کی طرح اس کا غصہ کتنا شدید ہے، یہ اس سے بہتر اور کون جان سکتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو سمجھانے، سنبھالنے میں کوشاں تھی۔

عاصم چلا گیا تھا۔ علی اس کے بیڈ کے قریب کھڑا تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھی اپنی تصویر کو اس نے خوشگوار حیرت سے دیکھا اور پھر عینی کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا:

''تمہارے مما پپا کہاں ہیں؟''

''وہ...... عاصم بھائی کے گھر...... دعوت پر گئے ہیں۔'' اس نے ڈرتے ہوئے آہستہ سے بتایا۔

''تم کیوں نہیں گئیں؟''

''میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اور دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔'' اس نے ایمانداری سے بتایا۔

''تو مسٹر عاصم یہاں تمہاری طبیعت درست کرنے اور تمہارا دل بہلانے کے لیے آئے تھے۔'' علی نے سپاٹ اور طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ دکھ سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''یہ شخص اب بھی نہیں بدلا۔ شک کا کانٹا اس کے دل سے اب بھی نہیں نکلا۔ اس سے اب محبت کی توقع رکھنا حماقت ہے۔'' عینی نے دکھی ہو کر سوچا۔ اتنے دنوں بعد اس کی صورت دکھائی دی تھی اور وہ تھا کہ ملتے ہی طنز کے نشتر برسانے لگا تھا۔ وہ اندر تک سے دکھی اور آزردہ ہو گئی۔

''اٹھو، چلو میرے ساتھ۔'' علی نے اسے خاموشی دیکھ کر سپاٹ لہجے میں کہا۔

''کہاں؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''گھر، اور کہاں؟'' وہ بے تاثر لہجے میں بولا۔ ''میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ بہت عیش و آرام کر لیا، اپنے پپا کے گھر میں اب چلو اس ڈربے نما فلیٹ کو بھی تمہاری ضرورت ہے۔ بہت خراب ہو رہا ہے وہ فلیٹ اس روز سے کسی نے صفائی تک نہیں کی۔ ہر جگہ گرد جمی ہوئی ہے، ہر چیز مٹی ہو رہی ہے اور میں بھی بازاری کھانے کھا کھا کر عاجز آ گیا ہوں۔ چلو اٹھو، سارا کام بکھرا ہوا ہے وہاں۔ سمیٹو چل کر۔''

''اگر کام ہی کروانا ہے تو آپ نسرین یا خادم کو اپنے ساتھ لے جائیے، وہ سب کام کر دیں گے۔'' عینی کو اپنی اہمیت ایک ملازمہ کی شکل میں جان کر بہت صدمہ پہنچا۔ وہ آہستگی سے بولی:

''انہیں مجھ سے اب ذرا بھی محبت نہیں ہے۔ کہاں تو رو رو کر معافی مانگ رہے تھے اور اب...... شاید وہ وقتی اور جذباتی دورہ تھا اپنے پھنسنے کا خدشہ بھی ہو گا۔ وہ وقت تو گزر گیا نا۔ اب انہیں کیا خواہ میں کسی بھی حال سے گزروں۔'' عینی نے بہت دکھ سے سوچا۔

''انہیں بھی بلا لیں گے، پہلے آپ تو چلیے گھر کی مالکن کے بغیر گھر میں غیر عورت کو بلانا نہ تو مجھے پسند ہے اور نہ ہی میں اکیلی غیر عورت کو اپنے گھر میں اپنی موجودگی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ چلو اٹھو فوراً۔''

علی نے طنزیہ، ترش اور تیز لہجے یں کہا تو وہ ہمت کر کے بیڈ سے اتر گئی، ٹانگیں کانپ رہی تھیں، پاؤں میں جوتے پہنے اور چلنے تک کی سکت نہیں پا رہی تھی وہ خود میں۔ ایک قدم اٹھایا تو لڑکھڑا گئی۔ علی نے اس کا بازو پکڑ کر اسے گرنے سے تو بچا لیا

مگر چبھتے ہوئے لہجے میں بولا:

''قدم صرف غلط راستے پر لڑکھڑاتے ہیں۔ صحیح اور سیدھے راستے پر چلتے ہوئے تو قدموں کو نہیں لڑکھڑانا چاہیے''۔

''جب رہنما مشکوک ہو اور منزل کا یقین نہ ہو تو قدم ہر راستے پر لڑکھڑا جاتے ہیں مسٹر علی''۔ عینی نے برجستہ جواب دیا تو وہ ہنس پڑا۔

اسے لگا جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے اور وہ سلگ کر رہ گئی۔

''محبت کرنے کے لیے پہلی شرط ہی یقین ہوتا ہے عینی ڈیئر، اور تم بغیر یقین کے تو مجھ سے محبت نہیں کر سکتی ناں۔'' وہ اس کا بازو چھوڑ کر مسکراتے ہوئے بولا:

''اور آپ یقین دلانا چاہتے ہی نہیں ہیں''۔

''میں یقین نہ بھی دلاؤں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم مجھ سے محبت کرنے پر مجبور ہو کیونکہ دل پر کسی کا زور نہیں چلتا اور مشرقی بیوی بیچاری لاکھ شوہر کی مار کھائے زخموں سے چور چور ہو جائے۔ اپنے مجازی خدا سے نفرت کرنے کا وہ تب بھی نہیں سوچتی، سراپا محبت بنی رہتی ہے۔ خواہ مخواہ اپنے شوہر کو شرمندہ کرنے کا ڈرامہ کرتی ہے۔'' لہجہ بہت طنزیہ تھا۔

''اگر آپ کے نزدیک محبت ڈراما ہے تو آپ بھی یہ ڈراما بہت کامیابی سے کر چکے ہیں۔ اب دوسروں کا مذاق اڑانے کا آپ کو کوئی حق نہیں ہے۔'' عینی نے بہ مشکل اپنے لہجے کو سپاٹ رکھ کر کہا۔ آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

''مجھے دوسروں سے کیا لینا۔ مجھے تو تم سے بہت کچھ لینا ہے اور تمہیں بہت کچھ دینا ہے، ذرا گھر تو چلو میری جان۔'' علی نے بہت سخت اور طنزیہ لہجے میں کہا۔'' اس نے تاسف بھری ایک نگاہ اس پر ڈالی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''اپنے مما پپا سے تو پوچھ لو، ان کی اجازت کے بغیر میرے ساتھ جا رہی ہو۔'' وہ اس کے یوں جانے پر حیران ہوا اور اس کے پیچھے آتے ہوئے اسی طنزیہ اور کاٹ دار لہجے میں کہا۔

''کوئی گناہ کرنے نہیں جا رہی، اپنے شوہر کے ساتھ جا رہی ہوں اور شوہر کے

ساتھ جانے کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے مجھے اور نہ ہی مما پپا کو میرا آپ کے ساتھ جانا قابل اعتراض محسوس ہو گا۔ ان کی اجازت اور مرضی نکاح کے وقت زیادہ اہم تھی۔ اعتراض ہو بھی تو آپ کو فکر نہیں کرنی چاہیے۔ آپ میرے شوہر ہیں اور شوہر کا حکم سر آنکھوں پر، چلیے۔''

وہ بہت سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں بولی اور اس پر حیرتوں کے پہاڑ توڑتی باہر آ گئی۔ وہ بھی باہر آ گیا اور یو پی ریڈ کلر کی نئی ہونڈا سوک کے قریب رک کر فرنٹ ڈور کھول کر اسے مخاطب ہوا۔

''آئیے مسز عینی علی، تشریف رکھیے۔''

''یہ گاڑی''۔ وہ گاڑی کو دیکھتے ہوئے اتنا ہی بول سکی۔

''یہ گاڑی میں نے تمہارے لیے خریدی ہے''۔

''میرے لیے کیوں؟'' اس نے بے حد حیرت سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

''موٹر بائیک تمہارے شایان شان نہیں ہے عینی ڈارلنگ!'' یہی کہا تھا نا زاہد قریشی نے تم سے۔'' علی نے طنزیہ لہجے میں کہا، اسے اپنی ہتک کا احساس روح تک میں سرایت کرتا ہوا محسوس ہوا۔

''دوسروں کے کہے کی آپ کو بہت پروا ہے۔'' عینی نے بھرائی آواز میں کہا۔

''ارے جناب! ہمیں تو آپ کی بھی بہت پروا ہے۔'' وہ اس کے قریب ہو کر بولا تو اس کے قریب کی گرمی سے تپ کر وہ تیزی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ علی نے مسکراتے ہوئے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا اور خود دوسری جانب آ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ گاڑی کشادہ گیلی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ بارش نے موسم خوشگوار بنا دیا تھا مگر عینی کے دل کا موسم بہت اداس، بہت خزاں رسیدہ ہو کر رہا تھا۔ آنکھیں بادل کی طرح برس رہی تھیں۔ وہ بے آواز رو رہی تھی۔ علی نے ونڈ اسکرین پر سے نظریں ہٹا کر اس کے چہرے کو دیکھا تو اس کے آنسو اسے تڑپا گئے۔ اور وہ دل ہی دل میں اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''ارے پگلی، آخری بار ستا رہا ہوں، سہ لو، پھر اس کے بعد اتنی محبتیں دوں گا

کہ تم ترسو گی ان جھوٹ موٹ کے طنز اور بے رخی بھرے لمحات کو۔ ناراض ہونے کا موقع بھی نہیں دوں گا آج کے بعد کبھی۔ شروع دنوں کی طرح تم مجھ سے بچتی، چھپتی، کتراتی پھرو گی اور میں تمہیں، بچنے، چھپنے اور کترانے کی ذرا سی چھوٹ، ذرا سی مہلت بھی نہیں دوں گا۔ بس آخری بار میرا یہ انداز برداشت کر لو عینی ڈارلنگ''۔

''عاصم سے تو تم بہت مسکرا مسکرا کر ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی تمہیں بخار چڑھ جاتا ہے۔ میں تمہارے لیے شجر ممنوعہ بن جاتا ہوں۔ تمہیں ہنسنا، بولنا، مسکرانا، فرمانا سب بھول جاتا ہے۔'' علی نے اپنی مسکراہٹ دبا کر نہایت سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں کہا اور جو بے ہوش ہونے کو تھی کانپتی آواز سے بولی:

''اپنی اپنی شخصیت کی بات ہوتی ہے، اب ہر جذبہ ہر کسی کے لیے تو نہیں ہوتا۔ دل ہر کسی کے سامنے کھول کر تو رکھا نہیں جا سکتا۔''

''اوہ! تو طنز فرمایا جا رہا ہے، میری شخصیت کے مقابلے میں عاصم کی شخصیت کو پر کشش اور سحر انگیز قرار دیا جا رہا ہے، ایسا ہی سحر ہے اس کی شخصیت میں تو اسی کے ساتھ چلی گئی ہوتیں، میرے ساتھ آنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''ان کے ساتھ نہ جانے کی وجہ میں آپ کو بتا چکی ہوں۔ وہ بھائی ہیں میرے اور بھائی اپنی بہن کو اس کے گھر میں آباد دیکھ کر ہی خوش ہوتے ہیں۔ آپ کو تو رشتوں کی حقیقت سے، سچائی سے نظریں چرانے کی عادت ہے مسٹر علی...... لیکن میں منہ بولے رشتے بھی نبھانے کی قائل ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ اپنے دل و دماغ سے عاصم بھائی کے متعلق شکوک وشبہات کو نکال ہی دیں تو اچھا ہے۔'' عینی نے غصے میں آ کر بلند آواز میں کہا۔

''اچھا ورنہ کیا ہوگا؟'' وہ ہنس کر بولا۔ ''کیا کرو گی تم؟''

''کرنے کی طاقت تو آپ کو حاصل ہے۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولی تو وہ اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اس نے بے بسی اور تاسف سے اسے دیکھا اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنے آنسو پونچھ لیے۔ گاڑی میں کافی دیر خاموشی چھائی رہی۔

''آئس کریم کھاؤ گی۔'' علی نے اس سے پوچھا اور اس کی جانب سے کوئی جواب نہ پا کر اس کی طرف دیکھا، وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کی گردن بائیں جانب کو جھکی ہوئی تھی۔ علی نے گھبرا کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''عینی! عینی! ہوش میں آؤ عینی، میں تو مذاق کر رہا تھا، چھیڑ رہا تھا تمہیں، پلیز آنکھیں کھولو۔'' علی اسے بے قراری سے پکار رہا تھا، مگر وہ تو بے خبر بے ہوش تھی۔ علی نے گاڑی کا رخ ہاسپٹل کی جانب موڑ لیا۔

وہ ڈاکٹر ہما کے کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر ہما عینی کا چیک اپ کرنے کے بعد کمرے میں آئیں تو اس نے بے چینی و بے تابی سے پوچھا: ''ڈاکٹر ہما، کیا عینی کو ہوش آ گیا، کیسی ہے وہ؟''

''وہ اب ٹھیک ہیں، ہوش میں آ گئی ہیں۔ آپ گھبرائیے نہیں۔'' ڈاکٹر ہما نے میز پر رکھی فائل کھولتے ہوئے بتایا تو اس کی فکر قدرے کم ہوئی۔

''ڈاکٹر ہما، اسے کیا ہوا ہے وہ بے ہوش کیوں ہو گئی تھی؟''

''مسٹر علی! وہ بہت خوفزدہ ہیں اور میرے خیال میں پچھلے حادثے کا خوف ابھی تک ان کے دل و دماغ پر حاوی ہے۔ ان کی مما بتا رہی تھیں کہ وہ دو تین بار رات کو سوتے میں ڈر کر اٹھ بھی گئی ہیں۔ مسٹر علی! آپ ان کا یہ خوف دور کریں۔ وہ ہر بات دل پر لے لیتی ہیں۔ بہت حساس ہیں، اور آپ جانتے ہوں گے کہ وہ اب کس بات سے خوفزدہ ہیں، یہ دونوں حالتیں ان کی صحت کے لیے اچھی نہیں ہیں۔ پہلے تو سنبھل گئی تھیں، اب اگر ایسی حالت میں بھی وہ خوفزدہ اور سہمی ہوئی رہیں تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ ان کی زندگی کی سلامتی۔ آپ انہیں خوش رکھا کریں، ان کے دل سے خوف مٹانے کی کوشش کریں اور یہ ان کی میڈیکل رپورٹس لیتے جائیں۔ جو آج شام ان کی مما کو میں نے دینی تھیں۔ اتفاق سے آپ آ گئے ہیں تو آپ ہی لیتے جایئے۔ میں مسز یاسین کو فون کر کے بتا دوں گی۔'' ڈاکٹر ہما نے عینی کی میڈیکل رپورٹس دیں۔

''یہ میڈیکل رپورٹس ہیں؟ کیا ہوا ہے عینی کو، کوئی خطرے والی بات تو

نہیں؟"

"خوف کے علاوہ انہیں کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ آپ کے لیے اس بار خوشی کی خبر ہے"۔ ڈاکٹر ہما نے مسکراتے ہوئے بتایا تو اس نے حیران پریشان لہجے میں پوچھا:

"خوشی کی خبر! کیا مطلب ڈاکٹر؟"

"آپ کو بہت بہت مبارک ہو مسٹر علی، آپ کی مسز ماں بننے والی ہیں"۔

"کک کیا......عینی...... ماں بننے والی ہے۔ آپ سچ کہہ رہی ہیں نا ڈاکٹر ہما! عینی کی طبیعت کیا اس وجہ سے خراب رہتی ہے آج کل، کوئی اور بات تو نہیں ہے نا؟"

علی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا، حیرت، خوشی اور بے یقینی کے عالم میں پوچھا۔

"مسٹر علی، آپ کو یقین کیوں نہیں آرہا، آپ کی مسز کی طبیعت اسی وجہ سے آج کل خراب رہتی ہے، مگر اس وقت وہ خوف اور صدمے کے سبب بے ہوش ہوئی تھیں۔ تیسری کوئی وجہ نہیں ہے۔ آپ کو یہ رپورٹس دیکھ کر میری باتوں پر یقین آجائے گا۔" ڈاکٹر ہما نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شکر ہے پروردگار! تو نے اپنی رحمت سے مجھ گنہگار کو محروم نہیں کیا، میں کس طرح تیری نعمتوں کا شکر ادا کروں؟" علی نے پرسکون اور تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

"عینی کو خوش رکھ کر اس کی صحت کا خیال رکھ کر۔" ڈاکٹر ہما نے اس کی بات سن کر کہا۔

"ڈاکٹر ہما! کیا میں عینی سے مل سکتا ہوں؟" علی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی ضرور، بلکہ آپ انہیں اپنے ساتھ گھر لے جائیں اور انہیں جوس، دودھ، پھل وغیرہ زیادہ سے زیادہ کھلائیں پلائیں وہ تو انکار کریں گی ہی کھانے پینے سے، مگر آپ کو خود ان کی صحت کا خیال رکھنا ہے۔ ابھی بھی لگتا ہے کہ انہوں نے ٹھیک سے ناشتہ تک نہیں کیا۔ اور ہاں ان کا چیک اپ باقاعدگی سے کرواتے رہیے گا۔

ڈاکٹر ہما نے سنجیدگی سے اسے ہدایات دیتے ہوئے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا: "اب تو آپ ہماری فیملی ڈاکٹر بننے والی ہیں۔ عاصم کے رشتے سے ہماری بھابھی ان شاء اللہ عینی کا چیک اپ اور علاج آپ ہی سے کراؤں گا۔"

"میں عینی کو لاتی ہوں۔" وہ شرما کر ہنس دیں اور عینی کو لینے چلی گئیں۔

علی خوشی سے بے قابو ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ عینی کو اپنی محبت بھری بانہوں میں سمیٹ کر اسے یہ خوشخبری سنائے۔ وہ کتنی حیران ہوگی اور پھر شرمائے گی۔ وہ اسے پیار سے چھیڑے گا، ستائے گا، کتنا مزہ آئے گا۔ وہ خوشی سے سوچ رہا تھا۔ اتنے میں ڈاکٹر ہما عینی کو لے کر آگئیں۔ علی کو دیکھتے ہی عینی کا دل پھر سے خوفزدہ ہو کر دھڑکنے لگا، جبکہ علی اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"ڈاکٹر ہما، آپ نے عینی کو بتا دیا کیا؟" علی نے ڈاکٹر ہما سے پوچھا۔

"جی نہیں۔" وہ مسکرائیں۔

"اچھا کیا۔ میں خود انہیں بتانا چاہتا ہوں۔ آؤ عینی گھر چلیں۔"

علی نے عینی کی کمر پر ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں کہا، وہ حیرت سے اسے دیکھے جارہی تھی۔ اس کے اس انداز اور لہجے کی نرمی اسے بے یقینی میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ ڈاکٹر ہما کا شکریہ ادا کر کے باہر گاڑی میں آبیٹھے۔ علی نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ راستے میں اس نے بیکری سے بہت عمدہ کیک خریدا۔ پھل، جوس، دودھ کے پیک اور نہ جانے کیا کچھ خرید لیا اور گاڑی کی پچھلی سیٹوں پر رکھ کر اس نے پھولوں کی دکان سے سرخ گلابوں کا ایک گلدستہ خرید لیا عینی اس کی خریداری سے بے نیاز بیٹھی، کھڑکی سے باہر تکتی رہی تھی۔ جونہی گھر کے قریب گاڑی رکی تو جیسے اسے ہوش آگیا۔ خوف اور خطرے کی گھنٹیاں اس کے دل و دماغ میں بجنے لگیں۔ علی نے اس کی جانب آکر دروازہ کھولا تو وہ بڑی مشکل سے قدم باہر رکھ سکی۔ ٹانگوں میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ علی نے فلیٹ کا لاک اور دروازہ کھول دیا۔

"تم اندر چلو، میں گاڑی لاک کر کے آتا ہوں۔" علی نے اس سے کہا تو وہ گم صم سی اندر چلی گئی۔ لاؤنج میں پہنچتے ہی اسے وہ تلخ اور روح فرسا لمحے یاد آنے لگے

جب علی نے اس کے پاکیزہ کردار پر شک کیا تھا، اس کے جسم کو زخموں سے بھر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں گرم پانیوں سے بھر گئیں۔

''تو کیا آج پھر میرے ساتھ وہی کچھ ہونے والا ہے؟'' اس نے خوفزدہ ہو کر سوچا۔

''ہر چیز تو صاف ستھری ہے، چمک رہی ہے۔ ائیر فریشنر کی خوشبو بھی فضا میں رچی ہوئی ہے تو علی کیوں کہہ رہے تھے کہ ہر چیز پر گرد جمی ہوئی ہے۔'' اس نے چاروں جانب نظریں دوڑاتے ہوئے دل میں سوچا۔ اسی وقت علی تمام چیزوں کے لفافے اٹھائے لاؤنج میں داخل ہوا تو اسے یوں کھڑا دیکھ کر ٹھٹک گیا لیکن دوسرے لمحے ہی میں سمجھ گیا کہ اسے کیا یاد آ رہا ہے؟ اس نے شرمندگی سے اس کے چہرے کو دیکھا اور پھر سامان میز پر رکھ کر اس کے قریب آیا تو وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔

''تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟'' علی نے نرمی سے کہا۔ ''اندر کمرے میں چلو۔''

''میں کمرے میں نہیں جاؤں گی۔ آپ نے مجھ سے جو کچھ کہنا ہے اور میرے ساتھ جو بھی کچھ کرنا ہے، پہلے کی طرح یہیں کر لیں۔'' اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ علی جہاں شرمندہ ہوا، وہاں اسے اس پر ٹوٹ کر پیار آیا، اپنے آپ پر ٹوٹ کر غصہ آیا۔

''آج میں نے تم سے جو کچھ کہنا ہے اور تمہارے ساتھ جو بھی کچھ کرنا ہے، وہ یہاں نہیں بیڈروم میں کہنا اور کرنا ہے۔ چلو اچھی لڑکیاں اور اچھی بیوی اپنے شوہر کی بات مانا کرتی ہے۔ اس تمام تر تلخ اور تکلیف دہ مرحلے کو سہنے کے باوجود میرے ساتھ چلی آئی ہو تو بیڈروم تک جانے میں کیا عذر یا قباحت ہے؟ چلو شاباش۔''

علی نے بہت رسان سے کہا تو وہ حیرت سے اسے دیکھتی، دل میں آیت الکرسی کا ورد کرتی بیڈروم میں آ گئی۔ علی بھی اس کے ساتھ ہی بیڈروم میں داخل ہوا اور دروازہ بند کر کے لاک بھی کر دیا۔ عینی کے تو پیروں تلے سے ایک بار پھر زمین کھسک گئی۔ وہ پوری جان سے لرز گئی۔ وہ دروازہ اندر سے لاک کر کے اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہے؟ اس بند کمرے میں تو اس کی چیخیں بھی دب کر رہ جائیں گی۔

اس نے خوف سے سوچا۔

''عینی! تم کھڑی کیوں ہو، بیٹھ جاؤ'' علی نے دروازہ لاک کرنے کے بعد مڑ کر اسے دیکھا تو نرمی سے بولا۔ وہ سفید ہو رہی تھی۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔

''آ...... آپ مجھے یہاں...... کیوں لائے ہیں؟'' اس نے خوفزدہ اور گھبرائی آواز میں پوچھا۔

''یہ میرا ہی نہیں تمہارا گھر بھی ہے اس لیے میں تمہیں یہاں لایا ہوں اور کہاں لے جاتا؟''

''تو...... دروازہ کیوں لاک کیا ہے...... آپ کک...... کیا کرنا چاہ رہے ہیں میرے ساتھ؟''

''پیار کرنا چاہ رہا ہوں۔'' وہ شوخ اور شریر لہجے میں بولا اور اس کی طرف بڑھا تو وہ خوف سے چیخ کر پیچھے ہٹی اور وارڈروب سے جا لگی۔ آنسو بہنے لگے، علی اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ آگے بڑھا اور اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے بولا۔

''عینی! کیوں ڈر رہی ہو مجھ سے میں شوہر ہوں تمہارا۔''

''نہیں آپ مجھے...... ماریں گے...... میں نے کچھ نہیں کیا...... کچھ نہیں کیا...... میرا کسی سے...... کوئی تعلق...... نہیں رہا...... آپ سے...... بے وفائی نہیں کی میں نے...... وہ سب بھی...... اتفاق تھا...... آپ کو...... دھوکا...... نہیں دیا تھا۔ میں نے...... پلیز مجھے چھوڑ...... دیں...... مم میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں غلط نہیں ہو...... جھوٹ نہیں...... بولتی میں۔''

علی شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اپنی ہی نظروں میں گر گیا۔ اس کی یہ حالت اس کے لیے سوہان روح بن گئی۔ اس نے اسے کس قدر خوفزدہ کر دیا تھا۔ خود سے اپنے ظلم سے کتنا ظالم تھا وہ۔

''عینی میری جان!'' علی نے اسے کھینچ کر اپنے سینے میں چھپا لیا۔ وہ ایک بار خوف سے چیخی اور پھر علی کی محبتوں کے حصار میں خود کو محسوس کرتے ہوئے ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

"عینی! مجھے معاف کر دو...... مجھے یقین آ گیا تھا کہ تم بے قصور ہو، معصوم ہو۔ میں بہت شرمندہ تھا۔ معافی کیسے مانگتا تم سے...... میرے بس میں ہوتا تو میں اپنے لگائے ہوئے زخموں پر اپنے لبوں سے محبت اور مسیحائی کا مرہم رکھ دیتا، لیکن میں اپنا اعتبار کھو چکا تھا تمہاری نظروں میں...... کیسے کرتا یہ سب؟" علی نے بھیگتے لہجے میں کہا۔ عینی بس روئے چلی جا رہی تھی۔

"میں بھی کتنا ظالم ہوں اپنی محبوب ترین، عزیز ترین ہستی کو خود اپنے ہی ہاتھوں تکلیف پہنچا بیٹھا۔ تمہاری یہ حالت میری وجہ سے ہوئی عینی! میں خود کو...... کبھی بھی معاف نہیں کر سکوں گا۔"

وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ عینی کو اس کی آواز میں آنسوؤں کی جھنکار محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے روتے ہوئے اپنا سر اٹھا کر اس کے چہرے کو دیکھا، اس کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ دیکھ کر وہ تڑپ تڑپ کر رو دی اور علی نے اسے جدائی اور دوری کے اس تمام عرصے میں اپنے دل و جان پہ بیتنے والی ہر ہر کیفیت سے اسے آگاہ کر دیا۔

وہ حیرت اور خوشی کے ملے جلے احساسات میں گھری، اسے دیکھ رہی تھی۔ یقین اور بے یقینی کے عالم میں تھی وہ۔ اس کے لیے وہ اتنی شدتوں سے تڑپنے لگا، اسے اندازہ نہیں تھا، وہ گم صم مجسمہ حیرت بنی اسے دیکھتی جا رہی تھی۔

"میں شکرانے کی نماز ادا کر لوں، پھر اطمینان سے بات ہوگی۔ تم لیٹ جاؤ آرام کرو۔" علی نے اس کے آنسو صاف کیے، اس کے رخسار پر تھپکی دے کر کہا اور خود واش روم میں چلا گیا۔ وہ حیرت سے بت بنی بیڈ کے کنارے پر بیٹھی رہی۔ اس کا پورا وجود گرم ہو رہا تھا۔ علی کی محبت اور قربت کی گرمی تھی یہ، اور وہ خوشی، حیرت، حقیقت اور خواب میں فرق نہیں کر پا رہی تھی۔ علی وضو کر کے آیا تو اسے دیکھ کر مسکرا دیا اور وہیں کمرے میں جائے نماز بچھا کر نماز شکرانہ ادا کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو عینی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اسے پورا یقین تھا کہ فون مما یا پپا کا ہو گا۔ گھنٹی بج رہی تھی۔ وہ ڈرتے ڈرتے اٹھی اور دروازے کی چٹخنی

آہستہ سے نیچے اتار دی۔ لاک کھول کر لاؤنج میں آ گئی اور ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو!"

"ہیلو، عینی بیٹا میں تمہارا پپا بات کر رہا ہوں۔" دوسری جانب سے واقعی یاسین بیگ بول رہے تھے۔

"السلام علیکم پپا۔"

"وعلیکم السلام بیٹا، خیریت سے گھر پہنچ گئی ہو نا؟"

"جی پپا، میں خیریت سے پہنچ گئی ہوں۔"

"شکر ہے بیٹا، عینی مجھے اور اپنی مما کو معاف کر دینا۔ ہم نے تمہیں ایک غلط مطالبے، غلط سوچ کی وجہ سے کئی دن تک ڈسٹرب رکھا۔ بیٹا اب تم علی کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کرنا، ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں اور ہم تمہیں بہت جلد علی کی دعوت ولیمہ میں اس کی دلہن کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اب تمہیں علی کے ساتھ ہی جینا مرنا ہے۔ میں اور تمہاری مما تمہاری خوشیوں کے لیے دعا گو رہیں گے بیٹا"۔

"تھینک یو بیٹا! اینڈ آئی لو یو پپا، آئی لو یو بوتھ آف یو۔" عینی نے خوش ہو کر دل سے کہا۔

"آئی لو یو مائی بے بی!" وہ محبت سے بولے "اور ہاں بیٹا، بہت بہت مبارک ہو تمہیں، ابھی تمہاری پرنسپل صاحبہ کا فون آیا تھا۔ تم نے پورے کالج میں پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔"

"سچ پپا!" وہ خوشی سے بولی۔

"جی پپا کی جان!" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے اور تمہاری مما کو فخر ہے تم پر ماشاءاللہ بہت ذہین اور ہونہار بیٹی ہو تم ہماری۔ یہ بتاؤ کہ انعام میں کیا لو گی؟"

"آپ کی دعائیں۔"

"جیتی رہو، عینی بیٹی، اللہ تعالیٰ تمہیں ہمیشہ خوش و خرم رکھے، آباد رکھے۔ ہر

...سے تمہارا دامن بھر دے۔ اب تمہیں کوئی دکھ، کوئی پریشانی، کوئی تکلیف نہ ...۔" یاسین بیگ نے خوشی سے کانپتی آواز میں اسے دل کی گہرائیوں سے دعا ...۔

"اور تھینک یو پپا! آپ نے تو اتنی ڈھیر ساری دعائیں دے دیں مجھے۔" عینی نے خوشی اور تشکر بھرے لہجے میں کہا۔ "بس آپ کی دعائیں ہی میرا انعام ہیں، مما کی دعائیں اور محبتیں ہی میرا تحفہ ہیں۔"

"اور کار کا تحفہ نہیں لو گی کیا؟" انہیں اس کی فرمائش یاد تھی، مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں پپا اب نہیں، اب تو صرف آپ دونوں کی دعائیں لوں گی۔"

"اللہ تمہیں خوش رکھے بیٹا! انشاء اللہ! ہم دونوں ایک دو روز میں تمہاری طرف آئیں گے۔ اپنا بہت خیال رکھنا اور علی کا بھی۔ بہت چاہتا ہے وہ تمہیں اور بہت نیک شخص ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ تم اس کے ساتھ تاحیات خوش رہو گی۔ مجبوراً اور جلد بازی میں ہی سہی، مگر قدرت نے ہم سے تمہارے لیے ایک اچھے اور وفادار ساتھی کا انتخاب کرایا تھا جس کی ہمیں بہت خوشی ہے۔ رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں، اس بات پر بھی ہمیں یقین آ گیا ہے۔ اچھا بیٹا اپنا خیال رکھنا، اللہ حافظ۔" یاسین بیگ نے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔

عینی نے بھی انہیں اللہ حافظ کہہ کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ خوشی سے اس کے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ علی عین سامنے کھڑا اس کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پھر سے ڈر گئی۔

دروازہ کیوں کھولا اور فون ......" علی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ اب اسے مزید خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"پپا کا فون تھا۔" اس نے سہمے ہوئے انداز میں فوراً بتا دیا۔ اسے اس انداز پر بے اختیار پیار آیا، مگر مزاق سے سنجیدہ لہجے میں بولا:

"یہ تم کیا ہر وقت پپا پپا کی رٹ لگائے رکھتی ہو۔ میں مر گیا ہوں کیا؟"

"اللہ نہ کرے۔" اس نے بے اختیار تڑپ کر کہا تو وہ مسکراتا ہوا اس کے قدموں میں بیٹھ گیا اور اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ وہ ہڑبڑا کر بولی:

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں، پلیز اٹھیے یہاں سے اور اوپر بیٹھیے"۔

"نہیں عینی! مجھے اپنے قدموں میں ہی بیٹھا رہنے دو۔ تم تو دیوی ہو پوجے جانے کے لائق اور میں ...... میں بہت گناہ گار ہوں۔ تم نے میرا ہر ظلم، ہر ستم چپ چاپ سہہ لیا۔ کسی کے سامنے مجھے شرمندہ نہیں ہونے دیا۔ موت کو اتنے قریب سے دیکھنے کے باوجود تم نے مجھے سب کی نظروں میں معتبر بنائے رکھا۔ عینی! میں تم پر مسلسل طنز کرتا رہا۔ تم نے پھر بھی برداشت کرلیا۔ میں تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف کام کرنے پر مجبور کرتا رہا، تم پر شک کرتا رہا، تم نے تب بھی مجھے نہیں ٹھکرایا۔ عینی...... عینی! تمہارا دل نہیں چاہا یہاں سے بھاگ جانے کو، مجھ سے تمہیں نفرت محسوس نہیں ہوئی۔ کیسی محبت تھی تمہاری جو اتنے بڑے اور گہرے زخم اپنے دل و روح پر اپنے جسم پر سہہ کر بھی مجھے بچاتی رہی، چاہتی رہی۔ وہ وقتی غصہ تھا، شک تھا۔ مجھے عاصم نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ مجھے خود بھی تمہاری محبت کی سچائی پر یقین آ گیا تھا۔ عینی، کیوں کرتی ہو تم مجھ سے اتنی شدید محبت؟ کیا میں اب بھی تمہاری محبت کے لائق ہوں؟" علی نے بہت آہستگی سے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔

"کیوں اب کیا ہوا ہے آپ کو؟" عینی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

"عینی! میں تمہارا مجرم ہوں تم سزا دو مجھے۔ میرے یہ ہاتھ کاٹ دو جو تم پر بہت بے رحمی سے اٹھے تھے۔ میری زبان گدی سے کھینچ لو جس نے تمہارے پاکیزہ کردار پر تہمت دھری تھی، ناپاک الزامات عائد کیے تھے۔ میری آنکھوں کو......"

"علی پلیز۔" عینی نے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "مت کیجیے ایسی باتیں، آپ کا کیا قصور ہے۔ مرد کے مزاج میں شک نہ ہو، یہ ناممکن ہے کچھ غلطی پپا کی بھی تھی۔ آپ سے انہوں نے جو کچھ کہا، آپ نے جو کچھ سنا، اور دیکھا تھا، اس کے بعد آپ کا ردعمل ویسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ مجھے جانا ہی نہیں چاہیے تھا، پپا کے گھر، مگر شاید وہ سب ہونا تھا، ہو گیا۔ آپ خود کو کیوں قصوروار سمجھتے ہیں؟"

''عینی!'' علی کو اس کی وسعت قلبی کے سامنے اپنا آپ حقیر محسوس ہوا۔ اس نے اس کے گھٹنے پر اپنا سر رکھ دیا اور مدھم لہجے میں گویا ہوا۔ ''عینی! اس روز جو کچھ تمہارے اور میرے درمیان ہو چکا تھا، جتنے قریب ہم آ چکے تھے، اس کے بعد وہ سب سننا اور دیکھنا میرے لیے ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ میں تو تمہیں پیار میں ستاتا رہا تھا۔ تم مجھ سے خوفزدہ ہو کر بہت اچھی لگتی تھیں۔ اس لیے بھی میں تمہیں رعب دار لہجے میں مخاطب کرتا تھا۔ یقین کرو عینی! میں تمہارا برا کبھی نہیں چاہ سکتا۔ میں تم سے بے پناہ محبت کرتا ہوں اور میں نے تو عمر بھر کی زندگی کی ساری محبتیں سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں اور دھیرے دھیرے تم پر نچھاور کر رہا تھا۔ مجھے بہت شاک پہنچا تھا وہ منظر دیکھ کر اور یہ سوچ کر کہ تم میری محبت میں نہیں بلکہ عاصم سے ملنے کی چاہ میں وہ سب کچھ کر رہی تھیں۔ میں نے تمہیں کس قدر ٹوٹ کر چاہا ہے تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے عینی! تمہارے آنے سے تو مجھے زندگی کا احساس ہونے لگا تھا۔ جب انسان کسی کو بے پناہ چاہنے لگتا ہے نا تو وہ اس کا جھکاؤ کسی دوسرے کی جانب اور کسی دوسرے کا جھکاؤ اس کی جانب ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ برداشت نہیں کر سکتا۔ بس یہی سب کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔ تم میری محبت کا مذاق اڑا دیا کسی اور کو چاہو، مجھ سے بے وفائی کرو گی تو میں اپنے بے ریا جذبوں کی توہین پر ویسا ہی شکی اور ظالم بنوں گا ناں، مگر میں نے بھی تو حد کر دی تھی سارا کھیل تمہارے پپا نے خراب کیا تھا، تمہیں تو ناحق سزا ملی ہے۔''

''چلیے جانے دیجیے، جو ہوا سو ہوا۔ آپ اٹھیے یہاں سے محبت کا مقام قدموں میں نہیں ہوتا، محبت کا مقام تو دل میں ہوتا ہے علی۔'' عینی نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے دھیمے پن سے محبت سے کہا۔

''تم نے مجھے معاف کر دیا؟'' اس نے اس کے گھٹنے سے سر اٹھا کر اس کے چہرے کو دیکھا۔

''آپ نے کیا کیا ہے جو معافی مانگ رہے ہیں؟'' وہ اسے شرمندہ نہیں دیکھ سکتی تھی، مسکرا کر بولی۔ علی نے محبت اور ندامت سے لبریز لہجے میں کہا۔

''عینی، عینی! تم کتنے بڑے دل کی مالک ہو، کتنا اعلیٰ ظرف رکھتی ہو، قسم سے میں تو اپنی ہی نظروں میں گر گیا ہوں۔ پلیز عینی ایک بار کہہ دو کہ تم نے مجھے معاف کیا۔''

''کیا آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے؟'' اس نے الٹا سوال کیا۔

''ارے تم نے کیا کیا ہے عینی! کیسی معافی؟''

''تو آپ نے کیا کیا ہے علی، کیسی معافی؟'' عینی نے مسکراتے ہوئے اسی کے انداز میں کہا تو اسے ہنسی آ گئی۔

''مجھے بھوک لگ رہی ہے، فریج میں کچھ ہے کھانے کے لیے؟'' عینی نے پوچھا۔

''فریج میں بھی رکھا ہے اور یہ میز بھی بھری پڑی ہے۔ بہت کچھ کھانے کے لیے ہے..... مار کے علاوہ۔'' علی نے اٹھ کر کہا تو وہ مسکرا دی۔

''تم منہ ہاتھ دھو آؤ، اتنی دیر میں یہ سب چیزیں میں میز پر سجاتا ہوں۔'' وہ منہ ہاتھ دھو کر واپس آئی تو میز پر کھانے پینے کی بہت سی اشیاء پلیٹوں میں سجی ہوئی تھیں اور ایک بڑا سا کیک بھی درمیان میں رکھا تھا۔ چھری، کانٹے، چمچ اور پلیٹیں بھی موجود تھیں۔

''علی، یہ اتنی بہت سی چیزیں کس لیے ہیں؟'' عینی نے حیران ہو کر اس سے پوچھا۔

''کھانے کے لیے ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا ''تمہیں بھوک بھی تو لگ رہی تھی ناں۔''

''اب اتنی بھی نہیں لگ رہی تھی۔'' اس نے دھیرے سے ہنس کر کہا۔ ''آپ نے تو پوری بیکری میز پر منتقل کر دی ہے۔ میز بھی چھوٹی پڑ گئی ہے۔''

''اچھا آؤ کیک کاٹو۔'' علی نے ہنس کر کہا اور اسے شانوں سے پکڑ کر صو... پر بٹھا دیا۔ خود بھی اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

''یہ کیک کس خوشی میں لائے ہیں آپ۔ آج نہ تو آپ کی سالگرہ ہے اور نہ...

میرا جنم دن ہے؟'' عینی نے اس کے دلکش چہرے پر پھیلے سکون و اطمینان کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ کیک تمہارے اس گھر میں واپس آنے، امتحان میں پاس ہونے اور......'' وہ شوخی سے اسے دیکھتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ کر مسکرا دیا۔

''اور کیا؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''اور آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں پاس ہو گئی ہوں، کس نے بتایا آپ کو؟''

''تمہیں کس نے بتایا؟''

''ابھی پپا نے فون پر بتایا تھا۔'' اس نے صاف گوئی سے بتایا۔

''یار ایک تو تمہارے پپا نے میرا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔ ہر بات، ہر خوشخبری، ہر فیصلہ خود ہی سنا دیتے ہیں۔ میں تو تمہیں سرپرائز دینا چاہ رہا تھا۔ بیچ میں پھر تمہارے پپا آن ٹپکے۔'' وہ منہ بسور کر بولا۔

''اب ایسے تو نہ کہیں، آخر کو وہ میرے پپا ہیں۔'' وہ خفگی سے بولی۔

''مانا کہ وہ تمہارے پپا ہیں، اور ان کی غلطی کی بدولت ہی تم مجھے ملی ہو، مگر یار! میں اپنے اور تمہارے درمیان ایسے لمحوں میں صرف اپنی اور تمہاری بات کرنا چاہتا ہوں۔ غلطی، گستاخی، معاف کردو اور کیک کاٹو۔''

علی نے پیار بھرے لہجے میں کہا تو اس نے خاموشی سے کیک کاٹا اور ایک کیک پیس پلیٹ میں رکھ کر اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ علی نے گاڑی کی چابی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

''یہ لو یہ تمہارا انعام ہے امتحان میں اول پوزیشن حاصل کرنے کا انعام۔ یہ گاڑی میں نے تمہارے نام سے خریدی ہے، اب تمہاری ہے۔''

''علی یہ گاڑی کیوں خریدی آپ نے، میں نے تو آپ کو طعنہ نہیں دیا تھا بائیک کا۔'' اس نے چابی لے کر رکھتے ہوئے روہانسی ہو کر کہا۔

''مگر میں تو تمہیں وہ تمام سہولتیں اور آسائشیں مہیا کرنا چاہتا ہوں جو تمہیں تمہارے پپا کے گھر میں میسر تھیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں موٹر بائیک پر بیٹھنے سے

ڈر لگتا ہے، مگر تم نے میری خاطر اس ڈر کو بھی قبول کیا تھا۔ میں بہت محنت کروں گا اور ان شاء اللہ ہم بہت جلد اپنا بنگلہ خرید لیں گے۔ میں تم سے کوئی کام نہیں کراؤں گا۔ کوکنگ بھی نہیں، حالانکہ تمہارے ہاتھ میں بہت لذت، بہت ذائقہ ہے۔ اور میں نے تو اس روز سے چائے ہی نہیں پی۔ تمہارے ہاتھ کی بنی چائے پینے کو دل چاہتا تھا مگر...... خیر یہ گاڑی میری محبت کا تحفہ سمجھ کر قبول کر لو۔'' علی نے سنجیدگی سے کہا۔

''آپ کی موٹر بائیک کہاں ہے؟''

''بائیک میں نے بیچ دی ہے۔ کچھ رقم جمع کر رکھی تھی۔ اس سے یہ گاڑی خرید لی ہے۔ شادی پر بھی تمہیں کوئی ڈھنگ کا تحفہ نہیں دے سکا تھا۔'' علی نے کیک کاٹتے ہوئے کہا۔

''یہ گاڑی تو آپ نے مجھے گفٹ کر دی ہے، اب آپ آفس کیسے جایا کریں گے؟''

''گاڑی تم سے ادھار مانگ لیا کروں گا یا تم مجھے ڈراپ کر دیا کرنا۔''

''اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟'' وہ شوخی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

''تو جناب! ہم پیدل مارچ کرتے ہوئے جایا اور آیا کریں گے۔ یا کسی سے لفٹ لے لیا کریں گے۔'' علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''علی پلیز، آپ یہ واپس لے لیں، مجھے نہیں چاہیے''۔ اس نے چابی میز پر رکھ دی اور رو پڑی۔ اس کی محبت پا کر اسے خود پر قابو نہیں رہا تھا۔ سنبھل نہیں پا رہی تھی۔

''علی میں نے آپ سے کب...... کار، بنگلے، یا کیش کا مطالبہ کیا تھا۔ میں اس گھر میں خوش رہ سکتی ہوں۔ ہم دونوں کے لیے یہ گھر کافی ہے۔''

''ہاں یار، مگر ہمارے بچوں کے لیے تو یہ گھر بہت کافی نہیں ہو گا نا اس لیے ہمیں بڑا گھر پہلے ہی بنانا پڑے گا۔'' علی نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے مسکراتے لہجے میں کہا۔

''علی۔'' وہ شرما گئی۔ آنسو اُمڈے چلے آرہے تھے۔ علی نے محبت سے اسے

ساتھ لگا لیا اور مسکراتے ہوئے محبت سے بولا:

''عینی! میں نے تم سے کہا تھا نا کہ دو مہینے تو بہت زیادہ ہوتے ہیں اور کچھ ہونے کے لیے تو دو منٹ بھی بہت ہوتے ہیں۔ عینی! میری محبت، میرے جذبوں کی سچائی بن کر تمہارے خوبصورت وجود میں سرایت کر گئی تھی، اس کا ثبوت وہ ننھا وجود ہے جو میرے اور تمہارے ملاپ کا گواہ ہے۔ ڈاکٹر ہما نے بہت اچھی خبر سنائی ہے آج مجھے۔ میں پپا بننے والا ہوں۔ اب بھی یقین نہیں کرو گی میری محبت کا۔''

''علی۔'' وہ شرم سے گلاب کی طرح کھلتی چلی گئی۔

''ارے، اب تو یقین کرلو۔ میں ایک طرفہ محبت کا اظہار کرتا رہا اور معاملہ دو طرفہ بن کر سامنے آیا۔ تم تو بچتی رہتی تھیں، مجھ سے اب کیسے بچو گی؟'' وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے شرارت بھرے لہجے میں بولا۔

''میں پہلے ہی کب بچ پائی تھی۔'' اس نے حجاب آمیز لہجے میں کہا تو وہ خوشدلی سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اس کے شرم وحیا سے کھلتے چہرے پر علی نے اپنی محبتوں کے پھول بھی کھلا دیئے۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی روح کے سارے زخم بھرتے چلے گئے ہوں۔ سارے کانٹے پھول بن گئے ہوں۔ وہ بہت مسرور تھی۔

''علی آپ لندن جارہے ہیں کیا؟'' عینی کو اچانک ہی یاد آیا تو فوراً پوچھ لیا۔

''ہاں کیوں؟'' وہ اطمینان سے بولا۔

''کیا اکیلے جائیں گے؟''

''ظاہر ہے جاب مجھ اکیلے کو ہی ملی ہے۔'' وہ اس کی بے قراری سے خوش ہوتے ہوئے بولا۔

''اور میں کیا کروں گی؟''

''تم میرا انتظار کرنا۔''

''نہیں کرنا مجھے انتظار۔'' وہ خفگی سے بولی اور اٹھ کر اس سے دور چلی گئی۔ وہ مسکراتا ہوا کمرے میں گیا اور اپنا پاسپورٹ لا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور بتانے لگا:

''یہ دیکھ لو۔ میں ویزا لگوا چکا ہوں۔ کمپنی سے بات طے ہوگئی ہے اور میں انکار نہیں کرسکتا اب۔ تم میرے آنے تک اپنے پپا کے گھر رہ لینا۔ دو سال کا کانٹریکٹ ہے کمپنی سے میرا اور میں یہ چانس مس نہیں کرسکتا۔''

''تو آپ مجھے مس کردیجیے۔'' وہ بھرائی آواز میں بولی۔

''تمہیں تو میں وہاں جا کر مس کیا کروں گا۔'' وہ اس کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے بولا۔

''آپ وہاں نہیں جائیں گے۔'' اس نے بھیگتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں وہاں جاؤں گا۔'' وہ مسکرایا۔

''میں یہ پھاڑ دوں گی تو کیسے جائیں گے آپ؟'' عینی نے غصے میں آکر جذبات سے بے قابو ہو کر اس کا پاسپورٹ پھاڑ کر کارپٹ پر پھینک دیا اور رونے لگی۔

''یہ تم نے کیا کیا ہے؟'' علی نے حیرت سے پھٹے ہوئے پاسپورٹ اور پھر اسے دیکھا۔

''ٹھیک کیا ہے میں نے۔ آپ اور کتنا ظلم کریں گے مجھ پر، کتنے زخم لگائیں گے میری روح پر، کتنا تڑپائیں گے مجھے، کتنی بار میرے دل کا خون کریں گے؟'' وہ روتے ہوئے غصیلے اور بھیگتے لہجے میں پوری قوت سے بول رہی تھی اور علی اس کی محبت کی تپش دیکھ کر خوش ہورہا تھا۔ اس کے سچے اور بے لوث جذبے کی مہک میں رچ رہا تھا، اس کے پیار کی بارش میں پورا پورا بھیگ رہا تھا۔ نہال ہورہا تھا۔

''میں نے دس دن اسلام آباد میں خوار ہونے کے بعد یہ پاسپورٹ بنوایا تھا، ویزا لگوایا تھا اور تم نے اسے پھاڑنے میں دس سیکنڈ بھی نہیں لگائے ہوں گے۔''

علی نے اسے دیکھتے ہوئے سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں کہا تو وہ خوفزدہ ہوگئی۔

''اوہ...... سس...... سوری...... سوری علی۔'' اس نے روتے ڈرتے ہوئے کہا۔ کچھ نہ کرنے پر اس نے اسے تشدد کا نشانہ بنایا تھا، اب اتنا بڑا ثبوت تھا، اس کے سامنے

اس کا پاسپورٹ پھاڑ ڈالا تھا۔ اب اسے خطرہ تھا کہ وہ اسے بھی چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔ اس نے خوف سے دروازے کی طرف بھاگنا چاہا تو علی نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور کھینچ کر اپنے قریب کر لیا۔ وہ رو بھی رہی تھی، ڈر بھی رہی تھی۔

''کہاں بھاگ رہی ہو، میں کھا تو نہیں جاؤں گا تمہیں۔'' علی نے نرمی سے کہا۔

''آ..... آپ..... مجھے ماریں گے''۔ وہ روتے ہوئے معصومیت سے بولی۔

''نہیں ماروں گا عینی میں تمہیں کبھی نہیں ماروں گا۔ آخر تمہیں میرا اعتبار کیوں نہیں آتا؟'' کیوں نہیں کرتیں تم محبت کا، میری باتوں کا یقین؟'' اس نے اس کے آنسو صاف کیے۔

''مجھے یقین ہے علی..... آپ کی باتوں کا..... آپ کی محبت کا اور میں نے تو اسی وقت آپ کو معاف بھی کر دیا تھا، جب میں ہوسپٹل میں ہوش میں آئی تھی اور آپ رو رہے تھے۔ مجھے آپ سے نفرت کرنے کا ہوش کہاں تھا۔''

اس نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا تو اس کی روح شاداں ہو گئی۔

''اور تم جو میرے ہوش اڑائے دے رہی ہو، کیوں بھاگ رہی ہو مجھ سے؟ اگر اب بھی مجھ سے بھاگو گی، کتراؤ گی تو میں سچ مچ لندن چلا جاؤں گا۔''

''تو اب آپ نہیں جا رہے کیا؟'' اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''نہیں۔''

''کیوں؟'' اس نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کیونکہ تمہاری جدائی مجھے کسی قیمت پر قبول نہیں ہے۔ اگر لندن جانا بھی ہوا تا تو تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اس وقت جب ہمارا ننھا مہمان بھی ہمارے پاس آ جائے گا۔ ابھی تو میں تمہارا ردعمل دیکھنا چاہ رہا تھا۔ تم نے تو پاسپورٹ ہی پھاڑ ڈالا۔'' وہ محبت سے اسے دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولا۔

''اور جو میرا دل پھٹ جاتا۔'' اس نے پیار بھری خفگی سے اسے دیکھا۔

''کیسے پھٹ جاتا تمہارا دل؟'' علی نے اسے اپنے اندر سمیٹتے ہوئے محبت سے

کہا:

''پاگل لڑکی! میں نے تو اب تک مذاق میں ستایا ہے تمہیں۔ پیار میں تنگ کیا ہے۔ تم میں تو پیار بھرا مذاق سہنے کا بھی حوصلہ نہیں ہے اور دکھ، زخم، تکالیف، اتنی بڑی بڑی سہہ گئیں۔ عینی! اب تمہیں میری طرف سے کوئی دکھ، کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ میری ساری محبتیں تمہارے لیے ہیں۔ اب کبھی مجھ سے ڈرنا نہیں، بچنا نہیں۔''

''علی وہ..... گاڑی آپ لے لیجیے۔ میرے لیے آپ کی محبت سب سے قیمتی تحفہ ہے۔ اور آج کا دن تو..... بہت سی خوشیاں لے کر آیا ہے..... اللہ کتنا مہربان ہے۔ مجھے آپ سے ملا دیا، میں امتحان میں کامیاب ہو گئی اور.....'' وہ بولتے بولتے حیا سے مسکرا دی۔

''اور؟'' علی نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرے کو محبت سے دیکھا۔

''اور آپ کی زبردستی کی شدید قربت اور محبت نے ان لمحوں کو امر کر دیا ہے۔''

اس نے شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور مجھے یقین ہے کہ اب تم مجھے زبردستی کی قربت اور محبت کا موقع نہیں دو گی، ہے نا۔'' وہ مسکراتے ہوئے محبت سے بولا۔

''میری مرضی''۔ وہ شوخی سے مسکرائی۔

''اے مرضی کی بچی! میری مرضی کا نتیجہ دیکھ لیا ہے نا۔ اب خوشی خوشی سب کرنا ہو گا کیونکہ اب کوئی قید، کوئی پابندی، کوئی رکاوٹ، کوئی مجبوری نہیں ہے۔'' وہ محبت سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ بس شرمائے، مسکرائے جا رہی تھی۔

''کاش! عینی! اس بندھن کا آغاز ہی مستقل بنیادوں پر ہوتا۔ دو ماہ کی کوئی قید پابندی نہ ہوتی۔ تمہاری مسکراہٹ، ہنسی اور شرمیلا پن، کیا کچھ مس ہوا ہے اس عرصے میں۔''

''اب تو نہیں ہو گا کچھ بھی مس۔'' عینی نے شرماتے ہوئے کہا۔

''ہاں اب تو کچھ بھی مس نہیں ہو گا۔'' علی نے معنی خیز اور شرارتی لہجے میں کہا اور اپنی قمیض کی جیب میں سے ڈبل اے والا لاکٹ نکال کر اس کی گردن میں پہنا

دیا۔ اس نے ایک کی بجائے دو اے دیکھے اور مسکرا دی۔

"تھینک یو علی!"

"سنو" علی نے اس کے قریب ہو کر سرگوشی کی سی صدا میں کہا۔ "مجھے میری تمام تر خامیوں، خرابیوں، برائیوں اور خوبیوں، اچھائیوں سمیت قبول کر لو۔ کبھی پہلے سی شدت سے دل سے ناراض مت ہونا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ پھر کبھی تمہارے ساتھ ویسا سلوک نہیں کروں گا۔ شک اور غصہ کبھی نہیں کروں گا۔ پہلی بھول، پہلی خطا سمجھ کر دل سے معاف کر دو۔"

"آپ بار بار معافی مانگ کر مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔" اس نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"چلو میں بار بار تمہیں پیار کر کے شرمانے پر مجبور کیے دیتا ہوں۔" علی نے شوخ لہجے میں کہا اور ساتھ ہی بڑی شریر جسارت کر ڈالی۔ وہ شرما گئی۔

"عینی! لاکٹ کا یہ 'اے' اپنے لبوں سے لگاتے ہوئے مجھے مت بھول جانا۔ اب میرا حق زیادہ ہے اور حق مانگے بغیر ہی دے دینا چاہیے۔ ٹھیک کہا نا میں نے؟" علی نے لاکٹ کے اے کو پکڑ کر شرارت اور محبت سے کہا تو اس نے شرماتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے سینے سے لگ گئی۔ علی خوش ہو کر ہنس دیا اور اپنی محبتوں کی بارش میں اسے پور پور بھگونے لگا۔ اسے عینی نے اپنی محبت کا یقین دے دیا تھا اور عینی کو اس کی محبتوں پر اعتبار آ گیا تھا۔

دونوں کے دل اور روح ایک دوسرے کی محبت میں سرشار ہو گئے تھے اور آج وہ دونوں بہت خوش تھے کہ ان کے من اور آنگن دونوں ٹوٹنے سے بچ گئے تھے۔ اب وہ نئے اعتبار، نئے عزم اور یقین کے ساتھ زندگی کے نئے دن کا آغاز کر رہے تھے جس میں ان کے ہمراہ محبتوں کا ہجوم تھا۔ خوشیوں کا سائبان بھی تھا، ان کی اپنی محبتوں اور خوشیوں کا سائبان!

☆☆☆

معصومہ

کبھی ٹھٹھرنا مقدر ہے اور کبھی جلنا
یہ کس خرابہ جاں میں میرا قیام ہوا

"یہ سالن پکایا ہے رانی صاحبہ نے؟ مرچیں اتنی بھر دی ہیں کہ کوئی کھا ہی نہ سکے۔ انشاء اللہ اگلے گھر جا کر جوتے کھائے گی خود تو یہ پھوہڑ ذلیل ہو گی ہی ہمیں بھی ذلیل کرائے گی خوب نام روشن کرے گی۔ ماں باپ کا لعنت ہے ایسی اولاد پہ میں نے اس بے غیرت، بدسلیقہ اولاد کی خاطر اپنی ساری زندگی رول دی جس سے ڈھنگ سے روٹی سالن تک نہیں پکتا۔"

اماں نے کھانے کا ایک نوالہ منہ میں رکھتے ہی معصومہ کو حسب عادت اور حسب معمول کوسنا شروع کر دیا۔ معصومہ کے لیے یہ روز کا معمول تھا مگر اب تو اس کا دل دکھ سے بھر جاتا تھا۔ جب سے دونوں چھوٹی بہنیں اپنی پڑھائی مکمل کر کے گھر بیٹھی تھیں اور دوسرے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹانے لگی تھیں اماں معصومہ کے سارا گھر صاف ستھرا کرنے، کپڑے، برتن دھونے، استری کرنے اور کھانا پکانے پر اس کی تعریف کیا کرتی تھیں کہ "معصومہ تو بڑی جلدی سارا کام نمٹا لیتی ہے۔" تاہم جوں جوں معصومہ کی عمر بڑھ رہی تھی اماں کی جھڑکیاں، نفرتیں اور جلی کٹی باتیں بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔

اماں! روز اس بات پر ڈانٹتی ہیں کہ سالن میں نمک مرچ پھیکا ہے۔ سالن بدذائقہ، بدمزہ ہے اور آج میں آدھا چمچ مرچوں کا سالن میں زیادہ ڈال دیا ہے تو آسمان سر پہ اٹھا رکھا ہے۔" معصومہ نے جواب دیا۔

"ماں چاہتی ہے تم ہر کام میں ماہر دکھائی دو۔"

معصومہ سے سوا سال چھوٹی مومنہ نے کہ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔ مومنہ نے فسٹ ڈویژن میں بی اے کا امتحان پاس کیا تھا۔

"نہ گرہستی کے گن ہیں اس میں، نہ تعلیمی میدان میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل کی ہے، نہ شکل نہ صورت نجانے کس بات پر اتنی اکڑتی ہے۔" اماں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"میں نے تو کبھی ایسا نہیں سوچا کہ میں اکڑتی ہوں۔" معصومہ نے کہا تو وہ غصے سے بولیں۔

"اکڑنے والا خود تھوڑی سوچتا ہے یہ تو دوسرے محسوس کرتے ہیں دیکھتے ہیں کہ کس کی گردن میں کتنا سریا جڑا ہے۔ کتنا کلف لگا ہے اس نامراد کی شادی ہو جائے تو جان چھوٹ جائے میری۔"

اماں! تو کردیں ناں اس نامراد کی شادی۔" معصومہ سے سات سال چھوٹا ظفر مسکرا کر معصومہ کو دیکھتے ہوئے بولا تو وہ مزید طیش میں آ کر کہنے لگیں۔

کہاں سے کردوں؟ کوئی آئے بھی تو اس نامراد کو بیاہنے اس کا نور بھرا چہرہ دیکھ کے تو لوگ دور سے ہی خدا حافظ کہہ جاتے ہیں۔ نہ گن، نہ حسن ...... کس چیز کو دیکھ کے بیاہے گا کوئی اسے؟"

اماں! کبھی کبھار تو آپ سے بھی سالن بدمزہ پک جاتا ہے، پھر آپ معصومہ پہ ہی اتنا غصہ کیوں کرتی ہیں؟ جب ہر وقت تنقید ہوگی ہر کام میں کیڑے نکالیں گی۔ ہر وقت برائی کریں گی کوسنے دیں گی تو یہ رو رو کے اپنی جان دے دے گی۔"

معصومہ سے چھوٹا بدر اس کی حمایت میں بولا" تو دے دے جان اس کی جان کی پروا اور ضرورت کسے ہے یہاں نہ مجھے نہ تجھے ...... دنیا کی آبادی میں کونسی کمی

آ جائے گی اس ایک کلموہی کے مرنے سے ..... میں تو یہ سوچوں کہ اگر اللہ میاں اس نامراد کو پیدا نہ کرتے تو کونسا کام رک جاتا اس دنیا کا؟"

اماں نے غصے، نفرت اور تذلیل سے بھرپور نظروں اور لہجے کا استعمال کرتے ہوئے ایک بار پھر معصومہ کا معصوم دل چھلنی کر دیا۔ وہ کرب سے بولی۔

اماں! اللہ کی بنائی ہوئی صورتوں کو برا کہنا گناہ ہوتا ہے۔"

"ارے لو اور سنو، اری اللہ کی بنائی صورتیں ایسی ہوتی ہیں۔ اماں نے اس کی صورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

وہ تڑپ کر رہ گئی دل بھر آیا۔ آنکھیں چھلکنے کو مچلنے لگیں۔ مگر وہ ضبط وصبر سے لب بھینچے کھڑی رہی کسی مجرم کی طرح جیسے اس کے موٹے بھدے نین نقش کالی رنگت میں اسی کا سارا دوش ہو۔

"بیوی، پھر تو یہ تمہاری بنائی صورت ہے کہ اس نے تمہارے بطن سے تمہاری کوکھ سے جنم لیا ہے۔ یہ شکل یہ رنگ روپ اس کو تمہاری کوکھ سے ہی ملا ہے۔" انور علی یعنی ابا جان کی آواز سن کر دکان سے اٹھ کر صحن میں داخل ہوتے ہوئے بولے تو وہ منہ بگاڑ کر غصے سے کہنے لگیں۔

"ہاں ہاں یہ مرن جوگی، کلموہی میرے ہی کسی گناہ کا پھل ہے۔"

"یقیناً تمہارے ہی کسی گناہ کا پھل ہے تم پھر بھی نہیں سمجھتیں الٹا اس معصوم بچی کو کوسنے دیتی رہتی ہو۔ اس میں اس معصوم کا کیا قصور ہے، نہ صرف تم اس کی دل آزاری کر رہی ہو بلکہ کفر بک بک کر اپنی آخرت بھی خراب کر رہی ہو۔ توبہ کرو بیوی توبہ کرو۔ اللہ کی تخلیق میں میم میخ نکالنا خود کو اس کے لطف وکرم کے سایے سے باہر نکالنا ہے اور اس کی ناراضگی مول لے کر تم کہیں کی نہیں رہو گی دنیا اور آخرت دونوں غارت۔" انور علی نے ناصحانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میاں، تم تو اپنا واعظ اپنے منبر تک ہی رکھو میرے سامنے یہ تقریر جھاڑنے کی ضرورت نہیں۔" اماں نے تنک کر انہیں جواب دیا تو وہ تاسف سے نفی میں سر ہلاتے مسجد جانے کے لیے دروازے سے باہر نکل گئے۔

انور علی محلے کی مسجد کے پیش امام تھے۔ محلے والے انہیں مولوی صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ انور علی کا چار مرلے کا مکان تھا۔ جہاں وہ اپنی تیز مزاج بیوی اور پانچ بچوں کے ساتھ سکونت پذیر تھے۔ جن میں تین بیٹیاں معصومہ، مومنہ اور آمنہ کے علاوہ دو بیٹے مومنہ سے چھوٹا بدر اور اس سے ڈیڑھ برس چھوٹا ظفر شامل تھے۔ بدر اور ظفر کالج میں پڑھ رہے تھے۔ معصومہ نے بی اے کا امتحان پاس کیا تھا اور عمر کے 26 ویں برس میں قدم رکھ چکی تھی۔ مومنہ اور آمنہ نے پرائیویٹ بی اے اور پھر ایم اے کا امتحان پاس کیا تھا دونوں کی شکل صورت بھی اچھی تھی گھر داری بھی سیکھ لی تھی اور رنگت بھی کھلی کھلی گندمی تھی۔ اماں یعنی رقیہ انور علی کا رنگ گورا تھا مگر ان کی پہلی اولاد معصومہ ان کے برعکس کالی رنگت والی نکلی تھی۔ اماں نے جب اسے پہلی بار دیکھا تھا تو مارے صدمے کے چیخ مار کر بے ہوش ہو گئیں تھیں۔ انہیں تو یقین ہی نہ آیا کہ اس کالی کلوٹی بچی کو انہوں نے جنم دیا ہے، بچی کی پیدائش چونکہ گھر میں دائی کے ہاتھوں ہوئی تھی اس لیے انہیں اپنی اس سیاہ بختی پر یقین کرنا ہی پڑا ورنہ اگر ڈلیوری کسی ہسپتال میں ہوئی ہوتی تو اماں بچی بدل دینے کا مقدمہ کر دیتیں ہسپتال والوں کے خلاف معصومہ کا رنگ سیاہ تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی سیاہ۔ سیاہ گھنگھریالے بال اور موٹے موٹے ہونٹ تھے۔ رقیہ انور علی یعنی اماں کو تو اسے دیکھتے ہوئے بھی کراہت محسوس ہوتی تھی۔ وہ بھوک سے روتی بلکتی تو ان کا دل ہی نہ چاہتا کہ وہ اسے اپنی چھاتی سے لگا کر دودھ پلائیں یا اسے گود میں اٹھا کر پیار کریں۔ انور علی انہیں سمجھاتے کہ اری نیک بخت یہ اولاد ہے تیری اپنی اولاد سے بھی بھلا کوئی ماں نفرت کرتی ہے منہ پھیرتی ہے۔

''تو مجھے کسی حبشی کی اولاد لگتی ہے نہ ماں کا رنگ نہ باپ کا رنگ یہ تو حبشیوں کا رنگ لے کر پیدا ہوئی ہے...... خاندان والے محلے والے دیکھنے آتے ہیں تو میں شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہوں اس نے تو مجھے چور بنا دیا ہے...... کون بیاہنے آئے گا کل کو اس کلو پری کو اماں نے غصے، دکھ اور پریشانی کے عالم میں کہا تھا۔

''جس نے بیٹی دی ہے وہی بیاہنے کا بندوبست بھی کر دے گا اس نے پہلے اس

کا نصیب لکھا ہے اس کا جوڑا اوپر بنایا ہے پھر اسے اس دنیا میں بھیجا ہے اور اس کا نصیب بھی انشاء اللہ اچھا ہی ہوگا۔''

انور علی نے نرمی سے کہا مگر رقیہ بیگم پر خاص اثر نہ ہوا انہوں نے معصومہ کو اوپر کے دودھ پر پروان چڑھایا تھا۔ ان کو معصومہ پر بہت غصہ تھا اور اللہ میاں سے بھی شکایت تھی کہ پہلی اولاد تو فخر، مان اور غرور ہوتی ہے خوشی اور راحت کا باعث بنتی ہے مگر ان کے لیے تو پہلی اولاد کی خوشی جیسے مر گئی تھی ماں بننے کی اسے کوئی خوشی نہیں تھی۔ رشتے دار خواتین معصومہ کو دیکھ کر مذاق سے کہتیں۔

''ارے چاند گرہن کا اثر ہے۔ چاند سی لڑکی کو گرہن لگ گیا ہے۔''

''رقیہ کے لیے تو آسانی ہو گئی ہے بھئی اب اسے معصومہ کے نظر وٹو لگانے کی ضرورت نہیں پڑے گی ساری زندگی۔''

کوئی کہتی'' آئے رقیہ! یہ تیری بچی تو کالی سیاہ ہے تیری کوکھ سے جنم لیا ہے اس نے کہ کسی کوئلے کی کان سے پیدا ہوئی ہے؟''

پہلی اولاد تو ماں باپ کا پرتو ہووے یہ تو رات کا پرتو نکلی ہے۔'' معصومہ کی دادی نے تبصرہ کیا تو نانی بولیں۔

''اسے پیدا کرنے والے نے کچھ نہ کچھ تو سوچ کے ہی بھیجا ہوگا نہ اسے اس دنیا میں...... بس اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔''

''ارے کیا نصیب اچھے ہوں گے اس کے اس کی سیاہ بختی تو اس کے وجود سے چھلک رہی ہے آج کل تو کالے لونڈوں کو کوئی گھاس نہیں ڈالتا یہ تو پھر لڑکی ذات ہے اسے کون منہ لگائے گا؟'' دادی نے جل کر کہا تھا۔

غرض یہ کہ جتنی منہ اتنی باتیں بنائیں گئیں معصوم نومولود معصومہ کے نین نقش اور رنگت کے حوالے سے...... اس کے بعد مومنہ، آمنہ، بدر اور ظفر پیدا ہوئے سب کے رنگ صاف تھے رقیہ بیگم مطمئن ہو کر ایک دن کہنے لگیں۔

''شکر ہے میاں کہ باقی بچے صاف کھلی کھلی گندمی رنگت اور سفید رنگ لے کر پیدا ہوئے ہیں معصومہ کی طرح کالے سیاہ نہیں نکلے۔''

بیوی، ان کے وجود اور نصیب کی سیاہی کو ہماری معصومہ نے اپنے سر لے لیا ہے شکر ادا کیا کرو رب کا اور معصومہ کے ساتھ ناروا سلوک مت کیا کرو۔'' انور علی نے مسکرا کر رسانیت سے سمجھایا تو وہ سر جھٹک کر طنز سے معصومہ کو دیکھتے ہوئے مسکرا دیں۔

انور علی کے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا وسائل کم ہونے کے باوجود انہوں نے جیسے تیسے سرکاری اسکول، کالج میں انہیں پڑھایا بھی تھا۔ مسجد کی کمائی صرف عزت تھی۔ ماہانہ وظیفہ یا تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ انور علی گھر کے افراد کی کفالت کر سکتے، لوگوں کے گھروں سے نیازیں آتیں تو معصومہ ہاتھ تک نہ لگاتی۔ اس کے کہنے پر انور علی نے سات سال پہلے گھر کی بیٹھک میں جس کا دروازہ باہر گلی میں کھلتا تھا پرچون کی دکان کھول لی تھی۔ بدر اور ظفر بھی ان کی عدم موجودگی میں دکان سنبھال لیتے تھے۔ اتنی مہنگائی میں بس دال روٹی اور تن کے دو جوڑے کپڑے کے اخراجات ہی دکان کی آمدنی سے بمشکل نکل پاتے تھے۔ یہ بھی غنیمت تھا ورنہ اب محلے والوں کے ٹکڑوں پر آسرا کر کے بیٹھنے کا مطلب تو بھوکوں مرنا ہی تھا۔ ظفر اور بدر اپنی تعلیم کے اخراجات پورے کرنے کی غرض سے اخبار بیچتے تھے۔ رقیہ بیگم اور انور علی کو بیٹیوں کی شادیوں کی فکر ستائے ہوئے تھی اور رقیہ بیگم کا کہنا تھا کہ ''معصومہ کی سیاہ بختی نہ تو اسے گھر بسانے دے گی اور نہ ہی اس کی وجہ سے مومنہ اور آمنہ کو کوئی بیاہنے آئے گا۔''

معصومہ اماں رقیہ بیگم کی باتیں سنتی تو نماز میں رو رو کر رب سے اپنی بہنوں کے اچھے رشتوں کی خوشی، خوشحالی کی دعائیں مانگا کرتی اور اپنے لیے صرف اتنا مانگتی کے ''میرے اللہ میرے لیے وہ کرنا جو میرے اور میرے گھر والوں کے حق میں بہتر ہو۔''

اماں! آج کیا پکانا ہے؟ معصومہ نے ناشتے سے سب کو فارغ کر کے باورچی خانے اور گھر کی صفائی کے بعد دوپہر کے کھانے کے متعلق رقیہ بیگم سے پوچھا تو وہ غصے سے بولیں۔

میرا کلیجہ پکا لے، پوچھتی تو یا سے ہے جیسے من وسلویٰ پکا پکا کے کھلاتی رہی ہو۔'' اری نیک بخت، تیرے سامنے من وسلویٰ بھی رکھ دو اور کہہ دو کے یہ معصومہ نے تیار کیا ہے تو تجھے اس میں بھی سو سو کیڑے نظر آنے لگیں گے۔'' انور علی نے ان کی بات سن کر کہا۔

''تم تو چپ ہی رہو میاں، ہر وقت اس کلموہی کی حمایت میں بولتے رہتے ہو۔ میری تو راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں۔ یہ سوچ سوچ کر کے اس حبشن کی شادی کس طرح ہو گی اسے تو کوئی مستری، مزدور بھی بیاہنے نہیں آنے کا، کوئی جمعدار بھی اس کا ہاتھ نہیں پکڑنے کا۔'' رقیہ بیگم نے اپنے اسی مخصوص تلخ وتند لہجے میں کہا تو معصومہ کی آنکھوں میں نمی سی اترنے لگی اس نے بھیگتی آنکھوں سے آسمان کو دیکھا جیسے اللہ سے اپنے نصیب کی یاوری کی فریاد کر رہی ہو۔

''کچھ تو خدا کا خوف کرو بیوی، اپنی زبان قابو میں رکھا کرو ہر وقت زہر اگلتی ہے تمہاری یہ زبان، اپنی بیٹی کا دل چھلنی اور روح تار تار کر کے نجانے تمہیں کونسی راحت ملتی ہے۔ معصومہ کو تم نے اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا، کوڑے کے ڈھیر سے نہیں اٹھایا تھا جو اسے طعنے، کوسنے دینا اپنا حق سمجھتی ہو...... اور تمہیں اس کی شادی کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں اللہ نے چاہا تو اس کے نصیب سے ہمارے دن بھی پھر جائیں گے اور ہماری دوسری بیٹیوں کے گھر بھی آباد ہو جائیں گے۔ وہ پاک ذات بڑی کارساز ہے، مسبب الاسباب ہے وہ ضرور کوئی وسیلہ بنا دے گی میں اس کی ذات سے مایوس نہیں ہوں انشاء اللہ وہ میری بیٹی معصومہ پر اپنے کرم کی بارش کرے گا دیکھا تم۔''

انور علی نے بہت سنجیدہ، نرم مگر پرامید لہجے میں انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تو وہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ سر کو جھٹکتی دل ہی دل میں ان کی خوش امیدی وخوش فہمی پر ہنستی ہوئی وہاں سے اٹھ گئیں۔

یہ معصومہ کی معصوم فریاد کا اثر تھا، دل کی آہ والتجا کا کرشمہ تھا یا انور علی کا اپنے اللہ پر یقین، اس کی رحمت وکرم پر ایمان ہی تھا جس نے اس معصومہ کے لیے جو

حبشیوں کے سے نین نقش، رنگ و روپ کی مالک تھی۔ ماں کے لیے منحوس اور کلموہی تھی۔ اسی معصومہ کے لیے ایک وجیہہ و شکیل سیدزادے کا رشتہ آیا تھا۔

''سادات حویلی'' کا وارث سید حسنین شاہ جو کروڑوں کی جائیداد کا مالک بھی تھا۔ عالی شان حویلی میں رہائش پذیر تھا۔ ملازموں کی فوج جس کے آس پاس اس کے حکم کی منتظر رہتی تھی۔ جس کی کنیزوں کے نین نقش اور رنگ روپ معصومہ سے لاکھ درجے حسین تھے۔ اس خوبرو سید زادے کا حسن انتخاب معصومہ ٹھہری تھی۔ کیوں اس میں بھی ایک راز پوشیدہ تھا۔ البتہ انور علی اور رقیہ بیگم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اس شاندار رشتے کی آمد پر سید حسنین شاہ 35 برس کے تھے۔ وہ انور علی سے مسجد میں ملنے آئے تھے اور اپنے تعارف کے بعد اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ انور علی تو مارے حیرت و مسرت کے گنگ رہ گئے۔ سید حسنین شاہ نے ان کی دوسری دونوں بیٹیوں آمنہ اور مومنہ کی شادی کرانے اور تمام اخراجات اٹھانے کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی تھی۔ بس وہ شادی سادگی سے کرنا چاہتے تھے۔ جس میں صرف گھر کے افراد شریک ہو سکتے تھے۔ ظفر اور بدر کی تعلیم کے اخراجات اٹھانے کے علاوہ بعد میں انہیں ملازمت دلانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ گھر بھی مرمت کرا کے رنگ و روغن کرا دیا تھا۔ رقیہ بیگم بہت خوش تھیں۔ انہیں تو ابھی تک معصومہ کی قسمت پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ نئے کپڑے زیور، گھر کا قیمتی سامان کیا کچھ نہیں آ گیا تھا۔ ان کے گھر جبکہ معصومہ حیرت کے سمندر میں غوطے لگاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ ''وہ تو اپنی ماں کو ہی وہ کلموہی، نامراد، بدشکل، دکھتی ہے، جنم دینے والی ماں ہی اس سے نفرت کرتی ہے تو پھر یہ سید زادہ اسے بیاہنے کیوں آ رہا ہے؟ اور سید زادے کے لیے تو کسی سید زادی کا رشتہ ہی مناسب رہتا پھر اس کے نام یہ قرعہ فال کیوں نکلا تھا؟

اس طرح کے بہت سے سوال معصومہ کے معصوم ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ اس پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ سید حسنین شاہ پہلے سے شادی شدہ ہیں اور وہ دوسری شادی اپنی پہلی بیوی کی رضامندی سے کر رہے ہیں؟ ان کی پہلی بیوی بھی ان کے ساتھ نکاح کی تقریب میں شرکت کے لیے آئی تھیں۔ اور معصومہ کے گھر

والے اس تقریب میں موجود تھے نہایت سادہ سی تقریب تھی قبول و ایجاب کی رسم ادا ہوئی۔ مٹھائی سے سب نے منہ میٹھا کیا اور رخصتی کے وقت معصومہ کو اس کی بہنیں گلے لگا کر رو پڑیں، انور علی نے اسے سینے سے لگا کر بھیگتے لہجے میں دعا دی، وہ عروسی جوڑے میں اچھی لگ رہی تھی۔ یہ اس کی بہنوں کا خیال تھا مگر رقیہ بیگم کا کہنا تھا کہ ''توبہ ہے اس کلموہی کو تو قیمتی زیور، کپڑے بھی نہ سجا سکے، یہ تو ایسی بھی نہیں لگ رہی کہ ذرا دیر کو ہی کوئی نظر بھر کے دیکھ لے۔'' اور معصومہ کا دل پاش پاش ہو گیا تھا۔

رخصتی کے وقت معصومہ جب رقیہ بیگم کے پاس پہنچی تو دونوں ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے بولی۔

''اماں! میرا کہا سنا معاف کر دیجئے گا، میں نے بہت دل جلایا ہے نا آپ کا، آج کے بعد آپ کو میری وجہ سے کوفت نہیں ہوگی اور نہ ہی آپ کی راتوں کی نیندیں حرام ہوں گی۔''

''اچھا چپ ہو جا، روتے ہوئے اور بری لگتی ہے شکر ادا کر کہ اتنے اعلیٰ خاندان میں بیاہ کے جا رہی ہے شوہر کی قدر کرنا، اب تیرا جینا مرنا اپنے شوہر کے لیے ہے اس کے گھر سے تیرا جنازہ نکلے سمجھ رہی ہے نا میری بات۔'' رقیہ بیگم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر سپاٹ لہجے میں جواب دیا تو بدر اور ظفر نے آگے بڑھ کر اسے پکڑ کر سید حسنین شاہ کی شاندار گاڑی میں بیٹھا دیا۔

معصومہ اپنی ان دیکھی منزل کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔ انور علی نے شکرانے کے نفل ادا کیے اور رقیہ بیگم نے سید حسنین شاہ کی طرف سے آئی ہوئی مٹھائی کی ٹوکریاں سنبھالیں اور محلے بھر میں مٹھائی تقسیم کی سبھی کو معصومہ کی شادی اور رخصتی پر حیرت ہو رہی تھی۔ رقیہ بیگم نے بڑے فخر سے سب کو بتایا تھا کہ معصومہ بڑے دولت مند شخص سے بیاہی گئی ہے—— سید حسنین شاہ کی طرف سے ایک شرط لگائی گئی تھی ک معصومہ سے ملنے وہ لوگ کبھی ان کے گھر نہیں آئیں گے اور نہ ہی معصومہ ان ک ساتھ میکے آئے گی۔ بس کبھی کبھار ڈرائیور کے ساتھ میکے والوں سے ملنے آجا کرے گی۔ یہ شرط انور علی نے مان لی تھی۔ راز کیا تھا؟ اس سے کوئی بھی واقف

تھا۔معصومہ کے گھر والے تو فی الحال معصوہ کی شادی کے نتیجے میں ملنے والی سوغات
اور مراعات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔معصومہ نے تو سنا تھا کہ وہ بیاہ کر
''سادات حویلی'' جارہی ہے مگر اسے تو ایک شاندار بنگلے کے سجے ہوئے کمرے میں
پہنچادیا گیا تھا۔ ہر چیز اس کی توقع اور حیثیت سے بڑھ کر قیمتی اور نفیس تھی۔معصومہ کو
یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اتنے امیر اور اعلیٰ نسب خاندان میں بیاہ کر آئی ہے اسے یہ
سب خواب لگ رہا تھا۔آخر سید حسنین شاہ نے اس کم صورت،معمولی حیثیت کی لڑکی
کو ہی اپنی شریک حیات کے منصب کے لیے کیوں چنا تھا؟ ایسا کیا تھا اس میں جو اپنی
حویلی سے نکل کر اس کی گلی تک چل کر آئے تھے۔اس طرح کے بہت سے سوال
معصومہ کے دل ودماغ میں گردش کررہے تھے۔

حجلہ عروسی کا دروازہ کھلا تو معصوم سی معصومہ پوری جان سے لرز اٹھی۔دل کی
دھڑکنوں میں اضطراب آمیز ہلچل سی مچ گئی تھی۔ہاتھوں میں پسینہ اتر رہا تھا۔سر اور
نظر کچھ اور جھک گئی تھی۔سید حسنین شاہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے بیڈ کے
قریب آئے اور دلہن معصومہ کے روبرو بیٹھ گئے۔

السلام علیکم:

چند ساعتوں کے بعد سید حسنین شاہ کی دلکش آواز معصومہ کی سماعتوں میں پھول
ن کر کھلی تو اس نے حلق میں تھوک نگلتے ہوئے بمشکل جواب دیا۔

''وعلیکم سلام''

معصومہ آپ یقیناً حیران ہوں گی اب تک کہ میں نے ایک سید زادے نے،
اندان سے باہر ایک پیش امام کی بیٹی سے کیوں شادی کی ہے؟''

سید حسنین شاہ نے نرم اور مدھم لہجے میں بولنا شروع کیا تو اس نے سر جھکائے
وئے ہی آہستگی سے جواب دیا۔''جی''

''دراصل،ہم نے اولاد کے لیے دوسری شادی کی ہے۔''

''دوسری شادی۔''اب کی بار معصومہ نے سر ہی نہیں نظر بھی اٹھا کر انہیں
رت سے دیکھا تھا۔اسے تو کسی نے نہیں بتایا تھا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہیں اور

وہ دوسری بیوی بن کر جارہی ہے۔
''جی ہاں۔ہماری پہلی شادی کو تقریباً نو برس ہو چکے ہیں اور ہماری شریک
حیات مریم اولاد پیدا کرنے سے قاصر ہیں وہ بانجھ ہیں بہت علاج کرائے مگر کوئی
امید بر نہیں آئی......لہٰذا مریم کی اجازت اور رضامندی سے ہم نے بہت خاموشی
سے آپ سے نکاح کرلیا ہے۔ہمارے خاندان میں کسی کو مریم کے بانجھ ہونے کا علم
نہیں ہے اور نہ ہی ہم چاہتے ہیں کے کبھی کسی کے علم میں یہ بات آئے......آپ سے
ہماری شادی کا علم بھی صرف مریم کو ہے۔''
''تو سائیں،آپ نے اپنے جیسی کوئی حسین وجمیل لڑکی ڈھونڈی ہوتی مجھے
کیوں بیاہ لائے میں کہاں آپ کے قرب کے قابل ہوں،میں کب آپ کی اولاد
پیدا کرنے کے لائق ہوں؟''معصومہ نے دیگر لہجے میں کہا۔
''ہمیں یہی حکم ہوا تھا سو تعمیل کرنا پڑی غریب گھر سے بیٹی بیاہ کرلانے کا ایک
مقصد یہ بھی ہے کہ یہ بات راز ہی رہے اور معصومہ بی بی!حسن اگر اچھے نین نقش اور
سفید گلابی رنگت میں ہوتا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ہمارا رب اذان کے لیے
منتخب نہ کرتا......تم ایک مکمل انسان ہو۔مکمل عورت ہو،تم میں کوئی کمی یا عیب نہیں ہے
معصومہ بی بی!تم ہمارا وراث پیدا کروگی۔اولاد ہماری ہوگی۔ کوکھ تمہاری
ہوگی،اسے جنم تم دوگی لیکن اس کی ماں مریم کہلائے گی......تمہیں ہمارے ہاں کوئی
کمی نہیں ہوگی۔اور تم یہ کبھی کسی پر ظاہر نہیں کروگی کے تم نے ہماری اولاد کو جنم دیا
ہے۔''
سید حسنین شاہ نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے رسانیت سے کہا۔
''اور اگر میں آپ کی طرح خوبصورت اولاد پیدا نہ کرسکی تو؟''
''تم خوب سیرت ہو اور اندر سے کتنی خوبصورت ہو یہ میں بخوبی جانتا ہوں اور
اولاد کے خوبصورت ہونے میں یا نہ ہونے میں باپ کا رنگ روپ بھی بہت اہمیت
رکھتا ہے ہماری اولاد انشاءاللہ خوبصورت بھی ہوگی اور خوب سیرت بھی،تمہیں حویلی
میں مہمان خاص اور مریم کی کنیز خاص کی حیثیت سے لے جایا جائے گا مگر درحقیقت تم

مہمان خاص ہی ہو گی تمہیں ہر وہ سہولت میسر ہو گی جو مریم بی بی کو میسر ہے...... مریم بی بی میری بیوی ہی نہیں میری محبت بھی ہیں۔ اسی سبب میں انہیں چھوڑ نہیں سکتا اور نہ ہمارے ہاں بیوی کو چھوڑ دینے کی روایت ہے۔"

سید حسنین شاہ نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے اسے مزید ہدایات دیں اور ضروری باتیں سمجھائیں۔

گویا، آپ مجھے صرف اولاد پیدا کرنے کی غرض سے بیاہ کر لائے ہیں؟" معصومہ نے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں" وہ قدرے شرمندگی سے نگاہ جھکا کر بولے۔

"ٹھیک ہے سائیں، جو میرا نصیب میں نے تو ایسا کبھی سوچا بھی نہ تھا کے کوئی اعلیٰ خاندان اور حسب نسب والا شخص مجھے بیاہنے آئے گا۔ میں تو آپ کی باندی ہوں، کنیز ہوں سائیں!

معصومہ نے دکھے دل کے ساتھ ذرا سا مسکرا کر کہا۔

"تم میری بیوی ہو، تمہارے حقوق کی ادائیگی میں اگر مجھ سے کوئی کوتاہی ہو جائے تو درگزر کر دینا...... تمہیں یہاں کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہو گی، کوئی ضرورت محسوس ہو تو بلا جھجک مجھ سے کہہ دینا...... اور لاد ہو جانے کے بعد تم اپنے بچے کی آیا ماں بن کر اس کی پرورش کرو گی مگر بھولے سے اس بچے کو اپنا نہیں کہو گی وہ مریم بی بی کی اولاد کہلائے گا تم سمجھ رہی ہو نا میری بات۔"

"یہ تمہاری رونمائی ہے۔" سید حسنین شاہ نے اپنی شیروانی کی جیب میں سے دو سونے کے قیمتی کنگن نکال کر معصومہ کی کلائی میں پہنا دیئے۔

"دیکھا اماں! میرا نصیب کتنا زور آور نکلا تم تو کہتی تھیں کہ مجھے کوئی مستری، مزدور بھی بیاہنے نہیں آئے گا، کوئی جمعدار بھی میرا ہاتھ نہیں تھامے گا۔ اب دیکھ لو اماں میرا ہاتھ ایک سید زادے کے ہاتھ میں ہے۔ ایسا اعلیٰ نسب خاندان کا مرد مجھے بیاہ کر اپنی خواب گاہ تک لایا ہے جو مجھ سے اپنی مراد پانا چاہتا ہے۔ اماں! تیری بد شکل اور نامراد بیٹی ایک اعلیٰ خاندان کے مرد کی مراد پوری کرنے چلی ہے، دیکھ

اماں! تیری کلموہی اس مہتاب رو شخص کی دلہن بنی اس کی سیج پر بیٹھی ہے، پاؤں کی دُھول، دامن کا پھول بن گئی ہے۔ پتھر کنکر سے ہیرا بن گئی ہے نامراد سے بامراد ہو گئی۔

تو اب بھی نہ مان اماں! پر یہ گن تو تیری کلموہی بیٹی میں ہے نا کہ وہ سیدوں کی اولاد پیدا کرنے کے لیے منتخب کر لی گئی ہے اس سے بڑھ کر نصیب کی بات اور کیا ہو گی اماں! تیری معصومہ بدنصیب نہیں ہے بہت نصیبوں والی ہے۔"

معصومہ دل ہی دل میں اپنی ماں رقیہ بیگم سے محو گفتگو تھی۔ اور رات دھیرے دھیرے ایک سید خاندان کے مستقبل کا فیصلہ رقم کر رہی تھی۔ "سادات حویلی" کے وارث ہونے کا یا بے وارث رہ جانے کی تحریر لکھ رہی تھی۔ سید حسین شاہ اور مریم بی بی عمرے کی ادائیگی سے لوٹے تھے اور یہ سارا منصوبہ انہوں نے روضہ رسول ﷺ پر حاضری دینے کے بعد بنایا تھا۔ یہ سب انہیں خواب کی صورت نظر آیا تھا اور جبھی انہوں نے اس خواب کی تعبیر کے لیے وطن واپس آتے ہی معصومہ گھر کا رخ کیا تھا۔

سید حسنین شاہ اور مریم بی بی کے ساتھ معصومہ بھی "سادات حویلی" آ گئی تھی۔ وہاں انہوں نے یہی بتایا تھا کہ معصومہ کو وہ سعودی عرب سے اپنے ساتھ لائے ہیں اور وہ بہت نیک لڑکی ہے اور اس کی ان کے ساتھ آمدان کے لیے بہت نیک ثابت ہو گی۔ سید حسنین شاہ کے ماں باپ بھی اس مہمان خاص کو دیکھ کر حیران ہوئے مگر اپنی بہو کے بامراد ہونے کی خوشخبری معصومہ کے دم قدم سے کسی وظیفے کے عمل سے ملنے کی آس میں بخوشی اسے خوش آمدید کہا۔ سید حسنین شاہ نے پہلے ہی انہیں بتا دیا تھا کہ مریم بی بی کے امید سے ہونے پر بچے کی ولادت کے لیے انہیں سعودی عرب لے جایا جائے گا۔ اور یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ سادات حویلی اور اس کے مکینوں کو تو بچے کے رونے ہنسنے بولنے اور قلقاریاں مارنے کی آوازیں سننے کی تمنا تھی۔ اور اگر وہ بچہ مدینے کی پاک زمین پر معطر و پاکیزہ فضاؤں میں آنکھ کھولے تو اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو سکتی تھی؟

سید حسنین شاہ سے نکاح کے دو ماہ بعد ہی جب معصومہ کا پاؤں بھاری ہو گیا تو سید حسنین شاہ نے تصدیق کے لیے اسے مریم شاہ کے ساتھ شہر بھیجا اور ماہر لیڈی ڈاکٹر سے اس کا معائنہ کرایا۔معصومہ ماں بننے والی تھی اور رپورٹس نے بھی اس کی تصدیق کر دی تھی۔ڈاکٹری نسخے اور رسید پر معصومہ کا نام مریم شاہ لکھا گیا تھا۔مریم کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے بچے کو جنم دینے جا رہی ہو۔

''حویلی سادات'' میں مریم شاہ کے امید سے ہونے کی خبر پہنچی تو ہر طرف شادیانے بجنے لگے،گاؤں میں مٹھائی اور کھانا تقسیم کیا گیا،صدقہ خیرات دیئے گئے۔معصومہ سب کے چہروں پر پھیلی خوشی دیکھ کر خوش تھی کے وہ اتنے برسوں سے خوشی کو ترسے ہوئے لوگوں کی خوشی کا باعث بنی ہے۔بڑی بیگم یعنی مریم شاہ کی ساس اور کنیزیں مریم کا خاص خیال رکھ رہیں تھیں۔اور مریم معصومہ کا خیال رکھ رہی تھی۔اپنے لئے بھجوائے گئے پھل دودھ اور جوس وغیرہ وہ معصومہ کے کمرے میں لے آتی۔خود اس نے سب ملازماؤں سے کہہ رکھا تھا کہ معصومہ کا خاص خیال رکھا جائے اس نیک بی بی کی بدولت ہی وہ اتنے برسوں کے بعد ماں بننے کی خوشخبری سن پائی ہے۔مریم شاہ کے ماں باپ بھی معصومہ کے قدم کو مبارک اور عمل کو پاک سمجھتے ہوئے اس کے شکر گزار تھے۔

''معصومہ بی بی! آپ نے ہمیں وہ خوشی دی ہے جس کے لیے ہم نو برس تک ترستے رہے ہیں......سب بہت خوش ہیں۔آپ خوش ہیں نا؟'' مریم شاہ نے معصومہ کے ہاتھ تھام کر فرط مسرت سے پوچھا تو معصومہ نے مسکراتے ہوئے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''جی ہاں، میں بہت خوش ہوں میری وجہ سے آپ ماں کہلائیں گی، آپ کی گود بھر جائے گی، آپ کی زندگی پھولوں سے بھر جائے گی، آپ کی ماں بننے کی تمنا اس طور پوری ہو جائے گی، مجھے اور کیا چاہیے؟ میں آپ سب کی خوشی میں بہت خوش ہوں۔دعا کیجئے کہ میرا اللہ مجھے اس امتحان میں سرخرو فرمائے۔'' معصومہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''آمین۔'' مریم شاہ نے دل سے کہا۔

''معصومہ، اس اولاد کو آپ ہی ماں بن کر پالیں گی بس اس کی ماں کی بجائے آپا ماں کہلائیں گی ہمیں اس گستاخی کے لیے معاف کر دیجئے گا ہم ایسا کرنے پر مجبور ہیں اس کے سوا کوئی صورت بھی نہیں تھی۔'' مریم شاہ نے نرم و مدھم لہجے میں کہتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔

''میں سب سمجھتی ہوں آپ کو نادم ہونے اور معذرت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میرے لئے تو یہی سعادت بہت ہے کہ میں ایک سیدزادے کی اولاد پیدا کرنے جا رہی ہوں۔ایک سیدزادے کی ماں بننے والی ہوں معصومہ نے مسکراتے ہوئے مدھم آواز میں کہا تو مریم شاہ نے فرط عقیدت سے اس کے ہاتھ چوم لئے۔

معصومہ تین ماہ کے حمل سے ہوئی تو سید حسنین شاہ اسے اور مریم شاہ کو لے کر سعودی عرب روانہ ہو گئے۔معصومہ نے جانے سے پہلے اپنے میکے جا کر سب سے ملاقات کی تھی۔اس کی وجہ سے اس کی بہنوں کی شادی طے ہو گئی تھی۔جہیز کا بندوبست سید حسنین شاہ نے کر دیا تھا۔گھر میں خوشحالی ہی خوشحالی نظر آ رہی تھی......رقیہ بیگم نے اس بار بڑھ کر اس کا استقبال کیا تھا۔

اماں! پتا نہیں میں وہاں سے واپس آ بھی سکوں گی کہ نہیں آپ آخری بار تو اپنی معصومہ کو نظر بھر کے نہ سہی ماں کی نظر سے ہی دیکھ لیں۔'' معصومہ نے چلنے سے ذرا دیر پہلے رقیہ بیگم کو دیکھتے ہوئے کچھ اس انداز میں کہا کہ رقیہ بیگم کے دل پر چوٹ سی پڑی تھی۔

''تو کیا سمجھتی ہے مجھے تیرے سے پیار نہیں ہے اری ماں ہوں میں تیری۔تیرے نصیبوں سے ڈرتی تھی جبھی ہر وقت بکتی جھکتی رہتی تھی۔اللہ نے ایسا کرم کیا کے تیرا تو نصیب ہی جاگ اٹھا، وہ کسی کو بھی بے مقصد پیدا نہیں کرتا۔میں کفر بکتی تھی، تیرا دل دکھاتی تھی تو مجھے معاف کر دے۔'' رقیہ بیگم نے پرنم لہجے میں کہا تو وہ اماں کہہ کر ان کے گلے سے لگ گئی اور دونوں ماں بیٹی دیر تک روتی رہیں۔

''اماں! اگر میں مر گئی نا تو مجھے وہیں مدینے میں دفن کر دینا، وہاں سے واپس

آنے کو میرا دل نہیں چاہے گا اماں۔''

معصومہ نے روتے ہوئے کہا اس نے اپنے امید سے ہونے کی خبر میکے والوں سے حسب وعدہ چھپائی ہوئی تھی۔

''باؤلی ہوئی ہے کچھ نہیں ہونے کا تجھے اپنی بہنوں کی شادی میں شریک نہیں ہوگی کیا؟'' رقیہ بیگم نے ڈپٹ کر کہا۔

''نہیں اماں! عمرے کی ادائیگی کے بعد میں وہیں رہوں گی۔ان کو وہاں بہت کام ہے شاید سال چھ مہینے لگ جائیں آپ میرے انتظار میں نہ رہنا مومنہ اور آمنہ کی شادی کا جو وقت اور تاریخ طے ہوگئی ہے اسی پر عمل کرنا۔'' معصومہ نے سنجیدگی سے کہا اور بہنوں کے شادی کے تحائف دے کر بھائیوں سے مل کر ابا میاں کی دعائیں لے کر وہاں سے روانہ ہوگئی۔

مدینہ منورہ میں سید حسنین شاہ نے ایک مکان کرایے پر لیا تھا۔ان تینوں نے وہاں سیٹ ہونے کے بعد عمرہ ادا کیا۔معصومہ کی تو زندگی بھر کی مرادیں روضہ رسول ﷺ پر حاضری دے کر پوری ہوگئی تھیں۔اس کی آنکھیں مسلسل اشکبار تھیں۔اس نے اپنے ماں باپ اور بھائیوں بہنوں کی خوشیوں اور سلامتی کی تندرستی کی بھی ڈھیروں دعائیں مانگی تھیں اور اپنی اولاد کے نیک تندرست اور صالح ہونے کی خیریت سے ولادت کی دعائیں مانگی تھیں۔اپنے گناہوں کی بخشش چاہی تھی ایک سرور اور اطمینان اس کے رگ و پے میں سرایت کرتا چلا گیا تھا۔

مریم شاہ، معصومہ کا بہت خیال رکھتی تھی۔اور سید حسنین شاہ ان دونوں کا خیال رکھتے تھے۔اپنی اولاد کو مریم شاہ کی اولاد ظاہر کرنے کے لیے وہ حویلی شہر اور ملک تک چھوڑ آئے تھے۔تاکہ یہ راز راز ہی رہے کہ ان کے بچے کی ماں مریم شاہ نہیں ہے، بلکہ معصومہ ہے......اور پھر وہ دن بھی آن پہنچا جب ایک عورت اور زندگی اور موت کی جنگ لڑتے ہوئے ایک نئی زندگی کو جنم دیتی ہے، جب جنت اس کے پیروں کی زینت بنادی جاتی ہے۔معصومہ آپریشن تھیٹر میں تھی۔اور سید حسنین شاہ اور مریم شاہ آپریشن تھیٹر کے باہر کوری ڈور میں فکرمندی سے ٹہل رہے تھے۔معصومہ کا

آپریشن ہو رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا تو ان دونوں کے دل بڑی زور سے دھڑکے تھے۔سید حسنین شاہ نے بے قراری سے آگے بڑھ کر انگریزی زبان میں لیڈی ڈاکٹر سے پوچھا کہ ''کیا ہوا ہے؟''

لیڈی ڈاکٹر نے انہیں تین جڑواں بیٹوں کی پیدائش کی خبر سنائی تو وہ بے اختیار الحمدللہ اور اللہ اکبر کہتے ہوئے دل ہی دل میں سجدہ شکر بجالائے۔

''لیکن میرے پاس آپ کے لیے ایک بری خبر بھی ہے آپ کی عزیزہ کی زندگی بس اتنی ہی تھی ہم ماں کو نہیں بچا سکے۔''

لیڈی ڈاکٹر کے یہ الفاظ مریم شاہ اور سید حسنین شاہ کی خوشی پر پل بھر میں پانی پھیر گئے، ڈاکٹر واپس جا چکی تھی اور وہ دونوں ساکت سے وہیں کھڑے رہ گئے تھے۔

سائیں! آپ سے ایک عرض کرنی تھی۔اگر میں اس دوران مرجاؤں تو مجھے اسی سرزمین میں دفن کر دیجئے گا۔میرے میکے والوں سے کہیے گا کہ میرے لیے کبھی کبھی قرآن پاک اور درود پاک کے تحفے ضرور بھیجیں وہاں مجھے ان کے ان تحفوں کی بہت ضرورت ہوگی اور سائیں! آپ جب کبھی یہاں آؤ تو میری قبر پر فاتحہ پڑھنے ضرور آیا کرنا۔''

معصومہ کی دو دن پہلے کہی باتیں سید حسنین شاہ کی سماعتوں میں گونج رہی تھیں اور ان کی آنکھوں میں نمی اترتی جارہی تھی۔

''سادات حویلی'' میں سید حسنین شاہ کے باپ بننے اور مریم شاہ کے تین جڑواں بیٹوں کو جنم دینے کی خبر بذریعہ ٹیلی فون پہنچ گئی تھی۔سبھی بہت خوش تھے۔ سید حسنین شاہ (والد) نے سعدیہ شاہ (والدہ) کو ایک خادمہ کے ساتھ سعودی عرب بھجوانے کا فوراً انتظام کرا دیا تھا۔تاکہ وہ وہاں پہنچ کر بہو اور بچوں کی دیکھ بھال کر سکیں اور ڈیڑھ ماہ بعد انہیں اپنے ساتھ وطن واپس لے آئیں......

پیش امام انور علی کے گھر میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔معصومہ کی مغفرت کے

لیے قرآنی خوانی کرائی جا رہی تھی۔ رقیہ بیگم بلک بلک کر تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی کسی کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ معصومہ کی موت کی اصل حقیقت کیا ہے؟ انہیں یہی بتایا گیا تھا کہ معصومہ روضہ رسول ﷺ پر حاضری دے کر بہت خوش تھی بس اس رات اچانک اس کی طبیعت خراب ہوگئی اور وہ حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئی۔ معصومہ کی خواہش اور وصیت کے مطابق اسے شہر مدینہ میں ہی سپرد خاک کیا جا رہا تھا۔

معصومہ کی زندگی کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ شاید وہ دنیا میں اسی مقصد کے لیے بھیجی گئی تھی۔ سید خاندان کو وارث دینے کے لیے ''سادات حویلی'' کے وارث کی اولاد پیدا کرنے کے لیے اور یہ مقصد پورا ہو گیا تھا۔

ایک طرف سید حسنین شاہ نے تشکر اور عقیدت سے بھیگتی آنکھوں سے معصومہ کی میت کو لحد میں اُتارا تھا تو دوسری طرف انہوں نے سجدہ شکر بجا لاتے ہوئے تینوں بچوں کو مریم شاہ کی خالی گود میں ڈال کر اسے بھر دیا تھا۔

تینوں بچے بہت پیارے تھے صحت مند اور سرخ و سفید رنگت والے گپلو سے تھے۔ سید حسنین شاہ کا رنگ روپ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ لیکن ان تینوں کی آنکھوں میں معصومہ کی معصوم محبت اور قربانی جھانک رہی تھی۔

معصومہ مر کر بھی خود کو ان دونوں کے دلوں میں امر کر گئی تھی اور اپنی اولاد کی صورت میں ان کے گھر اور زندگیوں میں رچ بس چکی تھی۔

☆☆☆

سالگرہ

''دس سال ہو گئے ہیں ہماری ہیں ہماری شادی کو مگر مجال ہے جو انہوں نے کبھی مجھ سے سیدھے منہ بات کی ہو۔'' رقیہ بانو اپنی رشتے کی خالہ زاد بہن سے مخاطب تھیں۔

''ان کا منہ تو پیدائشی ٹیڑھا بھلا وہ سیدھے منہ کیسے بات کر سکتے ہیں۔'' خالہ زاد سلمیٰ نے رقیہ بانو کے شوہر افضل مراد کے پیدائشی نقص کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''عید بکدا عید پر عیدی دینے کی توفیق ہوتی ہے نہ سالگرہ پر تحفہ دینے کو جی مچلتا ہے۔ ایک کروڑ کنجوس مرے ہوں گے تب یہ پیدا ہوئے ہوں گے۔'' رقیہ بانو نے جلے دل سے کہا تو سلمیٰ نے ازرائے مذاق کہا۔

''دیکھ لیجیے آپا! آپ کا جیون ساتھی معرض وجود میں لانے کے لیے قدرت کو کتنے وجود تہہ خاک سلانے پڑے۔ آپ پھر بھی خوش نہیں ہیں۔''

''خوشی تو اسی دن مجھ سے روٹھ گئی تھی جس دن میں نے ان کو شوہر کی حیثیت سے قبول کرتے ہوئے پکے کاغذ پر دستخط کیے تھے۔''

رقیہ بانو نے بیزاری سے سبزی کاٹتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

''اب کیا ہو سکتا ہے آپا! راضی بہ رضا رہنا سیکھیں۔''

''عجیب بے حس آدمی ہیں کسی بات کا، جذبات و احساسات کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا مٹی کے مادھو بلکہ چکنے گڑھے ہیں موصوف۔''

''توبہ آپا! شوہر بیزاری کی حد کردی آپ نے تو شوہر کی کمیاں، خامیاں، خرابیاں، کمزوریاں اور مجبوریاں اچھی بیوی کو دوسروں کے سامنے بیان نہیں کرنی چاہئیں گناہ ملتا ہے آخر کو شوہر مجازی خدا ہوتا ہے۔'' سلمٰی نے ان کی بات کا برا مناتے ہوئے سمجھایا۔

''ہیں آپ رو رہی تھیں پر میں نے تو آپ کی آنکھوں سے ایک بھی آنسو بہتے نہیں دیکھا۔'' سلمٰی اپنی پر مزاح طبیعت کی وجہ سے جان بوجھ کر حیران ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے بولی۔

''آنسو تو میرے دل میں گرتے ہیں یہاں آنسو پونچھنے والا کون ہے جو آنکھوں سے بہاؤں۔'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔

''آپا! مہنگائی کے اس دور میں جسم اور روح کا رشتہ برقرار رکھنا ہم جیسے سفید پوش طبقے سے تعلق رکھنے والوں کے لیے کسی امتحان سے کم نہیں ہے اب افضل بھائی دن رات آپ کے لیے اور اپنے بچوں سمعیہ اور علی مراد کے لیے ہی تو محنت مشقت کرتے ہیں صبح کو اخبار گھر گھر پہنچاتے ہیں اس کے بعد ورکشاپ پہ کام کرتے ہیں تب کہیں جا کے گھر کی دال روٹی پوری پڑتی ہے اور پھر سمعیہ اور علی مراد کو پڑھا بھی تو رہے ہیں ان کی تعلیم کے اخراجات بجلی گیس کے بل اور اس کے علاوہ شادی غمی بھی ساتھ ساتھ لگے ہیں ظاہر ہے خاندان برادری میں ایسے موقعوں پر تو جانا ہی پڑتا ہے۔ اب بھائی افضل مراد یہ ذمے داریاں پوری کریں کے آپ کی سالگرہ کا اہتمام کریں اور بلاوجہ کا خرچہ بڑھائیں۔ یہ سالگرہ کی تقریبات منانا تو پیسے والوں کو بجتا ہے ہم جیسوں کو یہ چونچلے زیب نہیں دیتے۔'' سلمٰی نے نہایت سنجیدگی سے انہیں زندگی کی حقیقت سے آگاہ کرتے ہوئے کہا وہ سب جانتی سمجھتیں تھیں مگر اپنے اس دل کا کیا کرتیں جو سالگرہ منانے کی اپنے گھر میں لوگوں کو دعوت پہ بلانے کی خواہش کر رہا تھا۔ آخر ان کا بھی تو زندگی کی خوشیوں پر کچھ حق تھا۔

ایک ذرا سی سالگرہ منانے سے کونسے چونچلے ہو گئے بھئی میری تو چھوڑو ہم نے تو آج تک اپنے جڑواں بچوں تک کی سالگرہ نہیں منائی۔ وہ ہمارے سامنے والے گھر میں قریشی صاحب رہتے ہیں پچھلے ہفتے انہوں نے اپنی شادی کی پندرویں

سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی تھی اور اس بہانے بیسیوں تحفے تحائف الگ سمیٹ لیے تھے اور کھانے میں جانتی ہو کیا تھا ایک سخت جان سا کیک جو میرے تو حلق میں ہی پھنس گیا تھا اگر میں پانی نہ پی لیتی۔ سموسے، دہی بھلے اور بوندی نمک پارے، بتاؤ بھلا جب اتنی کنجوسی دکھائی تھی تو سالگرہ ضرور منانی تھی۔ مٹھائی اور کولڈ ڈرنک پلانے کی اوقات نہیں تھی اور سالگرہ منا رہے تھے۔ صرف اور صرف دوستوں، رشتے داروں اور محلے داروں سے قیمتی تحائف اینٹھنے کا حربہ تھا یہ جو بہت کامیاب رہا۔

''تو گویا آپ بھی تحائف اینٹھنے کے خیال سے اپنا جنم دن ایک تقریب کی صورت میں منانا چاہتی ہیں۔''
سلمٰی نے ہنس کر کہا۔

اسی میں حرج ہی کیا ہے اور اصل میں تو میں یہ چاہتی ہوں کہ میرے شوہر نامدار کو میرا بھی کبھی خیال آ جائے۔ مجھے بھی احساس تو ہو کہ میں ان کے لیے کتنی اہم ہوں اور میری خوشی ان کو کتنی عزیز ہے۔ رقیہ بانو نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''غریب کو روزی روٹی کی مزدوری کی فکریں ایسی خوشی کا احساس دلانے کی فرصت اور مہلت ہی کب دیتی ہے۔ آپ تو ناحق بھائی افضل مراد سے خفا ہیں وہ اتنی محنت اور جان ماری بھی تو آپ کے لیے اور آپ کے بچوں کے لیے آپ کے اس گھر کے لیے کر رہے ہیں ناں۔''

''تو اس سے میں نے کب انکار کیا ہے؟'' رقیہ بانو نے کہا۔

''اتنی محنت مشقت کے بعد بھی خوشی اور خوشحالی نہ نظر آئے تو جی تو برا ہو گا ہی۔''

آپا! آپ کی اور آپ کے بچوں کی ہر ضرورت وہ اپنا فرض اور ذمے داری سمجھ کر پوری تو کر رہے ہیں ناں اس سے زیادہ کی خواہش ہی فضول ہے بھائی افضل مراد بھی تو انسان ہیں کیا ان کا دل نہیں چاہتا ہو گا کہ وہ بھی آرام سے دس گھنٹے کام کرنے کے بعد زندگی کے مزے لوٹیں ہنسیں بولیں، قہقہے لگائیں اور بے فکری کی نیند سو جائیں، آرام، آسائش، خوشی اور بے فکری کی نیند سو جائیں، آرام، آسائش، خوشی اور بے فکری کی زندگی کی چاہ کسے نہیں ہوتی آپا! لیکن انسان تقدیر سے تو نہیں

لڑسکتا نا رب نے جو دیا ہے جتنا دیا ہے اس پر توکل کرنا، صبر، شکر کرنا سیکھئے یہ گھر آپ کا قلعہ ہے اس قلعے کو اپنے صبر اور شکر کے مٹی، گارے سے مضبوطی کھڑا رکھیں۔ اس کے گرد آپ کے شوہر کی محبت و محنت کی فصیلیں، حفاظت کی باڑ کھڑی ہے آپ تو ہزاروں، لاکھوں عورتوں سے اچھی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اپنا گھر ہے، شوہر، بچے ہیں زیادہ خوشحالی نہ سہی ایسی تنگدستی بھی نہیں ہے کہ آپ کو کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے چاہئیں۔ دوسروں کی تقلید اندھا دھند کرنے سے نقصان ہی ہوتا ہے۔ حرص، ہوس اور لالچ تو یوں بھی انسان کو بے ایمان اور بے اصول کر دیتے ہیں اپنے دل کی خواہش کو لگام ڈالیں۔''

''ایک بار سالگرہ منانے کی خواہش کوئی ایسی ناجائز بھی نہیں ہے اور یہ تم میری کزن ہو کے افضل مراد کی مسلسل اُن کی حمایت میں بولے جا رہی ہو۔'' رقیہ بانو نے سنجیدگی سے کہا تو وہ ہنس کر بولی۔

''اچھا بس رہنے دو اپنی سمجھداری تم تو انہیں کی طرف داری کرو گی ان کی محنت تمہیں نظر آتی ہے میں جو کہ ہلو کے بیل کی طرح دن رات گھر کے کاموں میں بچوں کے کاموں میں جتی رہتی ہوں وہ تمہیں نظر نہیں آتا۔''

رقیہ بانو نے چڑ کر کہا۔ آپا! یہ گھر آپ کے ہیں اور ان کے کام بھی آپ ہی کو کرنے ہیں اور مرد اور عورت، میاں، بیوی مل کر ہی کام کرتے ہیں اپنی اپنی ذمے داریاں نبھاتے ہیں تبھی گھر چلتے ہیں اور جنت بنتے ہیں کیا سمجھیں؟

''سب سمجھتی ہوں بچی نہیں ہوں میں ایک ذرا سی خواہش کا اظہار کیا کر دیا لگیں مجھے سمجھانے، فلسفۂ زندگی سنانے ہونہہ۔''

رقیہ بانو نے برا سا منہ بناتے ہوئے جلے لہجے میں کہا اور سبزی سمیٹ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں اور سلمیٰ دھیرے سے ہنس دی۔ ''کیا بات ہے ابی بھگوان کھانا کیوں نہیں کا رہیں؟''

رات کو افضل مراد گھر آیا تو کھانے کے وقت رقیہ بانو کو منہ بھلائے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔

''امی آج کل غصہ کھا رہی ہیں۔'' جواب نو سالہ علی مراد نے مسکراتے ہوئے دیا تھا۔

''کیوں رقیہ بانو کس بات پر غصہ کھا رہی ہو؟''

''آپ کو تو جیسے معلوم ہی نہیں ہے ایک ذرا سی فرمائش کی تھی آپ سے۔''

رقیہ بانو نے خفا نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے ناراض لہجے میں کہا۔ ''ابھی تو کئی
سالگرہ منانے کی فکر لاحق ہوگئی۔''
دن باقی ہیں تمہارے جنم دن میں تمہیں ابھی سے

''میں کونسا ہر سال جنم دن کی تقریب مناتی ہوں جو مجھے فکر لاحق ہوگی ایک
کونسی کمی آجائے گی تمہارے خزانے میں۔''
ایک بار سالگرہ کی تقریب منانے سے

''رقیہ بانو بانو نے بدستور پھولے منہ سے جواب دیا۔ اری بھگوان، میرے
ہی ہوں گے اگر ہوئے تو......
سارے خزانے تمہارے اور تمہارے بچوں کے واسطے
کرتا ہوں کچھ تم کھانا تو کھاؤ۔ کھانے سے بھلا کیا ناراضگی کتنی محنت سے تو یہ روٹی ملتی
ہے اس کی ناقدری نہ کرو لو کھاؤ شاباش۔''

افضل مراد نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے روٹی دسترخوان سے نکال کر اس کی
چنگیز میں رکھ دی تو وہ شرمندہ سی ہو کر کھانا کھانے لگیں۔ رقیہ بانو، کہاں ہو بھاگ
بھری ذرا ادھر کو تو آؤ۔''

افضل مراد ہاتھوں میں تین شاپر اُٹھائے گھر میں داخل ہوئے اور رقیہ بانو کو
آواز دے کر کہنے لگے۔

''خیر ہے افضل مراد تم اس وقت گھر کیسے آگئے کیا ورکشاپ نہیں گئے؟''
رقیو بانو باورچی خانے سے باہر نکل کر آنہیں دیکھتے ہوئے حیرانگی سے پوچھ
رہی تھیں وہ دن کے بارہ بجے تو کبھی گھر نہیں آئے تھے۔

''گیا تھا آج آدھے دن کی چھٹی لے لی ہے میں نے آج تیری سالگرہ ہے
نا۔ لے یہ تیرے اور بچوں کے نئے کپڑے جوتے ہیں۔''

''کیا سچی؟''

رقیہ بانو نے شاپر پکڑتے ہوئے حیرت آمیز مسرت سے پوچھا تو وہ مسکراتے
ہوئے بولے۔

''ہاں اور اس میں تیرے لیے جیولری سیٹ اور چوڑیاں بھی ہیں شام کو تیار
ہو جانا اور جسے بلانا ہو محلے میں سے بلا لینا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو مراد؟"

ہاں رقیہ بانو تمہاری اتنی سی خوشی میں اب پوری کرنے کے قابل ہوا ہوں پہلے پیسہ نہیں تھا اتنا کے خرچ کرتا۔ کل میری کمیٹی نکلی ہے تیرے سے چھپ کے میں نے یہ کمیٹی ڈالی تھی صحیح وقت پہ نکلی ہے میں نے سوچا تیری سالگرہ کا اہتمام کر کے تیری خواہش اور فرمائش بھی اس بار پوری کر ہی دوں یہ سب کام تو پیسے سے ہی ہوتے ہیں ناں۔"

"ہاں تم بہت اچھے ہو افضل مراد میں خواہ مخواہ ہی دل ہی دل میں تم سے خفا رہی میں ابھی سب سہیلیوں اور ہمسایوں کو دعوت دیتی ہوں۔ مگر اتنی جلدی میں تو وہ مجھے کوئی ڈھنگ کا تحفہ بھی نہیں دے سکیں گی۔"

رقیہ بانو نے پُرجوش انداز میں کہتے ہوئے یکدم ہی مایوسی سے آخری جملہ کہا تو افضل مراد ہنس پڑے اور بولے۔

"تجھے تحفہ چاہیے ناں وہ میں تجھے لا دوں گا ان چیزوں کے علاوہ بھی تجھے ایک تحفہ دوں گا بہت بڑا تحفہ دوں گا ہاں۔"

"مراد تم بہت اچھے ہو تم نے میری دلی مراد پوری کرنے کے لیے جو کچھ کیا ہے اس نے مجھے احساس دلا دیا ہے کہ تم مجھ سے پیار کرتے ہو، میں تمہارے لیے اہم ہوں، میری خوشی تمہیں عزیز ہے۔"

رقیہ بانو نے ایمانداری سے اعتراف کیا تو وہ خوش ہو کر بولے۔ جھلی، شوہر ہوں میں تیرا مجھے تیری خوشی کا احساس نہیں ہوگا تو پھر کیسے ہوگا بس تو خوش رہا کر اب میں چلتا ہوں تو مہمانوں کو پیغام بھیج دے۔ پر ایک بات ہے۔"

"وہ کیا؟"

رقیہ بانو نے حیران ہو کر پوچھا۔

سالگرہ کا کیک کاٹتے ہوئے اگر کسی نے تجھ سے تیری عمر پوچھ لی تو کیا جواب دے گی کہ تو کتنے سال کی ہو گئی ہے؟

وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

کہہ دوں گی بائیس سال کی ہوئی ہوں۔

وہ اپنی عمر میں سے پورے دس سال کم کرتے ہوئے بڑی ادا سے بولی تو وہ ہنستے ہوئے کہنے لگے۔

لیکن وہ کیک پر لگی موم بتیوں کو گن کے جان جائیں گے کہ تیری اصل عمر کیا ہے کیونکہ تمہاری سالگرہ کے کیک سے زیادہ خرچہ تو موم بتیوں پر آئے گا۔

"مراد۔"

وہ مصنوعی خفگی سے انہیں گھورتے ہوئے ہنس پڑی وہ بھی ہنس دیئے۔

"اچھا میں چلتا ہوں چھوٹے کے ہاتھ مرغی کا گوشت بھجوا دوں گا ابھی تم پلاؤ اور چکن کڑاہی پکا لینا، باقی پھل، سموسے اور کیک میں شام کو واپسی پر لیتا آؤں گا ٹھیک ہے۔"

افضل مراد نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ خوشی سر ہلا کر مسکرا دیں۔

شام کو افضل مراد اور رقیہ بانو کا تین مرلے کا یہ چھوٹا سا آنگن مہمانوں سے بھر گیا تھا ہر کوئی حسب توفیق تحفہ بھی لایا تھا تو کسی نے سو، پچاس روپے نقد دے دیئے تھے۔ رقیہ بانو سبز رنگ کے خوبصورت لباس میں بھی سنواری بے حد مسرور دکھائی دے رہی تھی۔ سمعیہ اور علی مراد بھی نئے ملبوسات میں خوب جچ رہے تھے۔ ان کی زندگی میں تو یہ پہلا موقع ملا تھا کہ ان کے گھر کوئی خوشی کی تقریب ہو رہی تھی اور اتنے ڈھیر سارے مہمان اکٹھے ہوئے تھے۔ مہمان کیک کاٹے جانے کا منتظر تھے۔

افضل مراد کیک اور دیگر لوازمات کے ساتھ ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔

علی باہر دیکھ تو تیرے ابو ابھی تک نہیں آئے۔

رقیہ بانو نے بیٹے سے کہا تو اس کے دروازے سے نکلنے سے پہلے ہی رقیہ بانو کے بڑے بھائی فیض محمد نے صحن میں قدم رکھا۔

رقیہ بانو، تیرے علی کے ابو آ گئے ہیں۔ تیرا افضل مراد آ گیا ہے۔ آ جاؤ یا مراد کو لے آؤ اندر۔"

فیض محمد نے رقیہ بانو سے کہتے ہوئے باہر کسی سے کہا تو رقیہ بانو سمیت سب مہمانوں کی نظریں دروازے کی جانب اٹھی تھیں۔

افضل مراد گھر کے اندر آ گیا تھا۔ نہیں بلکہ اسے لایا گیا تھا وہ گھر سے گیا تو اپنے

پیروں پر چل کے گیا تھا لیکن گھر لوٹا تھا تو چار کہاروں، چار کندھا دینے والوں کی ہمراہی میں۔ وہ کیک لے کر بیکری سے جونہی باہر نکلا تھا ایک تیز رفتار ویگن اسے ٹکر مارتی ہوئی تیزی سے آگے نکل گئی تھی۔ یہ دیکھے بنا کے ایک زندگی اس کی ٹھوکر کی زد میں آکر موت سے ہم آغوش ہوگئی ہے۔

مراد...... افضل مراد کیا ہوا ہے تمہیں؟

رقیہ بانو خوفزدہ لہجے میں چیختی ہوئی مراد کی چارپائی کے قریب دوڑتی ہوئی آکر اس کا خون میں لت پت چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''یہ کیک لے کر بیکری سے باہر نکلا تھا کہ...... ویگن نے ٹکر دے ماری اور یہ جادہ جا......''

فیض محمد نے پرنم لہجے میں بتایا۔ مراد! تم تو کیک لینے گئے تھے اور موت لے کر آگئے...... تمیں مراد تمیں...... ایک سالگرہ کی اتنی بڑی قیمت چکانی پڑے گی۔ ایک جنم دن کی تقریب اتنی مہنگی پڑے گی۔ مجھے اگر معلوم ہوتا تو میں کبھی...... سالگرہ منانے کی فرمائش نہ کرتی...... اٹھو افضل مراد! تم تو سالگرہ منانے آرہے تھے۔ پھر مجھے سوگ منانے کے لیے کیسے چھوڑ سکتے ہو۔ اٹھو آنکھیں کھولو مراد! میں پھر کبھی سالگرہ کا نام نہیں لوں گی...... میری سالگرہ کی تیاری نے تمہاری جان لے لی۔ میرا جنم دن تمہارا ختم دن بن گیا...... کیوں؟ یا اللہ! مجھے میرا سہاگ لوٹا دے۔'' رقیہ بانو اپنے سہاگ کا لہولہان چہرہ دیکھتے ہوئے صدمے سے چور لہجے میں روتے ہوئے بول رہی تھی۔ سب مہمانوں کی آنکھیں بھی اس قیامت صغریٰ پر بھیگ گئیں تھیں۔

آپا! حوصلہ کریں اللہ کی یہی مرضی تھی۔'' سلمٰی نے دلاسہ دیا۔

''یہ کیسی مرضی ہے اللہ کی جس نے میری...... خوشی مجھ سے چھین لی میرا سہاگ...... میری زندگی مجھ سے چھین لی۔''

''صبر کریں آپا۔''

سلمٰی نے روتے ہوئے کہا سمعیہ اور علی مراد الگ باپ کی میت کے پاس بیٹھے بلک رہے تھے۔ خوشیوں بھرا گھر پل بھر میں ماتم کدہ بن گیا تھا۔

افضل مراد! تم نے تو...... کہا تھا کہ میں تمہارے جنم دن پر تمہیں بہت بڑا تحفہ

دوں گا...... یہ تحفہ دیا ہے تم نے مجھے اپنی موت کا تحفہ مجھے نہیں چاہیے...... یہ تحفہ اتنی بڑی فرمائش تو نہیں تھی میری...... جس کی اتنی...... بڑی سزا دی ہے تم نے مجھے...... اٹھو افضل مراد مجھے یوں بے مراد کر کے مت جاؤ میں وعدہ کرتی ہوں...... آئندہ تم سے کوئی فرمائش نہیں کروں گی۔ ایک بار آنکھیں کھول دو...... افضل مراد۔

رقیہ بانو بلک بلک کر تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے افضل مراد کے بے جان وجود کو جھنجھوڑتے ہوئے بول رہی تھیں اور سب کو رلا رہی تھیں۔ انہیں سالگرہ کی مبارکباد دینے والے اب انہیں پرسہ، تسلی اور دلاسہ دے رہے تھے۔ تہنیت کے کلمات ادا کرنے والے اب تعزیت کے جملے بول رہے تھے۔ سالگرہ کی، جنم دن کی تقریب میں شرکت کے لیے آنے والے اب رقیہ بانو کے شوہر کے ختم دن کی آخری رسومات میں شرکت کر رہے تھے...... رقیہ بانو صدمے سے نڈھال افضل مراد کو پکار پکار کر کہہ رہی تھیں۔

افضل مراد! واپس لوٹ آؤ...... میں سمجھ گئی ہوں میرے سرتاج کے...... غریب اگر اپنی اوقات سے بڑھ کر خواہش یا فرمائش کر لے تو...... تقدیر اس کی بساط سے بڑھ کے اُسے نوازتی ہے۔ مگر کچھ اس طرح کے وہ سدا آنسوؤں کے سوا کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ بیوی بچوں کو نیا جوڑا لا کر دینے والا خود بھی کفن کی صورت نیا جوڑا پہن کر سو گیا تھا۔ افضل مراد کی آنکھیں تو بند ہوگئیں تھیں مگر رقیہ بانو کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے کھل گئیں تھیں۔ اب انہیں نہ صرف اپنی حفاظت کرنا تھی بلکہ اپنے دو معصوم بچوں کی حفاظت، دیکھ بھال اور پرورش بھی خود ہی کرنا بھی تن تنہا، بنا کسی سایہ دار درخت کے، بنا کسی مضبوط سہارے اور حفاظتی باڑ کے...... وہ باڑ جو اس کے قلعے (گھر) کے اردگرد بنی ہوئی تھی، تنی ہوئی تھی آج تک جھٹکے سے ٹوٹ گئی تھی۔ اب اسے اپنے قلعے (گھر) کی فصیلیں خود بلند کرنا تھیں۔ حفاظتی باڑ اپنے ارادے، اپنے ہاتھوں سے خود تعمیر کرنی تھی۔ اب اسے کوئی سالگرہ نہیں منانی تھی۔ اب تو صرف برسی منانا تھی افضل مراد کی برسی، اپنی خواہش اور فرمائش کی برسی جو اس کے جنم دن پر مرگئی تھے۔''

☆☆☆

اور موسم خوشگوار ہو گیا

پھولوں، کلیوں، ستاروں سے بھی خوبصورت اور دیدہ زیب عروسی سیج پر بیٹھی سجل عامر کتنے تعریفی جملوں، ستائشی لفظوں اور دعاؤں میں سرشاری یہاں تک پہنچی تھی۔ ہر کسی نے اس کے حسن و جمال اور اچھے نصیب پر قصیدہ گوئی کی تھی۔ عامر اس کی امی ساجدہ بیگم کی سہیلی ذکیہ فیضی کا چھوٹا بیٹا تھا۔ مگر اتنا بھی چھوٹا نہیں تھا۔ اٹھائیس برس کا ہو چلا تھا۔ اس سے چھوٹی روما کی شادی ہو رہی تھی۔ بیگم فیضی نے ساتھ ہی عامر کے سر پر بھی سہرا سجانے کی ٹھان لی۔ وہ نہ نہ کرتا رہ گیا مگر اس بار اس کی ایک نہیں سنی گئی اور بیگم ذکیہ فیضی نے اپنی بیمار سہیلی کا غم بھی ہلکا کیا بوجھ بھی اتار دیا سجل کو بہت محبت سے اپنی بہو بھی بنا لیا۔

ساجدہ بیگم کو کینسر تھا وہ ہسپتال میں داخل تھیں اور جلد از جلد سجل کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی تھیں کیونکہ اس کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ سجل ابھی صرف اٹھارہ برس کی تھی ایف ایس سی کا امتحان دیا تھا اس نے اور بیماری سے لڑتی ماں کی تیمارداری میں لگی تھی کہ ایک دن خاموشی سے عامر کے ساتھ اس کا نکاح پڑھا دیا گیا اور ساجدہ بیگم اسی شام بہت سکون سے ابدی نیند سو گئیں۔

سجل نے عامر کو نہیں دیکھا تھا پتا نہیں وہ آیا بھی تھا یا نہیں البتہ اس کی خالہ سلمٰی اور بیگم ذکیہ فیضی نے اس کی ڈھارس بندھائی اسے تسلی دلاسہ دیا اور ساجدہ بیگم کے چالیسویں کے فوراً بعد بیگم ذکیہ فیضی نے اپنی بیٹی روما کی شادی کے ساتھ ہی سجل کو بھی رخصت کرا کے فیضی لاج میں لانے کا اہتمام کر ڈالا۔ اب دو تصویروں میں ہنستے

مسکراتے نظر آنے والے عامر کو اپنے روبرو ہنستے بولتے دیکھنے کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کیے کب سے بیٹھی تھی اس کے کم سن دل نے عامر کو اپنا سب کچھ مان لیا تھا جان لیا تھا اپنے تمام سچے اور اچھوتے جذبے اس کے نام کر دیے تھے۔

بیگم ذکیہ فیضی اور عامر کے بڑے بھائی ناصر کی بیوی فائزہ بھابی اس سے بہت محبت اور اپنائیت سے یہاں تک چھوڑ گئیں تھیں۔ مگر وہ جس کی محبت اور اپنائیت پا کر مطمئن اور مسرور ہونا چاہتی تھی وہ شخص مانتا تھا۔ گھونگھٹ نکالے سر جھکائے اس کی گردن بھی دکھنے لگی تھی آج کل دلہنوں کا گھونگھٹ نکالنے کا رواج نہیں رہا مگر سجل کا گھونگھٹ فائزہ بھابی نے بطور خاص نکالا تھا۔

"عامر گھونگھٹ اٹھائے گا تو تمہیں دیکھتا ہی رہ جائے گا اس نے تمہیں اب تک نہیں دیکھا اب دیکھے گا تو احسان مند ہوگا کہ ہم نے اس کے لیے حور شمائل لڑکی کا انتخاب کیا ہے ساری بیزاری اور ناراضگی بھلا کر تم میں کھو جائے گا۔" فائزہ بھابی نے جاتے جاتے کہا اور وہ شرم و حیا سے گلنار ہو گئی۔

"ناراضگی، بیزاری"۔ اب وہ ان دو لفظوں میں الجھ گئی۔

"عامر رات کا ایک بج رہا ہے اپنے کمرے میں جاؤ"۔ بیگم فیضی کی آواز اس کی سماعتوں میں پڑی تو اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

"کمرے میں کیا ہے مما؟" یہ عامر کی آواز تھی لہجے سے بیزاری صاف جھلک رہی تھی سجل کا دل ڈوبنے لگا۔

"دلہن ہے تمہاری جاؤ اسے دیکھو"۔ بیگم فیضی کہہ رہی تھیں۔

"پلیز مما میرے پاس ٹائم نہیں ہے فرصت ہوگی تو دیکھ لوں گا"۔

"عامر بیٹا بہت بری بات ہے مجھے شرمندہ کراؤ گے سجل کے سامنے اور لوگ کیا کہیں گے چلو جاؤ اس کے پاس۔" بیگم فیضی اسے سمجھا رہی تھیں اور سجل کو اپنی ہتک محسوس ہو رہی تھی۔ ایک شخص اس سے بیزار ہے اور اسے زبردستی اس کے پاس سر تھوپنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

"اوہو مما میرے سب دوست نیچے میرا انتظار کر رہے ہیں آپ کو ہی شوق تھا میری شادی کرانے کا اب خود ہی دیکھیں اس دلہن بی بی کو خواہ مخواہ کی مصیبت

میرے گلے ڈال دی ہے''۔ عامر کا گستاخ اور بیزار لہجہ سجل کے ارمانوں پر بجلی بن کر گرا۔ ساری سج دھج، ساری تعریف و ستائش، بے خودی کی ہر کیفیت مر گئی تھی۔ وہ سن سی بیٹھی تھی۔ عامر کے الفاظ اس کی سماعتوں میں گونج رہے تھے۔

''میرے پاس فرصت نہیں ہے ٹائم ہو گا تو دیکھ لوں گا''۔

''عامر کے پاس اپنی نئی نویلی دلہن کے لیے وقت نہیں ہے فرصت نہیں ہے۔'' سجل نے دکھ سے سوچا۔ گلے میں آنسوؤں کا سیلاب امڈتا چلا آ رہا تھا۔

''دلہن بی بی خواہ مخواہ کی مصیبت''۔ کیا تلخ، بیزار اور طنزیہ لہجہ تھا عامر کا سجل کی روح میں جیسے کسی نے جلتے ہوئے انگارے رکھ دیئے تھے۔ دل تو جیسے جل بجھا تھا۔

''آدھی رات ہو گئی آپ صبح سے اب تک اسی پوزیشن میں بیٹھی بیٹھی تھکی نہیں سو جائیں مجھے تو اپنے دوست کے ساتھ جانا ہے وہ میرا انتظار کر رہے ہیں میری کمٹ منٹ ہے ان سے''۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھی جب عامر کی آواز اس کے کانوں میں پڑی اپنی بات مکمل کر کے چلا بھی گیا اور اس کا گھونگھٹ تک اٹھانے کی زحمت نہیں کی کمرے کے بند دروازے کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔

دوپہر کے دو بج رہے تھے جب سجل نے آنکھیں کھولیں۔ بیگم ذکیہ فیضی پریشان سی اس کے بیڈ کے قریب بیٹھی تھیں۔ اس نے محسوس کیا کے اس کے بدن سے زیورات کا بوجھ اتارا جا چکا ہے مگر دل پر جو بوجھ آن پڑا تھا اس کا مداوا کس کے پاس تھا۔ اس کے پاس جو اسے شادی کی پہلی رات بنا اس کا گھونگھٹ اٹھائے بغیر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس نے تھک کر پھر سے آنکھیں موند لیں۔ بیگم ذکیہ فیضی نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے کہا۔

''سجل بیٹی آنکھیں کھولو جان آئی ایم سوری بیٹا عامر کے رویے نے تمہیں ہرٹ کیا ہے نا میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتی ہوں بیٹا عامر دل کا برا نہیں ہے بس ذرا لاابالی سا ہے شادی کے نام سے بھاگتا تھا میں نے ہی اس کی ایک نہیں سنی اس لیے وہ ذہنی طور پر اپ سیٹ ہو گیا ہے انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا تم اٹھ کر فریش ہو جاؤ بیٹا نیچے بہت سے مہمان موجود ہیں''۔

''جسے میری پرواہ نہیں ہے میں اس کی پرواہ کیوں کروں خود کو سب کے سامنے

قابل ہمدردی کیوں ثابت کروں لوگوں پر یہ کیوں ظاہر کروں کہ مجھے عامر کے رویے نے بہت ہرٹ کیا ہے ترس کھاتی رحم بھری نگاہوں کا مرکز کیوں بنوں؟ سجل نے دل میں سوچا اور نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ اٹھ بیٹھی۔

فائزہ بھابی نے اس کے کپڑے نکال دیئے تھے جو اس نے نہا کر پہن لیے۔ پھر انہوں نے اس کا میک اپ کیا جیولری پہنائی اور اس کے لیے کھانا کمرے میں ہی لے آئیں۔

فائزہ بھابی بہت مشفق اور محبت کرنے والی عورت تھیں۔ سجل کو ان سے بات کر کے خوشی ہو رہی تھی۔ رات کو ان کا ولیمہ تھا۔ میرون رنگ کا بھاری اور بہت قیمتی لہنگا زیب تن کیے زیورات، کلیوں، میک اپ سے مزین ہو کر سجل کا رنگ روپ ہی بدل گیا تھا۔ اسے دلہن بنانے لیے شہر کی معروف بیوٹیشن کی خدمات حاصل کی گئیں تھیں۔

سجل نے دیکھا عامر سیاہ شیروانی سفید شلوار میں ملبوس بے حد اسمارٹ لگ رہا تھا۔ فائزہ بھابی نے زبردستی اسے سجل کے ساتھ بٹھایا تھا۔ تصویر اتارنے کے لیے وہ تو سجل کی جانب دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اس کی دلہن جو بے حد حسین تھی کم عمر تھی اس کے برابر میں بیٹھی تھی اور کیسا سنگدل بنا بیٹھا تھا کہ ایک نظر التفات بھی اس پر ڈالنا گوارہ نہ کی تھی۔

سجل کا دل دکھ سے آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ سب سے ہنس بول رہا تھا اگر نہیں بولا تھا تو اس سے۔

''ماشاء اللہ چاند اور چاندنی کا ملاپ ہے''۔ کسی عورت نے سجل کو سلامی دیتے ہوئے کہا۔

''بھئی ذکیہ تم نے عامر کے لیے ایسی حسین لڑکی کہاں سے ڈھونڈی ہے؟''

بیگم ذکیہ فیضی کی ایک جاننے والی ان سے کہہ رہی تھیں۔

''جنت سے''۔ بیگم ذکیہ فیضی نے خوش ہو کر کہا تو سب ہنس پڑے۔

مہمانوں کے جانے کے بعد وہ سجی سنوری دوبارہ اپنے کمرے میں پہنچا دی گئی۔ اب اس نے عامر کا انتظار نہیں کیا بلکہ کمرے میں آتے ہی اپنے کپڑے نکالے

ور اس بھاری بھرکم لباس سے جان چھڑالی۔ منہ ہاتھ دھو کر سادہ سے کاٹن کے لباس میں وہ افسردہ اور رنجیدہ ہونے کے باوجود بے حد دلنشین لگ رہی تھی۔ اس کے مہندی سے سجے ہاتھ اس بات کی گواہی تھے کہ وہ نئی نویلی دلہن ہے ورنہ دلہن کے چاؤ کسی نے اٹھائے نہیں تھے۔ جب دولہا ہی اس سے لاپرواہ تھا تو دلہن کا ہار سنگھار اس کا رنگ روپ کس کام کا۔ جتنی تعریف و ستائش اس نے ان دونوں میں اپنے متعلق سنی تھی اسے ذرا بھی خوشی نہیں دے سکی تھی۔ اگر عامر اس کے ساتھ مثبت رویہ رکھتا اسے محبت سے خوش آمدید کہتا یقیناً اس کے لیے یہ تعریف ٹانک سے کم نہ ہوتی۔

اس نے وضو کر کے عشاء کی نماز ادا کی اور اپنے رب سے اپنے حق میں بہتری کی دعا مانگ کر پرسکون ہو کر سوگئی۔

صبح ناشتے کی میز پر اسے معلوم ہوا کہ عامر صبح سویرے اپنے دوستوں کے ساتھ نادرن ایریا کی سیر کے لیے چلا گیا ہے۔ بیگم ذکیہ فیضی اور فیضی صاحب سجل سے بہت شرمندہ تھے۔ اگرچہ یہ اس کی ذات کی انسلٹ تھی لیکن وہ خود کو بھول کر انہیں شرمندگی سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے چائے کا کپ اپنے سامنے رکھ کر مدہم آواز میں کہا۔

''آنٹی پلیز آپ میرے لیے فکرمند مت ہوں میں ان پر مسلط نہیں ہونا چاہتی اچھا ہے اس طرح مجھے انہیں سمجھنے میں آسانی ہوگی''۔

''پاس رہو گے تو سمجھنے کا موقع ملے گا نا، انتہائی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے عامر نے میں کیا منہ دکھاؤں گی ساجدہ کو عامر سے مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی۔'' بیگم ذکیہ فیضی نے سنجیدہ اور شرمندہ لہجے میں کہا تو فیضی صاحب بولے۔

''آنے دو اسے میں اچھی طرح اس کے کان کھینچوں گا حد ہوتی ہے لاپرواہی کی اپنی بیوی کی بجائے دوستوں کو سیر کے لیے لے کر چل دیئے برخوردار''۔

''پلیز آپ لوگ اس ٹاپک پر مزید کوئی بات نہ کریں''۔ سجل نے آہستگی سے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ وہاں سب شرمندگی سے ایک دوسرے سے نظریں چرانے کے سوا کچھ نہیں کر سکے۔

وہ رونا نہیں چاہتی تھی مگر آنسو تھے کہ امڈ امڈ کر آرہے تھے۔

''سجل لو ناشتہ کرلو پھر میں تمہیں گھر دکھاؤں گی یہ گھر جواب تمہارا بھی ہے'' فائزہ بھابی ٹرے میں اس کے لیے ناشتہ لیے اس کے کمرے میں آکر پیار سے بولیں۔

''گھر والا تو میرا ہو کر بھی میرا نہیں ہے بھابی پھر گھر میرا کیسے ہوگیا؟''

''تم دیکھنا وہ کیسے دیوانوں کی طرح تمہارے گرد منڈلائے گا۔ ابھی تو وہ مما سے ضد کی وجہ سے تم پر توجہ نہیں دے رہا اور پھر ہم سب تمہارے ساتھ ہیں تم فکر نہ کرو موصوف کی ایسی خبر لیں گے کہ یاد کریں گے''۔ فائزہ بھابی نے اسے ہلکے پھلکے انداز میں سمجھایا اور پھر ادھر ادھر کی باتوں سے اس کا دل بہلانے لگیں۔

ناشتہ کر کے وہ ان کے ساتھ باہر آگئی۔ انہوں نے اسے گھر دکھایا اور یہ اذیت ناک انکشاف بھی اس پر اسی دوران ہی ہوا کہ عامر کا بیڈروم تو نیچے ہے اوپر صرف اسے ٹھہرایا گیا ہے۔ یعنی عامر نے اسے اپنی دلہن اپنی بیوی اپنی شریک حیات اپنی جیون ساتھی کو اپنے کمرے تک میں آنے کا حق دینا گوارہ نہیں کیا تھا۔ اتنی ہتک اور توہین تو اس کی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے کون سا اس کی مما کے یا اس کے پاؤں پکڑے تھے منتیں کی تھیں کہ شادی کے لیے۔ وہ تو اس کی مما بیگم ذکیہ فیضی ہی اپنی دوست کی محبت اور سجل کی خوب صورت اور خوب سیرت شخصیت کی وجہ سے اسے اپنی بہو بنانے کے لیے دل و جان سے آرزومند ہوگئیں تھیں اور ساجدہ بیگم نے بھی بہت خوشی سے انہیں اس کا رشتہ دے دیا تھا اور پرسکون ہو کر آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کرلیں تھیں۔

نین ملائے نہ پاس ہی آئے
پھر بھی من کو بھاتا جائے
اے سکھی ساجن!
ہاں سکھی ساجن!

آج پورے پندرہ دن ہوگئے تھے اسے فیضی لاج میں آئے۔ سجل کی فائزہ بھابی اور ناصر بھائی کے بچوں یاسر، عاشر اور ندا سے خوب دوستی ہوگئی تھی۔ ان کے

ساتھ کھانا پینا، کھیلنا اور ان کی پڑھائی میں ان کی مدد کرنا اس کا معمول بن گیا تھا۔ گھر میں کام کاج کے لیے کئی ملازم موجود تھے۔ پھر فائزہ بھابی اور بیگم فیضی دیکھ بھال کے لیے موجود تھیں اس لیے اسے کسی نے کچن کی طرف جانے ہی نہیں دیا اور ویسے بھی وہ نئی دلہن تھیں اور دو ماہ تک تو انہوں نے اس سے کسی بھی کام کو ہاتھ لگانے سے منع کر دیا تھا۔ یوں اس کا زیادہ وقت بچوں اور کتابوں کے ساتھ گزر رہا تھا۔ دل میں کبھی کبھی عامر کی شبیہ ابھرتی ضرور تھی۔ بے کلی سی بھی اس کے اندر پھیل جاتی تھی مگر وہ فوراً اپنا دھیان بٹانے کی خاطر کسی اور طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔

اب بھی ایسا ہی ہوا تھا صبح اسے فائزہ بھابی نے بتایا تھا کہ عامر واپس آ گیا ہے اور اپنے کمرے میں سو رہا ہے۔ سجل کا دل ایک بار پھر ٹوٹ گیا تھا۔ عامر آ گیا تھا اس نے اپنی بیوی کا حال احوال نہ پوچھا نہ اس کے کمرے میں آیا اور آتا بھی کیوں اس نے تو شروع دن سے ہی اسے الگ کر رکھا تھا۔ اسے اپنی بیوی ہی تسلیم نہیں کیا تھا۔

وہ اس کی بیوی کے رشتے سے آئی تھی اس گھر میں اور وہ اس رشتے کو تسلیم کرنے سے اس کے حقوق ادا کرنے سے گریزاں تھا وہ شخص تو وہ اب تک یہاں کیوں اور کس لیے رہ رہی تھی۔ یہ سوچ اور خیال اسے افسردہ کر رہے تھے۔ جبھی عاشر نے اسے کرکٹ کھیلنے کے لیے بلایا وہ سوچ سوچ کر تھک گئی تھی اٹھ کر ان میں چلی آئی۔

عاشر اور یاسر کے چند دوست بھی وہاں موجود تھے جو ان کے اور سجل کے ساتھ کھیل کر خوش بھی بہت ہوتے تھے۔ سجل نے باؤلنگ کرانی شروع کی اور باری باری سب کو کھلا کر آؤٹ کر دیا۔ آخر میں اس نے خود بیٹنگ شروع کی۔ پہلی بال بہت سست روی سے کھیلی تو عاشر نے کہا۔

''سجل آنٹی زور سے ہٹ لگائیں ناں آفریدی والا چھکا لگائیں''۔

''اچھا''۔ وہ ہنس دی اور کچھ عاشر کے کہنے کا اور کچھ غصے کا اثر تھا کہ اس نے اگلی گیند پر بہت زوردار بلا گھمایا اور گیند عامر کے کمرے کی کھڑکی پر جا کر لگی۔

''اوہ ـــــ'' سب بچوں نے ایک ساتھ آواز نکالی۔

''یہ لو چھکا ہو گیا اب لاؤ مین آف دی میچ ایوارڈ''۔ سجل نے مسکراتے ہوئے

کہا تو سب ہنس پڑے اور پھر عاشر بولا۔

''ایوارڈ تو آپ کو چاچو دیں گے''۔

''ہاں ان کے کمرے کی کھڑکی پر چھکا لگا ہے بھاگو بھئی چاچو ڈانٹیں گے''۔ یاسر نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تو سجل گھبرائی۔ وہ اپنی نیند خراب ہونے پر جھنجھلا گئے ہوں گے اس کی پریشان صورت دیکھ کر ندا نے ہنس کر کہا۔

''آنٹی چاچو پہلے ڈانٹیں گے پھر سوری بولیں گے اور اس کے بعد پیار کریں گے پھر ہمارے ساتھ خود بھی کھیلنے لگیں گے ہر بار ایسا ہی ہوتا ہے آپ ڈریں نہیں''۔

''آپ کے چاچو پیار بھی کرتے ہیں؟'' سجل نے حیرت سے کہا۔

''ہاں ہم سے تو وہ بہت پیار کرتے ہیں''۔ ندا نے بتایا۔

''ہم جا رہے ہیں شام کو آئیں گے چاچو سے ملنے''۔ عاشر اور یاسر کے دوست اجازت لے کر گیٹ کی جانب چلے گئے تو وہ بھی اندر جانے کے لیے بڑھی۔

''ادھر سے نہیں آنٹی چاچو ادھر سے ہی باہر نکلتے ہیں گیند لگنے پر دوسری طرف سے جائیں''۔ یاسر نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بے چاری ٹپٹا سی گئی اور اس کی بتائی ہوئی سمت میں تیزی سے دوڑی۔ بیٹ اس کے ہاتھ میں تھا اب تک۔

''ٹھہرو یہ بال تم نے کھڑکی پر ماری ہے؟'' وہ راہداری سے گزر رہی تھی کہ عامر ایک دم سے باہر نکلا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ کیسی سخت گرفت تھی اس کی سجل کو بہت تکلیف محسوس ہوئی۔ اس نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا بے ترتیب اور الجھے ہوئے بال سرخ سوئی سوئی آنکھوں، شکن آلود لباس میں وہ بہت جھنجھلایا ہوا لگ رہا تھا۔

''کیا پوچھ رہا ہوں میں تم سے کون ہو تم اور یہاں کس کی اجازت سے آئی ہو؟''

''کون ہوں میں اور کس کی اجازت سے یہاں آئی ہوں؟'' سجل نے دل میں کہا سوال تھا کہ زہر میں بجھا نشتر جس نے اس کے دل و روح کو تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ ایسی ہتک ایسی بیگانگی اور اجنبیت اس کا شوہر اس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ کون ہے اور کس کی اجازت سے یہاں آئی ہے۔ سجل کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما

جائے۔

عامر نے اسے نظر بھر کر دیکھا ہی کب تھا جو اسے پہچانتا، شوہر بن کر اس کے پاس آیا ہی کب تھا کہ اس کے معصوم میک اپ سے مبرا چہرے کے خدوخال پہچانتا۔ عامر نے دیکھا اس کی آنکھوں میں دکھ، غصہ اور نفرت اُمڈ آئی تھی۔ کئی سوال مچل رہے تھے۔ سجل نے بیٹ غصے میں آ کر فرش پر پٹخ دیا اور اپنے بازو پر موجود عامر کے ہاتھ کو ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ ٹپٹا گیا، شرمندہ ہو کر اس نے فوراً اس کا بازو چھوڑ دیا اور سجل ایک قہر آلود نگاہ اس پر ڈال کر آگے بڑھ گئی۔

وہ شرمندہ سا اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگا۔ دل میں ایک عجیب سی لہر اٹھی۔ اس نے اپنا سر جھٹکا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ فائزہ بھابی نے سجل کو تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بھاگتے دیکھا انہیں لگا کہ وہ رو رہی ہے۔ وہ فوراً اس کے پیچھے اوپر کمرے میں آئیں تو اسے سچ مچ روتے ہوئے اور اپنے کپڑے وارڈروب میں سے نکالتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے اس کے پاس آ کر پوچھا۔

"سجل کیا ہوا کیا عامر سے سامنا ہوا ہے عامر نے کچھ کہا ہے تم سے؟"

"بھابی اب کچھ کہنے کو باقی نہیں رہا میں یہاں سے جا رہی ہوں"۔ اس نے روتے ہوئے کہا تو فائزہ بھابی پریشان ہوگئیں۔

"ہوا کیا ہے پلیز مجھے بتاؤ تو سہی"۔

"بھابی وہ پوچھ رہے تھے کہ میں کون ہوں اور کس کی اجازت سے یہاں آئی ہوں"۔

"سجل تم مجھے پوری بات بتاؤ"۔ فائزہ بھابی نے اسے شانوں سے پکڑ کر بٹھایا اور پیار سے پوچھا تو اس نے روتے ہوئے ساری بات بتا دی۔

"تم بیٹھو میں عامر سے بات کر کے آتی ہوں"۔

"نہیں بھابی اب میرے متعلق ان سے کوئی بات نہیں ہوگی اب آپ بات ختم ہی سمجھیں میں اپنی مرضی سے نہیں آئی تھی یہاں مجھے نکاح جیسے مقدس رشتے میں باندھ کر یہاں لایا گیا تھا۔ آپ عامر سے کیا بات کریں گی وہ بچے تو نہیں ہیں اٹھائیس برس کے بالغ اور باشعور مرد ہیں۔ بھابی میرے ماں باپ ضرور مر گئے ہیں

لیکن میری انا میرا ضمیر ابھی زندہ ہے۔ میں مزید اپنی توہین برداشت نہیں کر سکتی۔ عامر نے مجھے بیوی نہیں سمجھا انہیں میری عزت نفس مجروح کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں یہاں سے جا رہی ہوں پلیز مجھے روکیے گا مت"۔ سجل نے روتے ہوئے اپنا سوٹ کیس بند کیا کہا تو وہ پریشانی سے بولیں۔

"سجل پلیز ممی بھی گھر پر نہیں ہیں تم اکیلی کہاں جاؤ گی ہم سمجھائیں گے عامر کو"۔

"آپ کیا سمجھائیں گی بھابی شروع دن سے انہوں نے مجھے نظرانداز کیا ہے۔ ایک شخص اپنی بیوی کو نہیں پہچانتا اس سے زیادہ اذیت ناک اور توہین آمیز بات کیا ہو سکتی ہے بیوی کے لیے۔ بھابی میں اب تک آنٹی کی وجہ سے برداشت کر رہی تھی۔ بہت ہو گیا میری ماں کی روح پرسکون ہونے کی بجائے مجھے پریشان دیکھ کر خود بھی بے سکون ہو گئی ہو گی۔ اس شادی سے تو بہتر تھا کہ میں اکیلی رہتی"۔

وہ روتے ہوئے بولی اپنا سوٹ کیس وہ تیار کر چکی تھی۔ سامان ہی کتنا تھا عامر کے گھر کا سامان تو اس نے چھیڑا ہی نہیں تھا۔ جو کچھ اپنے ساتھ وہ لائی تھی وہی وہ اپنے ساتھ لے جا رہی تھی فائزہ بھابی اسے سمجھانے منانے میں لگی رہیں بچے بھی اسے گیٹ تک روکنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر وہ سب سے معذرت کرتی گیٹ عبور کر گئی۔

عامر نہا دھو کر تیار ہو کر لاؤنج میں آیا تو فائزہ بھابی کو بچوں کو پڑھاتے دیکھا وہ بھی وہیں آ کر بیٹھ گیا۔ فائزہ بھابی نے دیکھا وہ کچھ الجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

"اٹھ گئے تم؟" انہوں نے پوچھا۔

"اٹھا نہیں اٹھایا گیا ہوں بچے کرکٹ کھیلتے ہوئے بال میرے کمرے کی کھڑکی پر ضرور مارتے ہیں"۔ وہ اپنے گیلے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

"تو تم اپنے اوپر کے کمرے میں شفٹ کیوں نہیں ہو جاتے کئی بار کہا تو ہے تم سے"۔

"بھابی گھر میں کوئی آیا ہے کیا؟" اس نے ان کی بات نظرانداز کرتے

ہوئے پوچھا۔

''گھر میں تو تم آئے ہو آج سولہ دن بعد''۔

''نہیں میرا مطلب ہے کوئی اور کوئی مہمان''۔ وہ سجل کے متعلق جاننے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ بھابی اس کی بے تابی بھانپ کر دل ہی دل میں مسکرا دی تھیں۔ انہیں یقین ہو گیا کہ سجل کا جادو اس پر چند لمحوں میں ہی چل گیا ہے۔

''نہیں تو کیوں خیریت؟''

''ہاں وہ بچے کرکٹ کس کے ساتھ کھیل رہے تھے؟ آئی مین وہ لڑکی کون تھی؟''

''نالائق تو اپنی بیوی کو نہیں پہچانتا دیکھتا تب پہچانتا نا'' فائزہ بھابی نے دل میں اسے لتاڑا اور پھر فوراً ہی اس سے کہا۔

''احمق''۔

''نہیں بھابی وہ لڑکی احمق نہیں تھی بہت خوبصورت تھی سادہ معصوم''۔

''چاچو ممی احمق تو آپ کو کہہ رہی ہیں''۔ یاسر نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ سب ہنس پڑے عامر نے اسے گھور کر کہا۔

''چپ شریر پڑھائی کرو اپنی''۔

''بتایئے نا بھابی کون تھی وہ لڑکی؟'' اس نے دوبارہ فائزہ بھابی سے پوچھا۔ لہجے میں بے تابی کی واضح جھلک موجود تھی۔ فائزہ بھابی مسکرا دیں اور بولیں۔

''بچوں کی نئی دوست ہے وہ''۔

''رہتی کہاں ہے؟''

''پتا نہیں لیکن تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو تم اب شادی شدہ ہو تمہیں تو اپنی بیوی کے متعلق پوچھنا اور جاننا چاہیے''۔ فائزہ بھابی نے سنجیدگی سے اسے لتاڑا۔

''بھابی مجھے لگتا ہے کہ میں نے اس لڑکی کو کہیں دیکھا ہے پتا نہیں کہاں دیکھا ہے''۔ وہ اسی انداز اور لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''بیوقوف تم نے اسے اپنی دلہن کے روپ میں بغور نہ سہی دور سے سرسری سا تو

ضرور دیکھا ہے میک اپ کے باعث اس کی صورت ہی بدل گئی تھی بغیر میک اپ کے شبیہ تو اس کی تمہارے ذہن میں ابھر رہی ہے جس سجل کو تم نے اب دیکھا ہے۔'' فائزہ بھابی نے دل میں کہا۔

''اس کی بات چھوڑو سجل کی بات کرو''۔

''کون سجل؟'' وہ الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔

''بیوقوف لاپرواہ تمہاری بیوی کی بات کر رہی ہوں میں تمہیں اس کا نام تک یاد نہیں ہے''۔

فائزہ بھابی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''یاد تو ہے بس ذرا سا''۔ وہ خجل ہو کر سر کھجانے لگا۔

''تم نے بہت زیادتی کی ہے اس کم عمر اور معصوم لڑکی کے ساتھ''۔ فائزہ بھابی نے غصے سے کہا۔

''معصوم اور کم عمر تو وہ بھی تھی''۔ عامر کی نگاہوں میں سجل کی صورت اور سراپا گھوم رہا تھا۔

''آسمانی رنگ کے لباس میں وہ نجانے کیوں آسمان سے ٹوٹا ہوا تارہ لگ رہی تھی''۔

''کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ صرف تارا ہو اور تم نے اسے ٹوٹا ہوا تارا بنا دیا ہو''۔

''بھابی آپ جانتی ہیں میں توڑ پھوڑ کرنے والا بندہ نہیں ہوں''۔ عامر نے بے چینی سے کہا۔

''لیکن تم نے کسی کا دل تو توڑا ہے نا اور دل توڑنے سے بڑا گناہ اور جرم کوئی نہیں ہوتا''۔

فائزہ بھابی نے معنی خیز لہجے میں کہا تو وہ شرمندگی سے نظریں چرا گیا۔

وہ سمجھ گیا تھا کہ ان کا اشارہ اس کی بیوی سجل کی طرف ہے وہ صحیح ہی تو کہہ رہی تھیں۔

''بھابی وہ لڑکی پھر کب آئے گی؟'' وہ چند منٹ بعد پھر پوچھنے لگا۔

"آخر تمہیں پریشانی کیا ہے؟" فائزہ بھابی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بھابی پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے اس کی آنکھیں، بھابی اس کی آنکھیں بہت دکھ، غصے اور سوالوں سے بھری تھیں نفرت اور بے بسی کے رنگ اس کی آنکھوں سے نمایاں ہو رہے تھے۔ آخر اسے مجھ پر کس بات پر اتنا غصہ تھا"۔

"یہ تو تم ہی سوچو اور غور کرو کہ تم نے اسے کہاں دیکھا ہے اور جب یاد آ جائے تو مجھے ضرور بتانا۔" فائزہ بھابی نے سنجیدگی سے کہا اور وہاں سے اٹھ گئیں۔ عامر بھی اٹھ باہر چلا گیا۔

رات پھر وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ سجل کی آنکھیں اس کا چہرہ ایک پل کو بھی اس کی آنکھیں اس کا چہرہ ایک پل کو بھی اس کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوا۔

وہ صبح تھک کر سویا تھا اور سہ پہر کو اس کی آنکھ کھلی تو فریش ہو کر اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ فائزہ بھابی، یاسر، عاشر اور ثناء اس کی اور سجل کی شادی کی تصاویر کا البم دیکھ رہے تھے۔ البم میں سجل کے شادی کے بعد ان سب کے ساتھ اور علیحدہ سے کئی تصاویر بھی موجود تھیں۔

"کس کی تصویریں دیکھی جا رہی ہیں؟" وہ ان کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"آپ کی شادی کی اور اپنی دوست کی۔" ثناء نے بتایا تو فائزہ بھابی نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے رات بھر اس لڑکی نے تمہیں سونے نہیں دیا جبھی دن بھر سوتے رہے ہو"۔

"جی بھابی میں بہت اپ سیٹ ہوں آخر میں نے ایسا کیا بگاڑا ہے اس لڑکی کا جو وہ مجھے اس قدر غصے اور نفرت سے دیکھ رہی تھی۔ دکھی کیوں تھی آنسو کیوں امڈ رہے تھے اس کی جھیل سی آنکھوں میں بھابی میرے ساتھ آج تک ایسا نہیں ہوا بتایئے نا مجھے کہ وہ لڑکی کون ہے میں نے اسے کہاں دیکھا ہے وہ کہاں رہتی ہے؟" وہ پریشان لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"اب تو وہ تمہارے دل میں رہتی ہے"۔ فائزہ بھابی نے مسکراتے ہوئے اپنے دل میں کہا۔

"ثنا بیٹا اپنے چاچو کو اپنی نئی فرینڈ کی تصاویر دکھاؤ شاید انہیں یاد آ جائے کہ انہوں نے انہیں کہاں دیکھا ہے۔" فائزہ بھابی نے ثناء سے کہا۔

"یہ لیں چاچو دیکھیں تو آنٹی کتنی پیاری لگ رہی ہیں"۔ ثناء نے البم اس کی گود میں رکھ دیا۔

"زبردست ـــ دلکش"۔ وہ تصویریں دیکھتے ہوئے بولا جوں جوں وہ تصاویر دیکھتا گیا اس کے چہرے کا رنگ فق ہوتا گیا۔ مایوں سے مہندی تک کی تصاویر بھی موجود تھیں جن میں بغیر میک اپ کے سادہ سی سجل بیگم زکیہ فیضی فائزہ بھابی کے درمیان بیٹھی تھی اور جب اس نے شادی کی تصاویر دیکھیں تو اس کے دل و دماغ ہل کر رہ گئے۔ وہی تو تھی جو اسے دیکھی دیکھی لگ رہی تھی۔ اب وہ سمجھا تھا کہ وہ لڑکی کوئی اور نہیں اس کی اپنی بیوی ہے۔

"بھابی! یہ کیا ہے یہ کون ہے؟"

"کیا اب بھی نہیں پہچانتے؟" فائزہ بھابی نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"بھابی یہ سجل ہے میری بیوی میری شادی اس لڑکی سے ہوئی ہے وہ لڑکی میری شریک زندگی ہے او گاڈ میں کہاں گم تھا اب تک؟"

"اپنی حماقتوں اور لاپرواہیوں میں"۔ فائزہ بھابی نے ناراض لہجے میں کہا۔

"یہ کیا کیا میں نے اف کاش میں نے اسے دیکھ لیا ہوتا بھابی سجل کہاں ہے؟" وہ شرمندگی اور بے بسی سے کھڑے ہو کر پوچھ رہا تھا۔

"اب تو شاید تمہارے دل میں ہے"۔ فائزہ بھابی نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شاید نہیں یقیناً۔" وہ بلا جھجک یہ اعتراف کرتا ہوا اوپر سجل کے کمرے کی جانب لپکا تو فائزہ بھابی نے پوچھا۔

"اوپر کیوں جا رہے ہو تمہارا کمرہ تو نیچے ہے"۔

"اپنی بیوی کو بھی اپنے کمرے میں لانے کے لیے جا رہا ہوں"۔

"سجل اپنے کمرے میں نہیں ہے"۔

"تو کہاں ہے؟" وہ حیرانگی سے واپس پلٹا۔

"خدا جانے کہاں ہے مگر وہ اب اس گھر میں نہیں ہے"۔

"بھابی یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" وہ پریشان سا ہو کر ان کے قریب چلا آیا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں"۔ فائزہ بھابی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کل تم نے جو کچھ اس سے پوچھا تھا کہ تم کون ہو اور کس کی اجازت سے یہاں آئی ہو؟ اس کے بعد وہ رک جاتی بہت انسلٹ کی ہے تم نے اس کی بہت دکھ دیا ہے تم نے اسے۔ کتنے دن سے وہ تمہاری بے رخی اور بے نیازی برداشت کر رہی تھی مگر کل کے واقعے نے اسے توڑ کے رکھ دیا تھا۔ وہ روتی بلکتی یہاں سے چلی گئی ہے میں نے اور بچوں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ نہیں رکی اور رکتی بھی کیسے کس کے لیے؟ جس کے نام سے منسوب ہو کر وہ اس گھر میں آئی تھی وہی اس سے پوچھ رہا تھا کہ تم کون ہو اور کس کی اجازت سے یہاں آئی ہو۔ واہ دیور جی واہ خوب سکھ پہنچایا ہے تم نے اس معصوم کی ماں کی روح کو"۔

"پلیز بھابی بس کیجیے مجھے مزید شرمندہ مت کریں آپ جانتی ہیں بھابی میں ایسا تو نہیں ہوں کسی کا دل دکھاؤں۔ یہ سب انجانے میں ہوا ہے۔ میں شادی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے تجل کو بھی نظر انداز کر کے چلتے بنا تھا"۔ وہ شرمندگی سے اپنا سر پکڑ کر بولا۔

"شادی کوئی کھیل نہیں ہوتی عامر اب مما کل جب گھر آئیں گی تو میں انہیں کیا جواب دوں گی کہ ان کی پیاری بہو کہاں ہے اور تم سے تو وہ بہت خفا ہوں گے ہم تو چند دنوں میں ہی اس سے مانوس ہو گئے تھے کتنا پیار کرنے والی لڑکی ہے تجل مگر تم نے اپنی حماقت کی وجہ سے اسے گنوا دیا"

"فار گاڈ سیک بھابی ایسا تو مت کیجیے میں اسے گنوا نہیں سکتا میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔ آپ میری مدد کریں پلیز"۔ وہ تڑپ کر بے قراری اور بے کلی سے بولا۔

"کیسی مدد؟" فائزہ بھابی کو اس کی بے قراری اور بے چینی پر حیرت ہو رہی تھی کہاں تو اس نے شادی کے دن کی بیزاری اپنی دلہن کی شکل نہیں دیکھی تھی اسے چھوڑ کر دوستوں کے ساتھ سیر کو چلتا بنا تھا اور اب کہاں یہ حالت تھی کہ چند گھنٹوں میں ہی وہ اس کے لیے بے چین ہو رہا تھا اور چند منٹ پہلے ہی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی

بیوی ہے تجل وہ لڑکی جسے کل سے اس نے الجھن میں ڈال رکھا تھا وہ اس کی بیوی اس کی ملکیت ہے تب سے وہ اس طرح ری ایکٹ کر رہا تھا جیسے وہ اس سے برسوں سے محبت کرتا آیا ہو اور وہ اچانک اس سے کھو گئی ہو۔

"بھابی تجل کے کسی عزیز رشتے دار کا ایڈریس تو ہوگا آپ کے پاس"۔

"نہیں وہ اکیلی ہے اور اس کے جو رشتے دار تھے انہوں نے اس کے والد کی موت کے بعد ان سے ملنا جلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ہاں ایک خالہ تھیں شادی میں تو میں نے انہیں دیکھا تھا شاید مما کو معلوم ہو کہ وہ کہاں رہتی ہیں"۔ فائزہ بھابی نے سنجیدگی سے بتایا۔

"مما کب آئیں گی؟" وہ انتظار نہیں کر سکتا تھا بے تابی سے پوچھا۔

"بتایا تو ہے کل آئیں گی اور تمہاری شامت لائیں گی"۔

"خیر ہے مجھے اس کی فکر نہیں ہے غلطی کی ہے تو سزا بھی تو ملنی چاہیے مجھے تو تجل کی فکر ہے بھابی وہ تو بہت کم عمر اور معصوم ہے کہاں گئی ہو گی ہمارا معاشرہ تو ویسے ہی عورت کے لیے غیر محفوظ ہوتا جا رہا ہے اور پھر اکیلی لڑکی اور گاڈ یہ کیا خطا سرزد ہو گئی مجھ سے یا اللہ تجل کو اپنی حفظ واماں میں رکھنا"۔ وہ پریشانی اور بے قراری سے دل سے بولا تو فائزہ بھابی اسے دیکھتی رہ گئیں۔

میں جس کو چھوڑ گیا تھا جھنجھلاہٹ میں وہ ہی معصوم سی لڑکی دل کی آرزو نکلی

عامر کو رہ رہ کر اپنی غلطی اور زیادتی کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے ایک لمحے کو بھی چین نہیں مل رہا تھا۔ اپنی اور تجل کی شادی کی مووی اور تصویروں کا البم اس کے سرہانے پڑا تھا جو کئی بار وہ دیکھ چکا تھا اور ہر بار اس کی بے قراری میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ بیگم ذکیہ فیضی اور فیضی صاحب نے اس کی خوب خبر لی تھی۔ مگر وہ سوائے شرمندہ ہونے کے کچھ نہیں کر سکا تھا۔ اس کا کھانا پینا، سونا جاگنا حرام ہو گیا تھا۔ تجل کی خوبصورت اور معصوم صورت اسے سونے نہ دیتی۔ اس کی آنکھوں میں لکھے سوال اسے بے چین کیے رکھتے۔

اس نے شہر بھر کے دار الامان، ویمن ہاسٹل، ہسپتال، پارک ہر جگہ تجل کی تلاش میں بار ہا چکر لگائے تھے مگر ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔

میں شہر بھر میں اسے ڈھونڈ کر چور ہوا نجانے دل کے سوا اس کا ٹھکانہ کیا ہے

آج پورے دو ماہ ہو گئے تھے ان کی شادی کو وہ رات گئے گھر لوٹا تو بیگم ذکیہ فیضی اور فائزہ بھابی کو منتظر پایا۔ وہ انہیں سلام کر کے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

''عامر ادھر آؤ''۔ بیگم ذکیہ فیضی نے اسے آواز دی۔

''جی مما''۔ وہ بوجھل قدموں سے چلتا واپس آیا۔

''یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے اپنی نہ کھانے پینے کا ہوش ہے نہ بزنس کی فکر۔ کن چکروں میں گم رہتے ہو ہر وقت؟'' بیگم ذکیہ فیضی نے سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''مما یہ تجل کے خیالوں میں گم رہتا ہے''۔ فائزہ بھابی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''شروع دن سے ہی اس کا خیال رکھا ہوتا ہے آج اس طرح مارے مارے تو نہ پھرتے۔ تم نے تو مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا ارے میں قیامت کے دن اس کی ماں کو کیا جواب دوں گی ایسی شادی سے تو وہ کنواری ہی بھلی تھی۔ ایسی پیاری بچی تھی وہ میں کتنے چاؤ سے اسے بیاہ کر لائی تھی۔ نجانے کہاں ہو گی بے چاری بچی کس حال میں ہو گی۔'' بیگم ذکیہ فیضی نے قدرے ناراض لہجے میں کہا وہ شرمندہ کھڑا رہا۔

''میں جاؤں مما؟'' چند لمحوں بعد اس نے پوچھا۔

''جاؤ لیکن اپنا حلیہ درست کرو اور مجھے مزید پریشان مت کرو میں پہلے ہی تجل کی وجہ سے بہت فکرمند ہوں''۔

''جی مما''۔ وہ آہستہ سے بولا اور اپنے کمرے میں آ کر اوندھے منہ بیڈ پر گر گیا۔ آج وہ بہت دلبرداشتہ ہو رہا تھا۔ کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا تھا اس نے تجل کو مگر وہ تو ایسی غائب ہوئی تھی کہ اس کی تمام تر کوششیں ناکام ہو گئیں تھیں۔ فائزہ بھابی اس کے لیے دودھ کا گلاس لے کر آئیں تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''بھابی تجل کہاں ہے؟'' اس نے بھیگتے لہجے میں ان سے پوچھا اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

''تمہارے دل میں ہے''۔ فائزہ بھابی نے اسے ریلیکس کرنے کی خاطر

مذاق سے کہا۔

''دل میں ہے جبھی تو روح بے چین ہے اس کی جدائی پر ایسا کیوں ہوا ہے میرے ساتھ بہت سزا بھگت لی ہے میں نے اپنی غلطی کی مزید برداشت نہیں ہو سکے گی مجھ سے''۔ وہ شرمندہ لہجے میں بولا۔

''واقعی تم نے سب جگہ تو اسے تلاش کر لیا ہے اب تو صرف سر میں خاک ڈال کر صحراؤں میں نکل جانے کی کسر باقی رہ گئی ہے''۔ فائزہ بھابی نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ کی۔

''پلیز بھابی میرا مذاق تو نہ اڑائیں''۔ وہ تڑپ کر بولا۔

''مذاق تو تم نے تجل کا اڑایا ہے''۔ وہ سنجیدہ ہو کر بولیں۔

''اس چھوٹی سی لڑکی کا نازک سا دل توڑا ہے تم نے کیسے سا ہو گا اس نے اکیلی نے کچھ اندازہ ہے تمہیں؟''

''ہے بھابی اندازہ ہے، اندازہ بھی ہے اور احساس بھی ہے جبھی تو تڑپ رہا ہوں اس کے لیے وہ ایک بار مجھے مل جائے میں اس سے معافی مانگ لوں گا اپنی غلطی کی تلافی کروں گا پھر اسے کبھی نظرانداز نہیں کروں گا۔ کوئی دکھ نہیں دوں گا''۔ وہ انہیں دیکھتے ہوئے بولا۔

''تو ایسا کرو کہ اللہ سے مدد مانگو تجل نماز کی پابند تھی تم بھی نماز پڑھو اور اللہ سے دعا مانگو۔''

''اللہ سے تجل کو مانگوں تو وہ مجھے دے دے گا نا بھابی''۔ وہ بچوں کی طرح پرامید ہو کر بولا تو فائزہ بھابی کو اس کی حالت اور بچگانہ معصومیت پر ہنسی آتے آتے رہ گئی۔

''ہاں وہ تو تجل کو پہلے ہی تمہیں دے چکا ہے تمہیں اس تک پہنچا بھی دے گا''۔ فائزہ بھابی نے نرمی سے کہا تو وہ آستینوں سے اپنی آنکھیں صاف کرتا وضو کے لیے اٹھ گیا۔

شام سویرے، نینوں میں میرے
بول سکھی کیا سا یا رے
اے سکھی نیندیا

نہ سکھی ساجن

وہ سلمیٰ خالہ کے گھر آ گئی تھی۔ مگر اپنا چین سکون، دل کی آسودگی جیسے عامر کے گھر چھوڑ آئی تھی۔ عامر نے کتنی بے رخی برتی تھی اس سے ہونا تو یہ چاہیے کہ وہ اس سے بدظن ہو جاتی اس سے نفرت کرنے لگتی مگر وہ کم عمر معصوم سی لڑکی اپنے من کے سارے جذبے اس بے وفا اور کٹھور شخص کے نام سونپ بیٹھی تھی۔ عامر اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ اس کے خوابوں کا پہلا حسین رنگ پہلی دھنک، پہلا سر۔

وہ دن بھر مصروف رہ کر اسے بھلانے کی کوشش کرتی مگر نہ تو اس کی بے رخی اور بے عزتی بھول پاتی نہ اس کی محبت سے دامن چھڑا پائی۔ رات کو وہ خوابوں کی صورت آنکھوں میں بس جاتا تو دن میں پھولوں، پودوں اور نظاروں میں اسے نظر آتا۔ سلمیٰ خالہ کے سلائی سینٹر اور بوتیک کے کام میں وہ بھی ان کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔

''سجل بیٹی لڑکیاں چلی گئیں کیا؟'' سلمیٰ خالہ کی آواز پر وہ چونک گئی۔

''جی خالہ چلی گئیں اور یہ مسز ہمدانی ڈریس کی پے منٹ کر گئی ہیں''۔ اس نے رقم کا لفافہ ان کی جانب بڑھاتے ہوئے بتایا۔

''اچھا چلو اب تم بھی نہا کر کپڑے تبدیل کر لو میں نے تمہارا نیا جوڑا سیا تھا نا وہ ہی پہنا مہمان بھی آتے ہوں گے بیٹی کے سسرال والوں کے لیے تو خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے خواہ وہ کھانے پینے کا ہو یا پہننے اوڑھنے کا''۔

''سعدیہ آپا کے سسرال میں کون کون ہے؟
سعدیہ آپا بھی آ رہی ہیں کیا؟''

''نہیں سعدیہ کے بچوں کے امتحان ہو رہے ہیں وہ نہیں آ رہی اور تم اس کی ساس سے تو ملی ہی ہو چلو تیار ہو جاؤ تھک گئی ہو گی اتنا کام بھی صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہوتا۔ میں ذرا کچن کا کام دیکھ لوں۔'' سلمیٰ خالہ نے نرمی سے کہا۔ سعدیہ ان کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ سات سال پہلے بیاہی گئیں تھیں۔

''خالہ میں آپ کا ہاتھ بٹاؤں کیا پکا رہی ہیں آپ؟'' وہ ان کے ساتھ چلتی ہوئی گھر کے رہائشی حصے میں آ گئی۔

''ارے آپ نے تو خاصا اہتمام کر لیا خالہ''۔

''بیٹی کے سسرال والے گھر آ رہے ہوں تو اہتمام کرنا پڑتا ہے آخر بیٹی کی عزت کا سوال ہوتا ہے میں نے سب کچھ تیار کر لیا ہے بس تم تیار ہو جاؤ''۔

''خالہ مجھے نیند آ رہی ہے اگر میں آپ کے مہمانوں سے کھانے پر نہ مل سکوں تو۔''

''کوئی بات نہیں وہ شاید ایک دو روز یہاں قیام کریں تم شام میں مل لینا۔'' سلمیٰ خالہ نے اس کی بات کاٹ کر نرمی سے کہا۔

''تھینک یو خالہ یو آر سو سویٹ۔'' وہ خوش ہو کر ان کے گلے سے لگ گئی۔

نہا کر کپڑے تبدیل کیے، نماز ادا کی اور کھانا کھا کر سو گئی۔ عصر کے وقت اس کی آنکھ کھلی تو اسے یاد آیا کہ خالہ کے مہمان آنے تھے۔ جلدی سے بال باندھے وضو کر کے نماز عصر ادا کی اور انتظار میں رہی کہ خالہ خود اسے بلانے آئیں گی مگر خالہ نہ آئیں اسے پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے کھڑکی کا پٹ کھول کر باہر جھانکا باہر کا موسم بہت خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ سورج سرمئی بادلوں میں کبھی چھپتا کبھی نکلتا دھوپ اور چھاؤں کا کھیل کھیل رہا تھا۔ اس کا پسندیدہ موسم تھا۔ بارش کے آثار نمایاں تھے۔

''کاش اس موسم میں وہ بھی میرے ساتھ ہوتے''۔ اس نے حسرت سے سوچا آنکھوں میں عامر کی صورت سمائی تھی۔ اس سے مزید پیاس برداشت نہ ہو سکی اپنے کمرے سے باہر نکلی تو دائیں جانب مڑتے ہی کسی چیز سے ٹکرا گئی۔ گلاس اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے فرش پر گر گیا اور دو ٹکڑے ہو گیا۔ اس نے دیکھا ایک بڑا سا سوٹ کیس رکھا تھا وہ سمجھ گئی کہ خالہ کے مہمان آ چکے ہیں اور یہ سامان انہیں کا ہے۔

''یہ کوئی سامان رکھنے کی جگہ ہے کیسے بدتمیز مہمان ہیں خالہ کے''۔ چونکہ اس کے چوٹ بھی لگ گئی تھی اس لیے غصے سے بڑبڑائی۔

''خالہ کے نہیں آپ کے''۔ یہ عامر کی آواز تھی وہ اس آواز کو تو لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ ایک لمحے کو تو اس کا دل بہت زور سے دھڑکا وہ چونک کر سن سی کھڑی رہ گئی مگر پھر عامر کی مخصوص خوشبو نے اسے اس کی سمت دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

''السلام علیکم''۔ عامر نے مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں اسے سلام کیا نظریں اس کے چہرے کے دلکش نقوش میں کھوئی ہوئی تھیں۔

'' کون ہیں آپ اور کس کی اجازت سے یہاں آئے ہیں؟'' سحل نے اسی کے سوال دہرا کر اسے شرمندہ کرنا چاہا مگر وہ بس ایک لمحے کو ہی شرمندہ ہوا چونکہ اسے منانے آیا تھا اس لیے خاموش نہیں رہ سکتا تھا سو مسکراتے ہوئے شوخ و شریر لہجے میں بولا۔

'' شوہر ہوں تمہارا اور اپنے دل کی اجازت سے یہاں آیا ہوں''۔

'' آپ میرے شوہر نہیں ہیں''۔ وہ اس کے لہجے کی شوخی پر گھبرا کر بولی۔

'' تو کیا ہوں محبوب، ساجن یا سجنا''۔ وہ شریر لہجے میں بولا تو وہ سٹپٹا گئی اور ٹوٹا ہوا گلاس سمیٹنے کے لیے نیچے جھکی تو وہ بھی نیچے بیٹھ گیا اور شرمندگی سے بولا۔

'' سوری میری وجہ سے آپ کا گلاس ٹوٹ گیا''۔

'' گلاس۔'' سحل نے شعلہ بار نظروں سے اس کے وجیہہ چہرے کو دیکھا اور کھڑے ہو کر طنزیہ لہجے میں بولی۔ آپ کی وجہ سے کسی کا دل ٹوٹ جائے تو کیا فرق پڑتا ہے آپ کو''۔

'' فرق پڑتا ہے سحل''۔ وہ بے قراری سے بولا۔

'' جبھی تو پاگلوں کی طرح سارے شہر میں تمہیں ڈھونڈتا پھرا ہوں اور فائزہ بھابی اور امی کو معلوم تھا کہ تم یہاں اپنی خالہ کے پاس ہو پھر بھی انہوں نے مجھے نہیں بتایا سب لوگ مجھے الزام دیتے رہے میرے تڑپنے کا تماشا دیکھتے رہے مجھے میری غلطی کی سزا مل چکی ہے اب بھی اگر میں فائزہ بھابی کے سامنے بچوں کی طرح گڑگڑایا نہیں ہوتا نہ تو انہوں نے اب بھی تمہارا پتہ نہیں بتانا تھا۔'' وہ اپنی حالت سے اسے آگاہ کر رہا تھا۔

سحل نے دھڑکتے دل کے ساتھ حیرانگی سے اسے دیکھا اس کے چہرے پر ندامت، سچائی اور خلوص کی تحریر درج تھی سحل کو یقین آنے لگا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔

'' یقین نہیں ہے تو ابھی فائزہ بھابی کو فون کر کے پوچھ لو کہ تمہارے جانے کے بعد مجھ پر کیا بیتی ہے۔'' وہ اس کی سنجیدگی سے پریشان ہو کر بولا۔

'' مجھے کسی سے کچھ پوچھنے اور جاننے کی ضرورت نہیں ہے پلیز میرا راستہ چھوڑ دیجیے''۔ وہ سنجیدہ لہجے میں بولی دل کو اس کی لگن اور بے قراری پر یقین آ رہا تھا مگر اسے تھوڑا سا ستانا بھی تو تھا۔

'' تمہارا راستہ الگ تھوڑی ہے مجھ سے اہم دونوں کا راستہ بھی ایک ہے اور منزل بھی''۔ وہ اس کے قریب کھڑا بہت نرم، شیریں مہکتے لہجے میں بولا۔

سحل بری طرح سٹپٹا گئی۔ یہ لفظ یہ لہجہ یہ انداز اس کے لیے نیا تھا دلنشین تھا اور محسوسات بھی نئے تھے۔ وہ اس سے نظریں چرا کر خالہ کو پکارنے لگی۔

'' یہ خالہ کہاں چلی گئیں خالہ ____ خالہ جان''۔ وہ انہیں پکارتی کچن کی جانب بڑھ گئی۔

'' خالہ جان کو آواز دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے وہ برابر میں کسی ہمسائے کے ہاں گئی ہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا مگر وہ کچن میں داخل ہو چکی تھی۔

'' اوہ تو آپ تھے ان کے مہمان ان کی بیٹی کے سسرال والے''۔ اس نے ساری بات کھولتے ہوئے کہا وہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا ہو کر بولا۔

'' ظاہر ہے تم بھی تو ان کی بیٹی ہو''۔

'' آپ جائیے نہ یہاں سے کیوں آئے ہیں یہاں؟'' وہ فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے بولی تو اس نے سنجیدگی سے کہا۔

'' سحل مما نے مجھے بہت ڈانٹا ہے اس لیے تم پلیز میرے ساتھ چلو میں تمہیں لینے آیا ہوں''۔

'' تو آپ اپنی مما کے ڈانٹنے پر مجھے لینے آئے ہیں''۔ اس کا دل بجھ سا گیا پانی پی کر بوتل واپس فریج میں رکھتے ہوئے بولی۔

'' نہیں یار میں اپنے دل کے ڈانٹنے، دماغ کے لتاڑنے اور روح کے چلانے پر تڑپا ہوا تمہیں لینے کے لیے آیا ہوں۔ کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا میں نے تمہیں''۔ وہ اسے یقین دلانے کے لیے خوبصورت لفظوں کا استعمال کر رہا تھا وہ اس سے بچ کر کچن سے باہر نکل گئی۔

'' آپ کو کیا ضرورت تھی مجھے ڈھونڈنے کی خواہ مخواہ کی مصیبت تھی میں تو آپکے لیے اور آپ کے پاس ٹائم کیسے نکل آیا اپنی دلہن بی بی کو دیکھنے اور ڈھونڈنے کا''۔

'' آئی ایم رئیلی سوری سحل میں نے تمہیں بہت ہرٹ کیا ہے''۔ وہ شرمندہ ہو کر بولا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس کی باتیں سن چکی تھی۔ اسے اپنے آپ پر سخت

غصہ آ رہا تھا۔

''اب کیا چاہتے ہیں آپ؟'' وہ نرم پڑتے ہوئے بولی اور اپنے کمرے میں داخل ہوگئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے تھا۔

''کیا چاہ سکتا ہوں بجز تمہارے؟'' وہ اس کے سامنے آ کر اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا ہلکے گلابی کاٹن کے سوٹ میں وہ اور بھی حسین لگ رہی تھی اس کے دل میں ہلچل مچا رہی تھی۔

''آپ خالہ سے بات کریں''۔ وہ نظریں چرا کر بولی۔

''محبت مجھے تم سے ہے تو دل کی بات خالہ سے کیوں کروں''۔ وہ بہت نرم لہجے میں بولا۔

''عامر''۔ سجل کے لبوں سے بے اختیار اس کا نام پھسل گیا۔ وہ اس کے رخسار کو چومتی ریشمی بالوں کی لٹ کو پکڑتے ہوئے محبت سے بولا۔

''جان عامر صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے اور میں تو دوپہر سے گھر آیا بیٹھا ہوں۔ تمہارے کمرے میں بھی گیا تھا مگر تم سو رہی تھیں اور اتنی حسین، معصوم اور دلکش لگ رہی تھیں کہ میں نے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا بس تمہیں دیکھتا رہا اور حیران ہو کر سوچتا رہا کہ آج تک میں کیوں بھٹکتا رہا ہوں، کائنات کا سارا حسن تو میرے اپنے گھر میں موجود تھا کتنا احمق تھا میں''۔

''وہ تو آپ اب بھی ہیں''۔ سجل نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ خوشدلی سے ہنس دیا۔

''اور آپ کو کوئی حق نہیں ہے مجھے اس طرح سے دیکھنے کا''۔ وہ شرگیں لہجے میں بولی۔

''ارے جناب ہمیں ہی تو حق ہے آپ کو ہر طرح سے دیکھنے کا''۔ وہ اس کی مسکراہٹ پر ایک دم سے سارے فاصلے مٹا کر اسے اپنے پیار کے حصار میں سمو کر محبت پاش لہجے میں بولا تو جیسے اس کی بے چین روح کو قرار آ گیا۔

''تم یہاں چلی آئیں مجھ سے اپنا حق مانگے بغیر۔''

''کیا میرا اور آپ کا رشتہ ایسا تھا کہ مجھے مانگنے سے میرا حق ملتا؟'' وہ کہتے ہوئے رو پڑی وہ تڑپ اٹھا۔

''تو تم نے بھی تو بدلہ لے لیا ہے نہ میرے دل و روح میں سما کر دماغ پر قبضہ جما

کر مجھے چھوڑ کر چلی گئیں''۔ وہ اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے ندامت اور محبت سے شکوہ کر رہا تھا۔ اس نے خفگی سے کہا۔

''آپ نے مجھے اپنایا ہی کب تھا جو میں آپ کو چھوڑ کر جاتی''۔

''میں مانتا ہوں کہ میں نے بہت زیادتی کی تمہارے ساتھ، دکھ دیا تمہیں دراصل مجھے شادی سے چڑ تھی تم سے چڑ نہیں تھی نہ میں تم سے نفرت کرتا تھا۔ بس میں اتنی جلدی شادی کرنا نہیں چاہتا تھا مگر ممتا کی ضد کے سامنے میری ضد ہار گئی اور میں نے تمہیں نظر انداز کر کے اپنا غصہ اتارا۔ بہت برا کیا مگر اس روز جب تم مجھے بیٹ لیے جاتی ہوئی ملیں بس میں وہیں ہار گیا۔ بچوں نے کہا کہ تم ان کی نئی دوست ہو میں پہچان ہی نہیں سکا اور جب پہچانا تو ایک پل کو چین نہیں مل سکا مجھے۔ میں اپنی بے رخی پر نادم تھا تم سے معافی مانگنا چاہتا تھا۔ یقین جانو تم مصیبت نہیں ہو میری محبت ہو''۔ وہ اسے محبت سے اپنی غلطی، اپنا اعتراف الفت بتا رہا تھا اور وہ خوشی سے روئے چلی جا رہی تھی۔

''ابھی رو لو پھر کبھی رونے نہیں دوں گا تمہیں اور گھر چلو میرے ساتھ میرا سکھ چین، قرار سکون سب کچھ اپنے ساتھ لے آئیں۔ کچھ بھی تو نہیں بچا تھا وہاں میرے لیے''۔ وہ اس کے آنسو اپنے دامن میں جذب کرتے ہوئے محبت اور نرمی سے بولا۔

''آپ بہت برے ہیں''۔ اس نے بھیگتی آنکھیں سے اسے دیکھا تو وہ ہنس پڑا۔

''اوں ہوں میں بہت اچھا ہوں میرے ساتھ رہو گی تو ساری بدگمانیاں سارے شکوے گلے دور ہو جائیں گے کبھی کبھی بڑے بھی غلطی کر جاتے ہیں''۔

''تو اس میں چھوٹوں کا کیا قصور ہے؟'' وہ پیار بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''چھوٹے ہونے کے باوجود وہ بڑے اہم ہو جاتے ہیں کسی کے لیے یہ کیا کم ہے تم جو میری ننھی منی سی پری ہو میرے لیے بہت اہم ہو میرے دل میں تمہارا بڑا مقام ہے چلو اب میرے ساتھ گھر چلو''۔

''اس وقت؟'' اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا جہاں بادل بارش برسا رہا تھا۔

''کیوں اس وقت کیا ہے؟''

''اس وقت موسم بہت اچھا ہے''۔

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ گھر چلو''۔ وہ شوخ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے شریر لہجے میں بولا۔

''میں نہیں''۔ وہ شرماتے، مسکراتے ہوئے بولی عامر پر بے خوابی طاری ہو رہی تھی۔ اس کا معصوم انداز، مسکان، شرمیلا پن اسے دیوانہ بنا رہا تھا۔

''تم نہیں تو کچھ نہیں چلو ورنہ میں بھی رونے لگوں گا اور اتنا روؤں گا کہ تم سے مجھے چپ کرانا مشکل ہو جائے گا''۔ وہ اس کے شانوں کو تھام کر محبت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں بھلا آپ کو کیوں چپ کراؤں گی، آپ روئیں میں بھی تو دیکھوں کہ آپ جیسے لاپرواہ، لاابالی، سنگدل اور غیر ذمہ دار شوہر روتے ہوئے کیسے لگتے ہیں؟'' سجل نے شوخ و شریر انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''بڑی ظالم ہو تم''۔ وہ ہنس کر اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔

''کیوں نہ ہوں آخر آپ کی بیوی ہوں''۔ وہ بھی بڑی ادا سے ہنس کر بولی۔

''سجل ننھی پری اب معاف بھی کر دو''۔ وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر پیار سے بولا۔

''جائیے معاف کیا آپ بھی کیا یاد کریں گے کہ کس محبت بھری ننھی پری سے رشتہ جڑا ہے''۔

وہ اس کی بات کاٹ کر محبت بھرے لہجے میں بولا تو وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور پھر اس کی ہنسی اور نظروں کی شوخی اور شرارت پر شرما کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اس نے موسم کو دیکھ کر عامر کے ساتھ کی تمنا کی تھی دل سے دعا مانگی تھی جو پوری ہو گئی تھی۔

یہ موسم یہ بارش آج سے اس کی پکی سہیلی، سکھی بن گئی تھی۔ وہ بہت زیادہ خوش تھی عامر کی سنگت میں اور عامر تو شاید اس سے بھی کہیں زیادہ خوش تھا اسے پا کر دیکھتے ہی دیکھتے موسم خوشگوار ہو گیا تھا اندر اور باہر دونوں کا موسم۔

ہنس کر تو نے دیکھا تو اے ہمدم
یہ موسم خوشگوار ہو گیا

☆☆☆